

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں  
ماہنامہ

ڈائجسٹ  
کراچی

فروری 2013





قاسم رضا

میناش

16

دل کو دھلا دینے والی خوف و دہشت طاری  
کرتی پراسراریت سے بھرپور سبق آموز کہانی

رفعت محمود

لبے بال

45

حدود سے تجاوز کرتے ہی اکثر اداکت انسان  
پریشانیں کا شکار ہو جاتا ہے۔ سبق آموز کہانی

اسرار نوشین

دل کے رشتے

73

کیا یاد تازہ نہیں ہر دل کے ہاتھں چھو ہوتی  
ہیں حقیقت کا پتہ تو کہانی پڑھ کر ہی چلے گا

ایس حبیب خان

ہیر و سن

85

جادو کی کہانیاں پڑھنے والوں کیلئے ایک عجیب  
فریب دماغ پرست طاری کرتی خوفناک کہانی

ایم اے راحت

سنہری تابوت

100

شاہکار کہانیوں کے حاشائی لوگوں کے لئے  
آئینے میں ذاتی حیرت انگیز اور خیر انگیز کہانی

ناصر محمود فرہاد

کلون

35

مغادر پرست اور جھوٹے باز اکثر کھاتے ہیں  
رہے ہیں جس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

اے وحید

رولو کا

48

وہ ذاتی پرہیزگاروں کا ملک ہے جس کی جیت انگیز  
بھر جادوئی کشتہ سربل آپ کو تک کر دیں گی

ایس امتیاز احمد

شیطان کی کھوپڑی

77

کیا حقیقت ہے کہ مافوق فطرتی قوتیں کیلئے اکثر  
بہت نقصان ثابت ہوتی ہے۔ دل گرہ کہانی

اقسی رہاب

زندگی

95

دل و دماغ پرست طاری کرتی ایک ناقابل  
یقین عجیب و غریب حیرت انگیز ڈرامائی کہانی

شاہدہ سحر

قاتل

123

دھڑلہ پناہ گیس بند کر کے گھر سے نکلے  
اکثر زندہ رہ گئے ہوجاتے ہیں سبق آموز کہانی

احسان سحر

خونی پاؤں

133

کیا دیکھیں گی اپنا مقامی مندریکر کرتی ہیں  
یہ جاننے کے لئے یہ کہانی پڑھنا نہ بھولے گا

عامر ملک

دعا کی طاقت

153

صدق دل سے کی گئی دعا اپنا اثر رکھتی ہے ایک  
ناقابل فراموش دل گرہ دل فریخت کہانی

عبدالحمید ساگر

جادوگر

171

جرم و سزا کی ایک اچھوتی اور دل و دماغ  
کو محسوس کرتی حیرت انگیز خونی کہانی

عابد علی

خلاء کا ایسی

201

کیا حقیقت ہے کہ دوسرے سید عالم کی  
مستندوں سے آگے ہیں ایک ایسی کہانی

عمران قریشی

سیاہ بھوت

138

رات کے گھانا ٹوپ اندھیرے میں ختم لینے  
والی ایک دہشت ناک اور دل گرہ کہانی

ساجدہ راجہ

موت کا پیچھا

159

کیا بھی بھار مارا تو نہیں بھی انسانی مدد کی  
طلب کار ہوتی ہیں اس کا پتہ کہانی پڑھ کر پلے گا

ایم۔ الیاس

بلیک ٹائیگر

176

جنس اور سسٹمز سے بھرپور واقعات جو  
پڑھنے والوں کو مدعو حیرت میں ڈال دیں گے

ادارہ

توس و قزح

218

قاریوں کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قاریوں  
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔۔۔

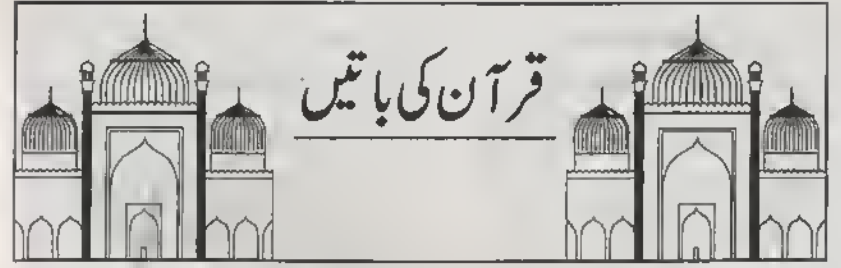
شہزادہ چاند زیب عباسی

واصل جہنم

224

علم و ہریت کی انتہا پرستی جسم و جاں پر کوئی  
طاری کرتی خوفناک اور حیرت انگیز کہانی

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری  
نہیں۔ ڈراما رجسٹر میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی  
ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقاً ہو سکتی ہے



- ☆ کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے آخرت اور دنیا تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ (سورۃ نجم 53 آیت 24 سے 25)
- ☆ اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ (سورۃ نجم 53 آیت 39)
- ☆ کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ (سورۃ معارج 70 آیت 19)
- ☆ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے ضرور کریں گے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے کو خود سری کرتا جائے۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 3 سے 5)
- ☆ بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھا۔ ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں تو ہم نے اس کو مستاد دیکھا بنایا اور اسے رستہ بھی دکھایا۔ اب وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔ (سورۃ دھر 76 آیت 1 سے 3)
- ☆ اے انسان تجھ کو اپنے رب کرم گستر کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا؟ وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضا کو ٹھیک کیا اور تیری قامت کو معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔ (سورۃ انفطار 82 آیت 6 سے 8)
- ☆ ہم نے انسان کو تکلیف کی حالت میں رہنے والا بنایا ہے۔ (سورۃ بلد 90 آیت 4)
- ☆ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ (سورۃ تین 95 آیت 4)
- ☆ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے کچھ شک نہیں کہ اس کو تہا رہنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (سورۃ اشرا ح 94 آیت 5 سے 8)
- ☆ انسان اپنے رب کا احسان ناشناس اور ناشکرا ہے اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔ (سورۃ عادیات 100 آیت 20)
- ☆ عصر کی قسم کہ انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔ (سورۃ عصر 103 آیت 1 سے 3)
- ☆ اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔ اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔ (سورۃ حشر 59 آیت 21)
- ☆ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو رحم مادر میں ڈکایا جاتا ہے۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 37)
- ☆ (کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکریہ شیخ بک ابجی کراچی)

- ☆ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے۔ (سورۃ نباہ 4 آیت 28)
- ☆ اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا ہر حال میں ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں تو بے لحاظ ہو جاتا اور اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کو ان کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے ہیں۔ (سورۃ یونس 10 آیت 12)
- ☆ اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں پھر اس سے اس کو جھین لیں تو ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔ (سورۃ صود 11 آیت 9)
- ☆ اور انسان جس طرح جلدی سے بھلائی مانگتا ہے اسی طرح برائی مانگتا ہے۔ اور انسان جلد باز (پیدا ہوا) ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 11)
- ☆ اور جب ہم انسان کو بخشے ہیں تو روگرداں ہو جاتا اور پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اسے سختی پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 83)
- ☆ کہہ دو کہ اگر میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے ان کو بند کر رکھتے اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 100)
- ☆ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے سمجھانے کے لئے طرح طرح کی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ (سورۃ کہف 18 آیت 54)
- ☆ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میرے علم و دانش کے سبب ملی ہے، نہیں بلکہ وہ آزمائش ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (سورۃ زمر 39 آیت 49)
- ☆ اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو حالات اس کے دل میں گزرتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔ اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔ (سورۃ قح 50 آیت 16)

**بلقیس خان** پٹا دوسرے السلام علیکم اسب سے پہلے تو میری طرف سے ادارہ ڈاٹ انجسٹ کو اور اس کے تمام دیگر ذمہ داریاں بھی نیند ایتر مبارک ہو۔ نیا سال بالآخر کرے خوشیوں اور کامیابیوں سے پر مزیں ہو۔ تمام لکھاریوں کو اور تمام پڑھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی خوشیاں اور آمد مبارک ہو۔ جنوری 2013ء کا ڈاٹ انجسٹ مل گیا۔ ٹانگل، بہت زیادہ خوبصورت تھا۔ پینٹل کی دونوں لڑکیاں بہت مصوم اور خوبصورت تھیں۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے دل کو نور کی روشنی سے منور کیا پھر سب دوستوں کے خطوط پڑھے۔ بہت زیادہ اچھے لگے۔ جن دوستوں نے مجھے ڈاٹ انجسٹ میں دیکھ کر کیا۔ ان کا تہ دل سے شکر یہ کہ ایٹوں قسط دار اسٹوریز میں سنہری تابوت، کا پلڑا بھاری رہا۔ ردو کو کا بھی زبردست رہی۔ بلیک ٹانگل میں ایک بار پھر سرد جا آگئی۔ بہت زبردست ایم الیاس صاحب! اس ماہ کی ساری کہانیاں زبردست اور انوکھی و اچھوتی رہیں۔ مگر آپ تقری میری نظر میں یہ تین کہانیاں رہی۔ نمبرون پر، چہار کی جن، نمبرود پر لگا نمبر تین پر بندر امورتی! علی کاشف آفاقی میں آپ کی کہانی پر بندر امورتی کو پڑھ کر غلط حیرت سے خوش ہوئی۔ باقی اچھی کہانیاں میں آسبھی معر، خودی کا قاتل، انجام، جنت کا مہمان، بدروح پیکر، مغرور، تابوت، نقشا اچھی لگی۔ خونی جوکر، انگش اور ہندی ڈرامہ سی لگی۔ ذرا ای بات دھیرت ناک رہی، غزلوں نظموں میں، عثمان غنی کی غزل اور شعر نے بہت متاثر کیا۔ جب کہ انوری رمضان کی غزل بہت اچھی لگی۔ انگل جی دیکھا میری کہانی دیوی شامل اشاعت ہوئی کہ نہیں۔ اگر ہے۔ تو کب تک ہو جائے گی! اگر نہیں تو میرا بس اللہ ہی مالک ہے۔ شاید کبھی کہانی لکھنے کی ہمت نہ کر سکوں!

☆ **بلقیس صاحبہ**: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکر ہے۔ آپ کی دیوی ضرور شائع ہوگی اصلاح طلب زیادہ ہے اس لئے وقت کی کمی کے باعث پڑی ہوئی ہے امید ہے کہ بہت جلد شائع ہوگی۔ ایک کہانی ارسال کر کے بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں۔ غزل شامل اشاعت ہے اور امید ہے آئندہ ماہ بھی خطوط نامہ بھیجتا بھولیں گی نہیں۔

**رضیہ عارف** اگرچہ سے دنیا سال 2013ء کا ٹانگل اپنی انفرادیت اور نئے پیمانے کی وجہ سے بہت بھلا لگا۔ اس کی قیمتی تعریف کی جائے کہ یہ ہے تو اپنی اپنی پسند ہے کسی کو اچھا لگا ہو کہ نہ ہو بہر حال مجھے تو اچھا لگا۔ کئی ماہ مصروفیات کی وجہ سے میں خط نہ لکھ سکی ایک تو گھریلو کام کا جو اور اس پر سے قیامت خیز مہنگائی نے دن رات بلکہ پل پل کا سکون بر باد کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر گھر چاہے چھوٹا ہو کہ درمیان، بڑے گھرانوں کی تو بات ہی الگ ہے کیونکہ بڑے لوگ مالی پریشانیوں سے بہت کم دوچار ہوتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ درمیان طبقہ ہی متاثر ہوتا ہے چونکہ آمدنی محدود ہوتی ہے اس لئے اگر سردھانا پائے تو پھر کل جاتا ہے اور اگر پاؤں ڈھانچیں تو سر کھٹا ہے۔ اتنا مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب نئے سکرانوں نے ملک کا باگ ڈور سنبھالا اس وقت تیل اور بجلی 80/- روپے کھڑے تھے۔ اب اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس ہوشربا مہنگائی نے لوگوں کی حالت کو کیا بنا ڈالا ہے۔ آج کبھی ایک عام کھیتی 180/- روپے کھڑے۔ اس لحاظ سے ضرور بات زندگی کی تمام چیزیں دستیاب ہیں۔ مہنگائی تو بڑھ چکی مگر آمدنی محدود پھر اس کے علاوہ بجلی کے، گیس کے بل اس کے علاوہ ٹرانسپورٹ کے لئے CNG۔ ڈیزل اور پٹرول کا بل حال ہی میں بدستور ہے۔ ہمارے خیال سے اگر پوری دنیا کی معیشت کا تجربہ کیا جائے تو جو حال آج پاکستان کا ہے ایسا کہیں اور نہیں، جب کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ جمہوریت ہوتی ہے۔ لوگوں کے لئے، لوگوں کی اور لوگوں سے مگر ایسی جمہوریت سے کیا فائدہ کہ لوگ بھوک سے بلک رہے ہیں، لوگوں کا خون سڑکوں پر بہہ رہا ہے، لوگ اپنی عزتیں بچانے پر مجبور ہیں، کئی جگہ تو لوگ اپنے دل کے ٹکڑے تک فروخت کرنے کے لئے راضی ہوئے، لوگوں نے بے روزگاری اور مہنگائی کی وجہ سے خودکشی تک کر ڈالی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر عزت دار اور شریف انفس لوگ کریں تو کیا کریں۔ ایسے لوگ صرف اور صرف اللہ سے لوں لگائے آؤ و زاری کر رہے ہیں۔ اور پاس و محرومی سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ نہ جانے کیا رحمت خداوند جوش میں آئے گی۔ خیر یہ سب سوچ سوچ کر سوائے دل جلنے اور ٹھنسنے کے ہے کیا ایک عام آدمی کے گھر میں۔ خیر اب بات ہو جائے پیارے ڈاٹ انجسٹ کی تو تمام کہانیاں زبردست تھیں قسط دار میں ردو کا کا جواب نہیں یہ واحد کہانی ہے جو کہ میرے دماغ پر چھائی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں قسط دار

بھی ٹھیک ہی جاری ہیں ویسے یاد آ یا افتتاح رمضان، انوری رمضان پرچے میں نظر نہیں آ رہی ہیں میری ان سے ریکوئسٹ ہے کہ پلیز آپ لوگ اپنے پڑھنے والوں کا خیال رکھیں۔ باقی باتیں آئندہ ماہ کر دیں گی کیونکہ خط بہت لمبا ہو گیا ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی۔ شب و روز ڈاٹ انجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ **فرید صاحبہ**: بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے مصروفیات کے باوجود رے کے لئے وقت نکال کر حقیقت بھرا خط لکھا، ہم آپ کے خیالات کی تعریف کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ ماہ بھی خطوط نامہ ارسال کرنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks نورین اعظمی راؤ لینڈی سے امید ہے کہ ڈاٹ انجسٹ کی پوری ٹیم خیر خیر سے ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکوؤں کو گنت رات چوکی ترقی عطا فرمائے اور اس طرح شاد باور ہے آئین۔ میں ڈر کی بہت پرانی کم ہمت پڑھنے والی ہوں کم ہمت اس لیے کہ میں خط لکھوں اور آپ شائع نہ کریں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے لکھنے والوں کو دل سے دیکھ کر کرتے ہیں۔ بس پھر میں نے بھی قلم سنبھال لیا امید ہے کہ آپ ضرور شائع کریں گے اور میرا دل نہیں تو ڈرے گا کہ کہانیاں میں مجھے سنہری تابوت اور ردو کا بہت پسند ہیں کہانی پڑتے ہوئے اسے نکھوٹے جاتے ہیں کہ آپ اس کا ہوش نہیں رہتا۔ میں ایک حد کہانی اور غزل بھی ہوں امید ہے کہ آپ اسے ضرور شائع کریں پلیز پلیز میرا حوصلہ ضرور بڑھائیے گا کہ میں آئندہ بھی لکھتی رہوں شکر یہ کہ کہانی لکھیں تو کیا آپ اسے شائع کریں گے۔

☆ **نورین صاحبہ**: ڈاٹ انجسٹ میں مونس دیکھ کر آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں کیونکہ آپ کا خط بہت لیٹ موصول ہوا کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آپ کا خط شائع ہو گیا حوصلہ افزائی ہوگئی اور اب امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی ضرور خط لکھیں گی۔

**سیدہ شمشادہ ظفر** اگرچہ سے، امید ہے آپ خیر سے ہوئیں۔ میں نے مئی کے مہینے میں آپ کو دو کہانیاں ارسال کی تھیں جو آپ نے کہا تھا کہ شائع کر دیں گے پر شاید وہ آپ کے معیار کے مطابق نہیں تھی اس لئے آپ نے شائع نہیں کی۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ وہ دونوں کہانیاں آپ واپس بھیج دیں تاکہ میں ان کو کہیں اور بھیج سکوں۔ کہانیوں کے نام ہیں: "نقشہ ملیکی" اور "دکرائے باز"۔

☆ **شامک صاحبہ**: دراصل آپ کی ارسال کردہ کہانیاں بہت چھوٹی ہیں ڈر کے دو صفحات بھی نہیں بننے اور کام کی زیادتی کی وجہ سے ہمیں انہیں ٹیم مل رہا ہے کہ ان کہانیوں کو مزید بڑھا کر شائع کیا جائے۔ اگر آپ ان کہانیوں کو پھر کسی اور کہانی کو سمجھ کر کے ارسال کر دیں تو میرا ہی ہوگی۔

**فادیہ نسیم شعیب** مولہ قصور سے، السلام علیکم! ایک تہناؤں کے ساتھ خط کا آغاز کرتی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ تمام پڑھنے والے اور لکھاری بخیریت ہوں گے۔ جنوری 2013ء کا شمار بہت لیٹ ملا۔ قرآن و دیان گاہ زبردست ہیں۔ خطوط وچ غلام نبی انوری، بلقیس خان، عائشہ ارمان، صفد حسین، اور کائنات بلوچ دیکھ دیکھ خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں خودی کا قاتل، ایک سبھی آموز کہانی تھی اس کے علاوہ ردو کا زبردست جاری ہے، اس کے علاوہ انجام، لگام، ہمایک مزاد روح جی، خونی جوکر، نقشہ دل کو دہلا دینے والی کہانیاں تھیں۔ قوس قزح میں نوشین خان، انوری رمضان، عائشہ ارمان، منسل مایین، افسی رباب، غلام نبی انوری اور اذان عزیز کے کام زبردست تھے۔ دیری گزشتہ آج پہلی بار بخانی میں خط کی مسکن کی ہے امید ہے کہ شائع کر کے شکر یہ کا موقع دیں گے، امید ہے آئندہ ماہ کہانی بھیجیں گی۔ آئندہ ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔

☆ **فارہ صاحبہ**: خطوط نامہ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks آئندہ ماہ بھی آپ کے تجربے کا شدت سے انتظار ہے گا۔

**ساجدہ راجہ** ہندواں سرگوحا سے، میری طرف سے تمام ڈر کے رائٹرز اور پڑھنے والوں کو سلام، امید ہے آپ تمام لوگ خیریت سے ہوں گے پچھلے ماہ پچھلے مصروفیات کی وجہ سے خطوط کی مکمل میں شرکت نہ کر سکی تھیں ڈر کے مطالعے سے غافل نہیں رہی، تمام کہانیاں بہت زبردست تھیں، قسط دار بھی اچھی تھیں بس بلیک ٹانگل کچھ بوری ہے۔ اسلامہ نوشین شعیب، یاد رکھنے کا۔ دیکھ کر شاعرے میں موجود فروغ پر جو کہانی ہے وہ پہلے بھی ایک رسالے میں پڑ چھ چکی ہوں کہانی کا نام قافروں کی قربانی باقی دیکھ کہانیاں ٹھیک تھیں۔ ڈبیر کے نام سے پرمزاج تحریر کب شائع ہوگی باقی ڈر ابھی زیر مطالعہ ہے آئندہ تک کے لیے خدا حافظ۔

☆ **ساجدہ صاحبہ**: امید ہے آپ کی نشاندہی پر انٹر صاحب ضرور غور فرمائیں گے پرمزاج کہانی بہت جلد شائع ہو جائے گی انوری



کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے آپ شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی اگلے ماہ بھی۔

**کنول عمران خان** کراچی سے، آداب میں نے پہلی دفعہ کسی ڈائجسٹ میں خط لکھا ہے اور ڈاڈا ڈائجسٹ تو میرا سب سے زیادہ پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ کیونکہ مجھے خوفناک کہانیاں بہت پسند ہیں۔ آپ کے ڈائجسٹ کی بہت تعریف سنی تھی کہ نئے آنے والوں کو بہت حوصلہ دیتے ہیں۔ تو اس لئے میں نے بھی ایک کہانی لکھی ہے امید ہے آپ یوں نہیں کریں گے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیں، ڈاڈا ڈائجسٹ دن دکنی رات چوکی ترقی کرے۔ (آمین)

☆ کنول صاحبہ: ڈاڈا ڈائجسٹ میں دیکھ، آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں تھی ہوئی تو اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو باپوسی سے واسطہ نہ پڑے اور جہاں تک ہو سکتا ہے ہم کہانیوں کو اصلاح کر کے شائع کرتے ہیں، امید ہے آپ اگلے ماہ بھی خط ارسال کر کے شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی۔

**پرسنسن ڈی سرگودھا**، السلام علیکم، میری طرف سے ڈر کے اسٹاف، راسٹرز اور ریڈرز کو کچھ تو میرا سلام ڈر سے رشتہ جوڑے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر اس کے اچھوتے انداز نے اپنا اسیر بنالیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں اپنی تخلیق کردہ کچھ ہولناک اور برسرِ اہل کہانیاں ڈر میں چھپوانے کی خواہش مند ہوں مگر اس کے لئے پہلے اجازت درکار ہے کہ آیا اس محفل میں جہاں مجھ سے کہیں زیادہ عقلمند راسٹرز موجود ہیں تو وہی سی جگہ لے لے گی؟ اگر مجھے ایک موقع دیا جائے تو میں ثابت کر سکتی ہوں میں بھی کہانی لکھ سکتی ہوں۔ آپ پلیز اپنا توجہ دیا کہ آپ میری کہانیاں شائع کریں گے۔ ایک کہانی ارسال کر دی ہوں اسے پڑھ کر آپ فیصلہ کریں کہ کیا یہ شائع ہونے کے لائق ہے؟ میں انشاء اللہ جنت کے خزیہ کہانیاں ارسال کر دوں گی۔

☆ پرسنسن ڈی صاحبہ: ڈاڈا ڈائجسٹ میں خوش آمدید آپ کی کہانی چونکہ بہت لیت موصول ہوئی اس لئے پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ گھبراہٹ میں نہیں موضوع اچھا ہوا تو اصلاح کر کے ضرور شائع کر دی جائے گی آپ بعد شوقی کہانیاں بھیجتی رہیں باقی کام ہمارا ہے۔ بہت مرادیں مدد خدا، بہت اور حوصلہ والے لوگ ہی کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ شکر یہ

**انوری رمضان** پٹنڈا خان سے تمام پڑھنے والوں کو میرا سلام! آپ سب کو Happy New year دیتے تو ہمارا سال محرم کے مہینے سے شروع ہوتا ہے لیکن دین اور دنیا دونوں کے لئے کوشاں رہنا چاہیے۔ اب آنے ہیں نومبر کے شمارے کی طرف میرے فورٹ راسٹرز، انشاء، صبا، سجاد، میں سے کسی کی کہانی بھی شائع نہیں ہوئی جس کی وجہ سے دل افسردہ ہوا مگر دیکھیں دل خوش ہو گیا۔ گمشدہ مسافر اچھی تھی، ایڈیٹر صاحب آپ نے کہا تھا کہ ٹاپ تھری اسٹوریز کا آغاز جلد ہی ہوگا تو پھر اب کیا ہوا؟ خط، حافظہ، اور تابوت کہانی ایک سے بڑھ کر ایک اور دیکھ کے شمارے میں دھوم مچا دینے والی کہانیاں تھی۔ اسارہ نوشین اور بلقیس خان بہت بہت شکر مبادرت کو یاد رکھنے کے لئے بہت بہت شکر یہ۔ خدا جاننا

☆ انوری صاحبہ: آپ کی ارسال کردہ کہانی اگلے ماہ شائع ہوگی۔ ٹاپ تھری اسٹوریز کا معاملہ اپنی جگہ مسلم ہے گھبراہٹیں نہیں پورا پورا انصاف ہوگا۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی۔

**ایمن حبیب خان** کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈاڈا ڈائجسٹ کی ٹیم اور اس کے پڑھنے والے سب خیریت سے ہونگے۔ جنوری 2013ء کا "ڈر" نئے سال کی آمد کے احساس کے ساتھ گزرے سال کی یادیں لے موصول ہوا۔ سردی اور انتہائی جاذب نگاہوں کے خطوط کی محفل میں تہمیدوں کے ساتھ ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات پڑھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی تو سب سے پہلے "لگام" نے واقعی ابتدائی صفحات کا خوبصورتی سے حق ادا کیا، "جنتا کاسمان" ہمیشہ کی طرح ایس۔ اقتیاز احمد کی شاندار تحریر تھی، "آئینی مہم" راسٹرنے بے حد عمدہ انداز سے لکھی بہت پسند آئی۔ "مغرورا" بھی کیا خوب رہی دینڈن، "پھاڑی کے جن" آخری صفحات کی خوبصورت سونات رہی۔ یہ تو بات تھی کہانیوں کی اس کے علاوہ میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتی ہوں کہ اس مرتبہ میری کہانی میں خاص "مس پرچنگ" تھی۔ اور بھی کئی چیزیں تھیں۔ آپ کی توجہ مبذول کرانے کی خاص وجہ یہی ہے کہ کسی بھی چیز کی وجہ سے ڈر کا معیار متاثر نہ ہو۔ امید کرتی ہوں کہ آپ خود کریں گے۔ آخر میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ آنے والے دنوں میں ان نکتہ خیشوں سے میرے وطن پاکستان کو نوازے اور اس کی سلامتی و بقا قائم رکھے، ساتھ ہم سب کو جذبہ ایمانی سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

☆ ایمن صاحبہ: آپ کو آئندہ ایسی شکایت نہ ہوگی دراصل کمپیوٹر کی وجہ سے پروف دلائمیں بلکہ بغیر پروف دلائم غلطی سے لگ گیا تھا اس کے لئے معذرت۔ کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ Thanks  
**عاصمہ رمضان** پٹنڈا خان سے، السلام علیکم! سب سے پہلے نئے سال کی مبارک باد! پلٹے ہیں دیکھیں ڈر کی طرف خط، حافظہ، ہولناک رات، تابوت کہانی زبردست کہانیاں تھیں۔ مطلب دھماکے دار انشاء رمضان سے ایک بات پوچھوں گی۔ آپ اپنی معلومات کہاں سے لیتی ہیں دیری گڈ، ایکسیٹنٹ۔ خطوط میں اسارہ نوشین Thanks بلقیس خان Thanks محمد آصف شہزادہ Thanks اور سخن ملی کے ساتھ ساتھ سب کے لئے دعائیں۔ غزلوں میں سنیل ماچین، طر، عروج، ماچین، طر، انشاء رمضان اور ماہم عابد کے کلام اچھے تھے اور باقی سب سوچتے۔

☆ عاصمہ صاحبہ: ڈاڈا ڈائجسٹ کو یاد کرنے کے لئے دیری دیری ٹھیکس آئندہ ماہ بھی خطوط سے ہمراہ تجزیہ کا انتظار ہے گا۔  
**رفعت محمود** راولپنڈی سے، امید ہے ڈر کے سارے اسٹاف کے لوگ خیریت سے ہوں گے۔ نئے سال کا پرجوش وقت سے پہلے ہی لگ گیا سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی دیکھ نفل ٹائٹل قاسم کی تعریف نہ کرنا پڑتی ہے بے شک آپ مبارکباد کے مستحق ہیں اس کے بعد کہانیوں پر نظر پڑی تو دیکھ ہوا کہ اسے عرصے کے بعد کہانیاں ارسال کیں مگر ڈاک کی ڈالی کی نظر ہو کر رو گئی اور دیر بعد ملی ہیں۔ اس ملک میں کون سی چیز قائم پر پہنچ رہی ہے۔ سب ہی نظام درہم برہم ہے۔ دیسے بھی کراچی کے حالات خراب ہیں۔ سیاست عرب پر ہے سب ہی سب اچھا کے گیت الاپ رہے ہیں۔ مگر ان کو پتہ کئی ہر دزگاری لاقانونیت نظری نہیں آ رہی۔ غریب و دولت کی روٹی کھانا ہو گئے ہیں پھر بھی ایک فرد چل رہا ہے۔ "سب اچھا ہے"۔ یہ نہیں کہیں اس ملک کے حالات ٹھیک ہوں گے 66 سال ہو گئے ہیں پاکستان آزار ہوئے چھوٹے چھوٹے ملک ترقی کر کے کہاں پہنچ گئے ہیں مگر ہم حال سے بے حال ہیں۔ کہانیاں تقریباً سب ہی اچھی تھیں لیکن اس میں اگر کچھ تبدیلی لے آئیں تو اچھا ہوگا۔ اب 1999ء والا دور ختم ہو گیا ہے جب ڈر دنیا آیا تھا اب یہ تیار و درخت بن گیا ہے ہر گھر کی زرعت بن رہا ہے۔ ہاں اب ایک چھوٹی سی گزارش ہے کہ آپ جب بھی ساگرہ نمبر نکالیں تو کہانیوں کے ساتھ راسٹرز مختصر تعارف بھی لگا دیا کریں کئی پرچہ والے لگا رہے ہیں امید ہے میری اس آواز پر غور کریں گے۔ اب آخر میں ڈر پڑھنے والے ہم راسٹرز اور کارکنان کو پرجوش سلام۔

☆ رفعت محمود صاحب: ہمارے ملک کا مٹی تو اسی مسئلہ ہے کہ ہم لوگ احساس قلبی سے غاری ہو چکے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا توفیق کب قبر بن کر نازل ہوتا ہے۔ آپ کی تجویز قبول کر لی گئی ہے۔ غل ضرور ہوگا پرچہ میں تبدیلی کے بارے میں تجویز ضرور دیجئے گا۔ کہانی شامل اشاعت ہے آئندہ ماہ بھی امید ہے خطوط نامہ بھیج کر شکر یہ کاموقع ضرور دیں گے۔

**محمد عبد علی جغتائی** خیرپور ساہیال سے، السلام علیکم! اور آداب امید ہے کہ ڈر کا جملہ اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ جنگجو حبیب کے ٹائٹل والا ڈر 24 دسمبر کو ملا دیکھ کر دل بھج گیا کیونکہ ٹائٹل دھانسو قسم کا ہونا چاہیے جیسا کہ ڈر کا مزاج ہے۔ خیر آئندہ ہمیں سب سے پہلے خطوط میں اپنا خط تلاش کیا دیکھ کر چٹخ چٹخے نکلے رہ گئی فوراً بڑے بھائی کو دکھانے کے لیے بھاگا اور دو دروازے کی چوکت سے نکل کر اسی طرح سر کے اوپر ایک اور سر خود ہو گیا۔ بہر حال So Thanks کہ آپ نے مجھے اتنی خوشی دی۔ اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے راولپنڈی جو میری توجہ کے عین مطابق Super تھی اس کے بعد ایم اے راحت صاحب کی سنہری تابوت بھی ایک نامور لکھنے والے ہوئے حیرت زدہ کر گئی عمران قریشی صاحب کی لگام اپنے اندر کچھ کچھ جاسوسی عنصر لے ہوئے تھی۔ انجام اعزین ہارمودی سے کافی متاثر لگتی تھی۔ خودی کا قاتل ہر لحاظ سے ایک بہترین تحریر تھی جسے پڑھ کر میں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ شائستہ صاحبہ کا بھیا کمزور اچھا موضوع لے ہوئے تھی۔ محمد آصف وارث صاحب کی آئینی مہم عجیب سی لگی۔ صفدر شاہین صاحب کی رو بہ بین بہت اچھی لگی۔ باقی کہانیاں ابھی باقی ہیں پڑھئے گا۔ میں زیادہ تر مزاحیہ شاعری کرتا ہوں اور ایک مزاحیہ غزل ارسال کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ حوصلہ افزائی ہوگی آخر میں اجازت چاہوں گا اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے (آمین)

☆ محمد علی صاحب: خط لکھتے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی ڈاڈا ڈائجسٹ کو یاد رکھتے ہوئے خیریت نامہ اور تجزیہ بھیجتا ہوں لیں گے نہیں۔ شکر یہ

محسن علی جٹ ساہیوال سے امید ہے آپ باخیریت ہوں گے۔ جناب میں نے بھلی بڑھی ایک کہانی نیت بھیجی تھی مگر لگتا ہے آپ کوئی نہیں میں نے لٹر کے ساتھ بھیجی تھی وہ میری خود نوشت تھی مگر مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئیں تھیں، مثلاً کہانی پر اپنا نام اور ایڈریس نہیں لکھا تھا اس بار بھی ایک کہانی بھیج رہا ہوں کہانی کا نام ہے دقا لوگ ہیں میرے ذہن کی تخلیق ہے امید ہے شائع کر کے حوصلہ افزائی کریں گے۔ نقل کرنا بری بات ہے اور کسی دوسرے کی چیز پر اپنا نام لکھ کر شائع کرنا اونٹنی بری بات ہے ہر انسان کو اللہ پاک نے دماغ دیا اس سے انسان کام لے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اب جنوری 2013ء کی بات کریں تو مجھے رد و کار کا ایسی لکھی گئی ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں، مگر ایم ایس صاحب کی کہانی بلک نا ٹیگر بہت بورھی۔ میں رازندوں پر تنقید نہیں کرتا کیونکہ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں ان کو ایک بات کہو کہ زیادہ سے زیادہ اچھا لکھنے کی کوشش کریں آہستہ آہستہ انسان مکمل پر اثر بن جائے۔ باقی تمام قارئین کا بھی شکریہ ادا رہوں جو لکھتے ہیں ان کی وجہ سے مزید کہانیاں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ اس دفعہ کہانیوں میں تھوڑا بہت مزاح بھی تھا جو مجھے پسند آیا اور Joke پڑھ کر مجھے بلا جہجہ پر ہنسنا پڑا۔ اس مرتبہ میری کہانی ضرور شائع کیجئے گا دل نہ توڑیے گا بہت امید ہے کہ آپ اللہ پاک ڈرڈا جیٹس کو دل دینی بات چوٹی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ ☆ ☆ محسن صاحب: جلیز! آپ دل برداشتہ نہ ہوں، وقت پر آپ کی کہانی بھی ضرور شائع ہوگی۔ آپ کہانی لکھتے رہیں باقی کام ہمارا، آپ بہت حوصلہ مند جوان لکھتے ہیں اور حوصلہ والے ہی کامیاب ہوتے ہیں امید ہے آپ آئندہ ادبی خیریت نامہ بخیر تجزیہ ضرور ارسال کریں گے۔

غلام فیسی فوری: کھدیاں غاس سے، سب سے پہلے ڈر کے تمام قارئین، رازنڈر اسلاف اور دیگر علمے کو دل کی اتھا گہرائیوں سے سلام اس کے بعد جنوری 2013ء کے شمارے کا احوال کچھ یوں تھا کہ خطوط کی مکمل میں پہنچے تو دیکھا کہ صرف حسین نے شاعری پسند کی اور قاریہ تبسم نے خطہ ان کا بہت بہت شکریہ۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ تبسم خان، عائشہ ارمان، زاہدہ، عطا محمد گلشنہ حسین، کائنات بلوچ، عثمان غنی، مجاہد صف وارث، اور قاریہ تبسم کے خطوط محبت بھرے انداز میں لکھے گئے تھے۔ کہانیوں میں رد و کار بیسٹ آف دی مینج تھی۔ اس کے بعد بلیک نا ٹیگر اور سنہری تابوت زبردست رہی۔ ڈراما نوٹشیں کی کہانی زبردست تھی۔ ہمایک سزا، شاعرانہ بحر کی کہانی منفرد تھی، اداسی سمندر، وارث آصف دیری گنہ گار روح بچی، صندوق شاہین، خوب کہانی تھی۔ تابوت، شباب شگ، گنہ گار، نقار، نقار، نصر، کہانی بہت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ خودی کا قائل آفسی رباب آپ نے ڈر کی حد کر دی۔ خونی جوکر، جنات کا مہمان، دلگام، انجام، اور ذرا سی بات ابھی تھیں۔ مفرد نقل شدہ تھی یہ پہلے بھی ایک جگہ شائع ہو چکی ہے۔ قوس قزح اچھا تھا آخر میں ڈر کے لیے دل کی اتھا گہرائیوں سے دعا گو ہوں۔

☆ ☆ ☆ غلام نبی صاحب: دل کی گہرائیوں سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تحریف کے لئے بہت شکریہ آپ کے خلوص نامہ کا اگلے ادبی شدت سے انتظار ہے گا۔

قدیدر وانا: راولپنڈی سے، آپ کی خیریت کا طالب ہوں ایک غزل ارسال ہے۔ کسی بھی قریبی اشاعت میں جلد سے کر سکتا ہوں۔ فرمائیں۔ جنوری کے شمارے میں شائع شدہ تمام کی تمام تحریر زبردست اور دل موہ لینے والی تھیں ان کی جتنی تحریف کی جائے کم ہے غزلیں اور اشعار بھی من کو بھاگئے۔ آپ کی صحت اور ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ ☆ ☆ قدیر صاحب: ڈرڈا جیٹس سے آپ کی دالہا نہ جاہت قابل دید ہے امید ہے آپ آئندہ ادبی شکر کے کاموں دیں گے۔ عثمان غنی: پشاور سے، السلام علیکم میری طرف سے نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔ تمام لکھنے والوں کو دلور تمام پڑھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئے سال کی آمد پر سب کو خوشیاں عطا فرمائیں۔ ڈرڈا جیٹس کا نئے سال کا پہلا شمارہ 20 دسمبر 2012ء کے آخر ماہ میں مل گیا۔ نا ٹیگل بہت زیادہ خوبصورت تھا۔ میرا خط اور شعر شاعری شائع کرنے پر آپ سب کا تھوڑا سے شکریہ ادا کر رہیوں میں تینوں تحریریں خوبصورت اور زبردست رہیں۔ سٹگل کہانیوں میں اول نمبر پر لگام عمران قریشی کی تحریر رہی۔ دوسرے نمبر پر پہاری کے جن نے یہ مقام حاصل کر لیا۔ تیسرے نمبر پر روح بچی، عطا محمد زبردست موضوع اور خوف سے بھر پور رہی۔ ان میں ہر عدد راسخوئی زبردست تھی۔ مفرد اعلیٰ ذوق کی کہانی تھی۔ جنات کا مہمان، خونی کہانی تھی۔ خودی کا قائل، ستار کن رہی۔ انجام نے زیادہ متاثر کیا۔ تابوت جادوئی کالے ستر کی کہانی اچھی لگی۔ ذرا سی بات واقعی، گہریلو موضوع

اثر انگیز رہی۔ بدروح پیکر، ستار کیا۔ باقی تمام دوستوں کی کہانیاں خوبصورت اور زبردست رہیں۔ کیا میری محنت شدہ کہانیاں، خوف اور یادداشت میں کسی ایک کا شائع ہونے کا امکان ہے۔ میں ڈرڈا جیٹس تمام رسالوں سے عزیز ہے۔ پلیز اپنی کہانیاں بھیج رہا ہوں۔ اس کو شائع کر دیجئے گا۔

☆ ☆ ☆ عثمان صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر مزا آیا۔ کہانیوں کی تحریف کے لئے دیری چھینکس۔ آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی۔ پلیز اگھر آئیں نہیں۔ جو کہانیاں زیادہ اصلاح طلب ہوتی ہیں ان میں وقت تھوڑا زیادہ لگ جاتا ہے۔ ہم کسی کی بھی تحریر ضائع نہیں کرتے۔ آپ کے خط کا آئندہ ادبی انتظار ہے گا۔ Thanks

شرف الدین حیلانی: ٹنڈوالہار سے، السلام علیکم 2013ء کی ابتداء ہے دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ یہ سال امت مسلمہ اور احباب سمیت ہم سب پاکستانوں کو ہر آفت سے محفوظ رکھے آمین۔ مجھ سمیت ڈر کے سب ساتھیوں کی ترقی کے لئے دعا گو ہیں۔ مگر 2013ء کا ڈرڈا آغاز بہت ملا ہوا قوس قزح سمیت کی مٹنے غائب تھے مگر فہرست میں نام موجود تھے۔ فوراً ہی پڑا میں بسناں پر چھاپہ مارا ڈر کی جانچ شروع کی آ کر مکمل ڈر مل گیا۔ ادارے کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنا چاہیے۔ تقریبی نوکی وجہ سے دسمبر کے شمارے کا تبصرہ نہ کر سکا۔ دسمبر کے شمارے میں اشارہ نوٹشیں صاحب کی یادداشت کی تحریف نہ کرنا زیادتی ہوگی وہ ڈر کے ساتھیوں کو اپنا بنائیت بھرنے دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔ جنوری کے شمارے میں ایس۔ امتیاز احمد۔ قاریہ تبسم، عائشہ، زاہدہ، عطا محمد، ایس حبیب خان، گلشنہ حسین، نے ڈر کے لکھنے پڑھنے والوں کو دعاؤں کے ساتھ بہترین تمغے کیے جو بار بار پڑھے۔ میں پہلے بھی لکھا چکا ہوں کہ میں تین کلاس سے زیادہ اسکول نہیں گیا ہوں لہذا لکھنے میں اسکر غلطیاں ہوتی ہیں آپ بھیج کر سکتے ہیں کیوں کہ آپ لوگ بہت ذہین ہیں والسلام دعا میں سب کے لئے۔

☆ ☆ ☆ شرف الدین صاحب: آپ جو کچھ لکھتے ہیں اچھا لکھتے ہیں، آج کل کا ایک میٹرک کا طالب علم آپ جیسے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام قریبی رشتوں کو بخیر دعائیت رکھے۔

ایس امتیاز احمد: کراچی سے، السلام علیکم امید ہے مزاح گمراہی ہو گا سال کا پہلا خوبصورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ وغیرہ نا ٹیگل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے اسنو پر اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا۔ آر ٹیگل لگانے کا شکریہ۔ میٹر آپ کے پاس ہے۔ پلیز دیکھئے گا۔

☆ ☆ ☆ امتیاز صاحب: خلوص نامہ بھئی کہانی کے بھیجے کا شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی قلمی لگاؤ کا موقع ضرور دیں گے۔ Thanks

محمد وارث آصف: داں پشاور سے، 2012ء کا آخری شمارہ یکم کو ملا۔ سرورق بہت اعلیٰ اور بے حد پسند آیا۔ اسلامی باتیں پڑھ کر دل کو اسلام کی روشنی سے منور کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی رد و کار پڑھی۔ بہترین الفاظ سے لکھی یہ زبردست ہونا کہ داستان ڈرڈا جیٹس کی جان ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔

☆ ☆ ☆ آصف صاحب: آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے اور گزارش ہے کہ آپ ہر ماہ قلمی لگاؤ سے لکھا جائے تجزیہ ضرور ارسال کیا کریں۔ احسان سحر: میانوالی سے، اس دفعہ قدر ہے ہٹ کر اور مختلف انداز کی اسٹوری حاضر خدمت ہے۔ ہر کہانی اور راجھی بات میں کوئی نیوٹیٹی اچھا سبق موجود ہوتا ہے۔ میں نے اپنی کہانی کو سبق آموز بنانے کے لیے بہت کوشش کی ہے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔

☆ ☆ ☆ احسان صاحب: اچھی تحریریں ہمیشہ دل موہ لیتی ہیں۔ آئندہ ادبی خلوص نامے کا شدت سے انتظار ہے گا۔

عامر مہلث: راولپنڈی سے، جنوری کا شمارہ نہایت ہی خوبصورت سرورق کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ تحریریں بھی ایک سے بڑھ کر ہیں۔ تمام رازنڈر اچھا لکھ رہے ہیں۔ سب کو سلام اور مبارکباد کہیں ایک تحریر دیکھ کر اسے "ارسلان" سے امید ہے جگہ پالے گی۔

☆ ☆ ☆ عامر صاحب: نئی کہانی ارسال کرنے کے لئے شکریہ۔ آپ کے خلوص نامہ کا آئندہ ادبی شدت سے انتظار ہے گا۔

☆☆☆



اچانک پورے علاقے میں سفید دھواں پھیل گیا اور جب دھواں چھٹا تو دیو ہیکل عجیب الخلفت مخلوق نظر آئی۔ اس مخلوق کو دیکھ کر لوگوں کا پتا پتانی ہونے لگا مگر پھر اچانک اس جگہ ایک نورانی ہالہ نظر آیا اور پھر.....

دل کو ہلا دینے والی خوف و ہشت طاری کرتی پراسرار ریت سے بھر پور سبق آموز کہانی

ہوش میں آ گئیں۔ درد کا احساس ہوتے ہی وہ کراہنے لگیں ان کے بازوؤں اور گردنوں میں سے جہاں رسیاں پیوست تھیں خون نکل کر جم چکا تھا۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو زبان میں پیوست سوئی کی وجہ سے اس کی تکلیف بھری چیخ ہی نکل سکی، سبھی کے منہ میں اسی طرح سونیاں پیوست کی گئی تھیں وہ سب چہرے سے گہرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ لڑکیاں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگیں مگر ان کی ہر حرکت انہیں تکلیف دے رہی تھی۔

آخر انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مگر تینوں لڑکے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ ان کی کمر پر بندھے تھے اور پاؤں مضبوط رسی سے باندھ کر دیں اور چھت میں فکس کنڈوں میں لگائی گئی تھی۔ ان تینوں میں سے ایک لڑکے نے اپنا جسم اوپر اٹھایا۔ بازوؤں کو کمر سے اوپر بندھے پاؤں تک لے آیا اور جسم کو کمان کی طرح موڑتے ہوئے بازوؤں کی رسیاں منہ تک لے آیا۔ دانتوں سے رسی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کی مگر زبان میں لگی سوئی تکلیف دینے لگی۔ اس نے

**شہر** سے کوسوں دور ویران جنگل کے پتوں بچ وہ غلط کنڈرات اس دیرانے کی پراسرار ریت کو بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ اس طرف آنے والے سیاح اور شکاری وہاں کے دیرانوں میں گم ہو جاتے تھے۔ وہاں پر گم ہونے والے لوگوں میں سے اب تک کسی کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے کنڈر کافی وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ جو کہیں سے صحیح سالم کمرؤں کی شکل میں تھے تو کہیں گری ہوئی دیواریں اور چھتیں۔ وہاں پر ہر وقت موت کا ساسکت چھایا رہتا تھا۔ وہاں پر سانپ بچھوڑوں اور دیگر حشرات الاراض کی بہتات تھی۔ اس کنڈر میں کسی ذی روح کا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔

اس کے باوجود اس کنڈر کے ایک کمرے میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ پانچ انسان تھے وہ جن میں سے دو عورتیں اور تین مرد پانچوں کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ مرد لٹے لٹکے ہوئے تھے اور ان کے سروں کے مین نیچے لکڑیوں کا ابارک ہوا تھا جبکہ دونوں لڑکیاں ٹائیلوں کی رسیوں سے بندھی سیدی کھڑی تھیں۔ پانچوں اس وقت بے ہوش تھے۔ پہلے تینوں لڑکیوں کو ہوش آیا پھر وقفے وقفے سے وہ لڑکیاں بھی

کراہتے ہوئے منہ کو پورا کھولا زبان باہر نکالنے کی کوشش کی۔ انہیں یہاں قید کرنے والے کسی بھی وقت آسکتے تھے۔ یہی موقع غنیمت تھا۔ اس نے تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گانٹھ کھولنا شروع کر دی۔ جیسے جیسے گانٹھ کھل رہی تھی۔ اس کے منہ سے خون کی روانی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ مگر اس کے ارادوں سے لگتا تھا وہ ہر قیمت پر یہ رسیاں کھول کر خود کو آزاد کرنا چاہتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہاتھ آ آزاد ہو گئے۔ اس نے اپنے پاؤں کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ ابھی وہ ایک گانٹھ ہی کھول سکا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو خوف سے اس کی آنکھیں پھٹکتی چلی گئیں۔ اس نے اپنی ساری توجہ پاؤں میں بندھی رسیوں پر مرکوز کر دی۔ وہ اور زیادہ تیزی سے انہیں کھولنے لگا۔ مگر تینوں لڑکوں کے نیچے پڑے لکڑیوں کے انبار میں یکدم آگ بھڑک اٹھی۔

بال جلنے کی بو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ وہ تینوں تکلیف سے چیخ رہے تھے لڑکیاں بھی یہ منظر دیکھ کر چیختے جا رہی تھیں۔ اندر آنے والوں کی توجہ لڑکیوں کی طرف ہوئی تو انہوں نے اپنے ہاتھوں کا رخ تبدیل کیا ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ آگ اگلنے لگے۔ لڑکیوں کے جسموں کو بھی آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ان کے لرزہ خیز چیخوں سے پورا کھنڈر لرز اٹھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوا تھا جو آگ اور پتھر کی پرستش کرتا تھا۔ اسے بھی اپنے والدین سے یہی تربیت ملی تھی کہ وہ ان پتھروں اور آگ کے سامنے سجدہ کرے۔ وہ یہ کام کرتا تو تھا مگر اس کا دل اس بات پر مطمئن نہ تھا کہ یہ بے جان چیزیں اس کی کوئی مشکل حل کر سکتی ہیں۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں پر چل تو رہا تھا مگر صرف حالات کے پیش نظر۔ اس کی سوچ اپنے بڑوں سے بہت مختلف تھی۔ کبھی کبھی وہ آسمان پر چھائے ستاروں کو دیکھتا تو سوچتا کہ یہ خوبصورت نگہکشائیں یہ پہاڑ، چاند، سورج اور طرح طرح کی

نعمتیں کیا اس آگ کی مہر ہوں منت ہیں؟ اور اس کا دامغ جواب دیتا۔ ”نہیں بالکل نہیں۔“

اسی سوچ میں پڑے اسے گھنٹوں گزر جاتے اور پھر ول کو منور کرتی ایک نورانی روشنی ہر طرف پھیل جاتی تو وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔

وہ اپنے قبیلے والوں کو چیخ چیخ کر کہتا جا رہا تھا کہ یہ جنہیں تم پوجتے ہو یہ اس لائق نہیں مگر پھر بہت سے وہم اسے ایسا کرنے سے روک دیتے۔

انہی دنوں اسے ایک اہم کام سونپا گیا جب اسے پتہ چلا کہ وہ 22 سال کا ہو چکا ہے۔ ان کے قبیلے کا یہ رواج صدیوں سے چلتا آ رہا تھا کہ جو بچہ 22 سال کی عمر کو پہنچتا اس کو وہاں کی فوج میں شامل کر لیا جاتا۔ دنیا میں پھیلے ایسے لوگ جن کو وہ جادو گروں یا ساحروں کے نام سے جانتے تھے ان کا خاتمان کا مشن تھا۔ اس وقت بھی وہ مراقبہ کی حالت میں تھا جب اسے سردار کے سامنے پیش ہونے کا بلاوا آیا۔

تھوڑی دیر میں وہ سردار کے روبرو کھڑا تھا۔ ”تم جانتے ہو کہ تم بائیس سال کے ہو چکے ہو۔ ہم تمہیں مشن پر بھیجنا چاہتے ہیں، لیکن تمہارے ذہن میں کوئی سوال ہے یا پھر تم تیار ہو؟“ سردار نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔

”میں تیار ہوں جناب۔“ اس نے اپنا سر خم کیا۔ ”شاباش، میناش مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ سردار نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کمرے کے درمیان میں ایک ڈھانچے کا گول چھوڑا تھا جس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ سردار نے اپنے ہاتھ مخصوص ابدال میں چھوڑے کے گرد دہرائے تو اس شیشہ پر ایک دم دھواں چھانا شروع ہو گیا۔ دھواں چھٹنے کے بعد شیشہ کے اندر ایک منظر ابھرا۔

”اوجھر آؤ میناش۔“

میناش چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شیشے کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ ششک گیا۔ وہ ایک لمبی سفید داڑھی والا شخص تھا۔ جو شیشہ ہاتھ میں لے کر آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے

سے نور ہی نور پھوٹ رہا تھا جس کی روشنی وہ کبھی کبھی اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔

پھر منظر بدلا ایک سولہ سترہ سال لڑکی اپنے آگے کوئی کتاب رکھے منہ ہلارہی تھی اس کی آواز وہاں سنائی نہیں دے رہی تھی۔

”یہ دونوں افراد تمہارا مشن ہیں۔ ان کو اٹھا کر یہاں لانا ہی تمہارے ذمہ ہے۔ ان کو یہاں کیسے لانا ہے یہ تمہاری اپنی ذہانت پر منحصر ہے۔ ایک بات یاد رکھنا یہ لوگ کمال کے ساحر ہوتے ہیں۔ بے شک ہماری طاقتیں ان سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں مگر یہ لوگ اپنے پھوٹے سے جاوے سے تمہیں بے بس کر سکتے ہیں۔ پھر ہم بھی تمہاری مدد نہیں کر سکیں گے۔ تم سمجھ رہے ہونا میری بات؟“ سردار نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ جی۔

”اب جاؤ اپنی تمام طاقتیں اس مشن پر لگا دو۔ اور ایک بات ذہن میں رکھنا اگر تم ناکام لوٹے تو موت تمہارا مقدر رہے گی۔“ سردار نے انتہائی سربلجھ میں کہا۔

میناش لمبے لمبے گھبراتا کمرے سے نکل گیا۔

”یہ کیا حماقت ہے لاماش اپنے بیٹے سے تم اس طرح پیش آ رہے ہو؟“ میناش کے جاتے ہی ساتھ ہی عورت نے زبان کھولی۔

”بے شک وہ ہمارا بیٹا ہے۔ مگر اسے بھی تو یہ علم ہونا چاہئے کہ قانون سب کے لئے ایک جیسا ہے۔ اور میں اپنے مشن کو پورا کرنے کے لئے یہ نہیں دیکھوں گا کہ کون میرا رشتہ دار ہے، میرا مقصد صرف اور صرف ان علاقوں سے دوسرے دینے والے مسلمانوں کا خاتمہ ہے جب تک اس علاقے میں ایک بھی ایسا مسلمان ہے میرا مشن جاری رہے گا۔“ اتنا کہہ کر سردار اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

طلعت شاہ اس شہر میں بہت مشہور و معروف تھے۔ یہ شہر انہیں اونچے اونچے پوسٹرز یا بی وی پر شائع کردہ اشتہار سے نہیں ملی تھی بلکہ یہ تو ان کی خوشبو تھی جو اس شہر سے نکل کر دوسرے شہروں میں بھی

پھیل رہی تھی۔ وہ پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ جمعہ کے جمعہ وہ اپنے گھر میں درس دیا کرتے تھے جس میں محفل مراقبہ اور تحلیل نفسی پر پریکٹیکل بھی کئے جاتے۔ اسم ذات اللہ کا ذکر کیا جاتا۔ اس روحانی اور وجدانی محفل میں شرکت کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔

”انسان کا کوئی فرقہ نہیں انسان انسان ایک سچا مسلمان ہونا چاہئے۔ فرقہ داریت سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور انسان اپنے اصل مقصد کو بھول بیٹھتا ہے۔“

وہ مغرب کی نماز پڑھ کر آ رہے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے کسی کے چلنے کا احساس ہوا انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ شام کا دھندلا آہستہ آہستہ سیاہ چار اور اڑھ رہا تھا۔ ایک موٹر سے مڑتے ہی سامنے کچھڑا تھا۔ یہاں پر اکثر ناہمس سیورج سسٹم ہونے کی وجہ سے پانی کھڑا رہتا تھا۔

شاہ صاحب نے شلوکار کو اوپر کیا اور کچھڑے سے نیچے ہوئے گزرنا چاہتے تھے کہ جانے کہاں سے ایک وزنی پتھر اس کچھڑے میں آگرا۔ شاہ صاحب کے سارے کپڑے کچھڑے سے لٹ پٹت ہو گئے۔ کبھی ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کے جسم میں انگارے سے بھر گئے ہیں کوئی ان کے وجود پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاہ صاحب نے بہت جدوجہد کی مگر آخر کار ان کا ذہن اندھروں میں ڈوبنا چلا گیا۔

جب انہیں ہوش آیا تو ان کے جسم پر لباس برائے نام تھا اور سارا جسم گندگی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ایک کرسی پر بندھے پڑے تھے۔ اور ان کی زبان میں سوئی پوسٹ تھی۔

میناش سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور سردار اندر داخل ہوا۔ ”شاباش بیٹا شاباش! تم نے کمال کر دیا۔“ سردار لاماش نے بیٹے کو سراہتے ہوئے کہا۔

”مگر اس کے جسم پر گندگی کیوں مل دی تم نے؟“ سردار نے حیرانگی سے پوچھا۔



”میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ جب اس شخص کے کپڑوں یا جسم پر گندگی ہوگی ہماری خفیہ طاقتیں اس پر اثر کریں گی۔ دوسری صورت میں ہم لوگ اس کے نزدیک بھی نہیں جاسکتے ہیں، میں نے راستے میں بہت کوشش کی مگر جب تک اس کے کپڑے پاک تھے میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکا۔ اس لئے میں نے اس کے سارے جسم پر گندگی دل دی ہے۔“ میناش نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

”بہت خوب، بیٹا، یہی تو ہوتا ہے ان کا جادو کہ اسنے طاقتور ہونے کے باوجود ہم ان کا کچھ نہیں لگاڑ سکتے۔“ اب تم جاؤ کوئی کام ہوا تو ہمیں بلوایا جائے گا۔“ سردار نے نہایت خوشی سے کہا۔

میناش کے جانے کے بعد سردار نے ایک طرف پڑا چمکدار خنجر اٹھایا اور شاہ صاحب کی گردن پر پھیر دیا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ گرم گرم خون کے چھینٹے لاش کے منہ پر پڑے تو اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں شاہ صاحب کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔

طلعت شاہ کو گم ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا ان کے چاہنے والوں میں کافی دولت مند لوگ بھی تھے جنہوں نے شاہ صاحب کی تلاش پر کافی خطرہ نہیں خرچ کیا مگر ان کا نشان کہیں نہ ملا۔ رو دھو کر ان کے گھر والوں نے بھی صبر کر لیا۔ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ مریم، گل سے چھوٹی تھی اور ایم اے اسلامیات کر رہی تھی۔ جبکہ گل ایک معمار تھا اس کا شروع سے پڑھنے کا دل نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ صرف نڈل کر سکا اور پھر کام میں مصروف ہو گیا۔

مریم بالکل باپ پر گئی تھی پانچویں وقت کی نماز پڑھتی تلاوت کرتا اسے بہت اچھا لگتا تھا اس کی قرأت اور شہد جیسی آواز سن کر خود گل اس کے پاس بیٹھ جاتا اور جب تک وہ تلاوت کرتی اسے ستار جتا لگتی ہی بارود بھائی سے کہتی ”بھیا تم خود بھی تلاوت کیا کرو بہت سکون ملتا ہے۔“

تو وہ کہتا ”ابھی بہت زندگی پڑی ہے، میں اس

راستے پر ضرور آؤں گا مگر اس طرح کہ پھر واپس نہ ہو سکوں۔ میں بندھنا نہیں چاہتا۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ میں پہلے اچھی طرح سے عیش کرنا چاہتا ہوں اور پھر جب میں اسکا جاؤں گا تو میں خود ہی دین کی طرف لوٹ آؤں گا۔“

مریم اس کی سوچ پر بہت ہیچ و تاب کھاتی اور اس کے جانے کے بعد خدا کے حضور دعا مانگتی کہ ”اے خدا اس کو صراطِ مستقیم پر چلا۔“

گل باپ کی طرح نمازی پر بڑھارے شک نہیں تھا مگر اسلامی اقدار کی بے حرمتی بھی نہیں کرتا تھا نہ اس کو کوئی برا شوق تھا۔ اس کے تین دوست تھے۔ ناصر جو ایک منٹ کی بات کھنے میں ختم کرنا تھا۔ گلو جو خود کو گلوکار نما چہرے سمجھتا تھا اور تیسرا مرزا جو اپنے بے شکے محاروں کی وجہ سے مرزا محاروی کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔

”نصیر و بھیا!“ گل ناشتہ کر چکا تھا اور کام پر نکلنے ہی والا تھا کہ مریم کی آواز پر پلٹا۔ ”مجھے رات سے کافی ڈراؤنے خواب آرہے ہیں۔ آپ یہ نقش قرآنی گلے میں پہن لیں۔“ مریم نے ڈوری میں بندھا ایک نقش گل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اوہ کیا مصیبت ہے مریم تم بھی نا۔“ اب کیا اس نقش سے میری آنے والی موت مل۔۔۔۔۔۔ گل کی بات پوری ہونے سے پہلے مریم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسا تم کو گل، ابا کے لایے ہوئے کے بعد تم ہی تو ہمارا سہارا ہو۔“ مریم کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور گل سب کچھ دیکھ سکتا تھا مگر مریم کی آنکھوں میں آنسو نہیں۔ اس لئے اس نے نقش لے کر گلے میں ڈال لیا اور مریم کی آنکھوں سے نکلنے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر دیئے۔

وہ گھر سے نکلا تو تینوں دوست اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ”میاں آپ تو گلے میں تو بیز ڈال کے نکلے ہو کوئی آندھی طوفان تو نہیں آنے والا۔“ مرزا کی

نظر اس کے گلے میں پڑے تو بیز پر پڑی۔ وہ بولا۔ ”نہیں مرزا یہ چھوٹی نے دیا ہے کہتی ہے اسے بہن لو آفات مل جاتی ہیں۔“

گل کو ایک پازہ کا ٹھیکہ ملا تھا اور اس نے وہاں مزدور مستری لگائے ہوئے تھے یہ تینوں اس کے گھر سے دوست تھے اور اس کے ساتھ مزدوری کرتے تھے۔ آج کام ختم کرتے کرتے گیارہ بج گئے جس راستے سے وہ کام پر آتے تھے وہ کافی لمبا تھا۔ اور اس وقت کوئی آٹو یا ٹیکسی بھی نہیں مل سکتی تھی سو گل نے شارٹ کٹ اختیار کر لیا۔ یہ راستہ ایک چھوٹے سے قبرستان سے ہو کر گزرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ قبرستان کافی بھاری ہے۔ آسیب بھوت پریت کا مسکن ہے۔ یہاں لوگ صبح کے وقت بھی آنے سے کتراتے تھے۔ گل نے آسیب وغیرہ کو کبھی حقیقی نہیں مانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے دھڑک قبرستان کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ ”بھیمہ۔۔۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔۔ گل۔۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔۔ کب۔۔۔۔۔۔ کدھر جا رہے ہیں؟“ ناصر اپنے مخصوص اسٹائل میں بولا۔ ”اپنے گھر جا رہے ہیں اور کدھر جانا ہے۔“ گل نے لا پرواہ کے انداز میں کہا۔

”مگر یہ قبرستان تو آسیب زدہ ہے۔“ اب کی بار گل نے معلومات بڑھائی۔

”مجھے معلوم ہے جس کو ڈر لگتا ہے وہ واپس جاسکتا ہے۔“ گل اب قبرستان کے داخلی راستے پر پہنچ چکا تھا۔ ”میاں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی چیز ہمارے راستے میں آئی تو خنجر میرے پاس۔“ مرزا نے پان کی پیک بھینگی اور شلوار کے نیچے کوچھ چھپایا اور پھر وہ چاروں قبرستان میں داخل ہوئے۔

ابھی وہ قبرستان کے وسط میں تھے کہ انہیں اپنے پیچھے سے ”چھن چھن“ کی آواز آنے لگی ایسا لگتا تھا کہ کوئی ان سے چار قدم پیچھے چل رہا ہے۔ پہلی بار گل، کو بھی پسینے آنے لگے۔ پھر وہ آواز قریب آئی اور ان کے پیلووں سے ہوتی ہوئی گزرتی۔ چاند کی مدد مد روشنی میں بھی اس کا اجلا سراپا صاف نظر آ رہا تھا، ذرق برق

لباس میں لمبوس، وہ ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے کافی خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں میں پائلیں تھیں جس کی وجہ سے چھن چھن کی آوازیں آرہی تھیں۔

وہ لڑکی ان کے آگے چلتی ہوئی یک دم پلٹی ایک اداسے ان چاروں کو دیکھا اور پھر منک منک کر چلنے لگی۔ ”چودھویں کا چاند ہوا آفتاب ہو۔“ گلو نے اپنی بے سری آواز سے ”رفیع صاحب“ کو نکست دینے کی کوشش کی۔

لڑکی کھٹکلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی بھی اس کی طرح خوبصورت تھی۔ اچانک پان کی پیک پیچھتے ہوئے مرزا کی نظر لڑکی کے پاؤں پر پڑی تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ”گل میاں! تم نے بھی ”بھامے“ پاؤں لائے والا محاورہ سنا ہے۔“ مرزا نے گل کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

گل اس لڑکی کے حسن میں جو تھا مرزا کی بات سنی ان سنی ہو گئی۔ کبھی تو سیدھا بول لیا کہ مرزا جی ”اگلے پاؤں بھاگنا ہوتا ہے۔“ ”بھاگتے پاؤں الٹنا نہیں۔“ گلو نے تسبیح کی۔

”آرے ذرا اس لڑکی کے حیردیکھو۔“ مرزا گلو سے مخاطب تھا گل بھی ان کی بات سن کر لاشعوری طور پر اس لڑکی کے حیردیکھنے لگا۔

”کیا ہوا ہے حیروں کو۔“ گلو نے اس کے پاؤں گھورتے ہوئے کہا۔ ”میرے تہہ نیچے سے الٹی ہیں مطلب پاؤں الٹے ہیں اب سمجھ آئی؟“ مرزا نے ڈرامائی انداز میں سرگوشی کی۔

ناصر جو مرزا کی باتیں سمجھ نہیں پارہا تھا اچانک اونچی آواز میں بولا۔ ”بب۔۔۔۔۔۔ بے۔۔۔۔۔۔ چاری۔۔۔۔۔۔ کب۔۔۔۔۔۔ کو۔۔۔۔۔۔ پ۔۔۔۔۔۔ بولیو ہوگا۔“ اس کا جواب سن کر تینوں نے اپنی اپنی کوبھٹکی کنٹرول کیا۔

وہ لڑکی یکدم پلٹی تو اس کی شکل کافی خوفناک ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ان چاروں کے قریب ہوتی

جاری تھی۔“ لگتا ہے باتوں کے بھوت لائقوں سے نہیں مائیں گے۔“ مرزا اس موقع پر بھی محاورے کی ٹانگ توڑنا نہ بھولا تھا۔

”مم مجھے سمجھ نہیں آرہی..... کک..... کہ..... ت..... تم اتنا..... ڈ..... ڈر..... کیوں رہے ہو۔“ ناصر نے حیرانگی سے سوال پوچھا۔

”ابے گھاس اس کے پاؤں اٹلے ہیں مطلب یہ چڑیل ہے۔“ گلو نے اس کی گدی میں چپت رسد کرتے ہوئے جواب دیا۔

”چ..... چڑیل۔“ ناصر کی گھٹکی بندھ گئی۔

چڑیل سیدھا مرزا کی طرف آ رہی تھی اب ناصر کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی اور اس کی خوفناک شکل دیکھ کر وہ خوف سے جتنے جا رہا تھا۔ ”قبرستان کے خارجی راستے کی طرف بھاگو۔“ گل نے چلا کر کہا اور خود چڑیل کی طرف بڑھا جو مرزا کی گردن کا پورے چپکلی تھی۔ گل نے جاتے ہی اس کے بال پکڑے اور ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا۔ چڑیل نے درد سے چیخے ہوئے مرزا کی گردن چھوڑ دی۔ مرزا نے موقع غنیمت جانا اور شلوار کے نیچے میں آڑے خنجر پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ ایک جھٹکے سے خنجر باہر نکالا اور بہادر بننے کی جستجو میں اپنا ازار بند کاٹ بیٹھا۔ پتہ تیب جلا جب شلوار تر کا پاؤں پر جا گری۔

چڑیل نے ایک زبردست جھٹکا اپنے بالوں کو دیا تو گل اڑتا ہوا اس کے سر سے ہوتا سامنے جا گرا۔ چڑیل کے دونوں ہاتھ لے ہوئے گئے۔ ایک مرزا کی طرف اور دوسرا گل کی طرف۔

مرزا اپنا ٹوٹا ازار بند جوڑنے میں مگن تھا جب چڑیل کا ہاتھ قریب آیا تو جان بچانے کے لئے بھاگا۔ مگر اس کا ہاتھ مرزا کی شلوار پر پڑ چکا تھا۔ مرزا نے عزت پر جان کو ترجیح دی اور شلوار وہیں چھوڑ کر قبرستان کے خارجی راستے کی طرف بھاگا۔ چڑیل کا دوسرا ہاتھ گل کی گردن پر پڑ چکا تھا اور وہ اسے اٹھا اٹھا کر کھینچ رہی تھی۔ گل اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت جدوجہد کر رہا تھا۔ اسی کھینچنا تانی میں جانے کب گلے

میں پڑا نقش باہر آیا اور اس سے منعکس ہوتی سنہری کرنیں چڑیل کی طرف بڑھیں گل کو واضح نظر آ رہا تھا کہ قرآنی نقش کے حروف سنہرے ہو کر چڑیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جیسے ہی یہ حروف چڑیل کے جسم سے ٹچ ہوئے اسے آگ نے پکڑ لیا، چڑیل کی جینیں اتنی بھانک تھیں کہ مجبوراً گل کو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنی پڑیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ گل نے تعویذ کو چوما۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ اب ہم آئندہ ادھر سے نہیں گزریں گے۔“ گلو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”نہیں اب وہ ختم ہو چکی ہے۔“ ڈرنے کی کوئی بات نہیں میری آنکھوں کے سامنے اسے آگ لگ گئی تھی اور یہ سب اس نقش کی بدولت ہوا ہے۔“ گل نے انہیں خوف زدہ دیکھا تو تسلی دی۔

چلو اچھا ہوا۔“ خس کم جہاں پاک“ مرزا بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

”تتم تم بھی..... بہت سر..... نکال رہے تھے کہ.....“ چ..... چودھویں کا..... چاند..... ہو..... یا..... آف..... آفتاب..... ہو..... اب..... مگ..... گاؤ..... ب..... بولتی بندھو گی کیا؟“ ناصر نے گلو سے کہا جو اب بھی تک کانپ رہا تھا۔

اس دن سے گل پانچ وقت کا نمازی ہو گیا وہ فارغ وقت میں اپنی بہن مریم سے قرآن کی تعلیم بھی لینے لگا۔ مریم کے پاس بہت وسیع علم تھا، وہ ہر آیت کا ترجمہ اور تفسیر کافی تفصیل سے بتاتی۔ اس کی باتیں سن کر گل کے اندر پھولی ایمان کی نازک سی کوپنل کو خدا کی اور وہ آہستہ آہستہ ایک بڑے پودے کی شکل اختیار کرنے لگی۔

آج مریم کافی پریشان نظر آ رہی تھی اس کی ماں سیکنے نے اس سے بہت پوچھا مگر وہ مردود کہا نہ کر کے ٹال گئی۔ گل بھی دو تین ہفتے کے لئے فارغ تھا۔ جب وہ بہن سے قرآن کا درس لینے بیٹھا تو اسے پریشان

اور بے چین پایا۔“ کیا بات ہے مریم تم مجھے کافی پریشان لگ رہی ہو؟“ گل نے استفسار کیا۔ تو مریم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”بہاد کیا مسئلہ ہے؟“ گل بھی اس کی حالت دیکھ کے کافی گھبرا گیا تھا۔

”بھیا میں تعلیم چھوڑنا نہیں چاہتی میرے امتحانات میں دو ماہ رہ گئے ہیں مگر میرا کالج جانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔“ مریم نے روتے روتے ہم سے انداز میں بتایا۔

”ارے پلگ روتی کیوں ہے مجھے صاف صاف بتا۔“ گل نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

”وہ لڑکا شہر کے بہت بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔ وہ مجھے کالج میں داخلے کے دن سے پریشان کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ کل دوپہر کے بعد فلاں ہوٹل میں اگر تم نہ آئیں تو میں سب کے سامنے تمہاری عزت.....“ اتنا کہہ کر مریم پھر سے رونے لگی۔ یہ سب سن کر گل کا خون کھولنے لگا۔ ”فکر نہ کرو تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔ میں کل خود تمہارے ساتھ کالج جاؤں گا تم مجھے وہ لڑکا دکھانا۔“ گل نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو وہ گل کے سینے میں چھپ گئی۔

اگلے دن گل اسے چھوڑنے کالج گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی چار پانچ لڑکے ان کی طرف بڑھے۔ ان کا پہناؤ اور خلیں بتا رہی تھیں کہ وہ یہاں پڑھنے کے بجائے لوفری کرنے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شرٹس کے بٹن کھول رکھے تھے۔ چروں پر طرح طرح کی کریمیں لگائی ہوئی تھیں اور بال عورتوں کی طرح بڑھے ہوئے۔“ کیا بات ہے بلبل! ہم میں کون سی کمی دیکھی جو اپنے اس عاشق کو ساتھ لے آئی ہو۔“ ان میں سے لے بے قد کے لڑکے نے انتہائی بے ہودہ انداز میں کہا۔

مریم نے بھائی کے بازو پر گرفت مضبوط کر لی۔ گل اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ”ارے عزت! دیکھو تمہیں کیسے گھور رہا ہے

جیسے کھا جائے گا۔“ لے بے لڑکے کے ساتھ کھڑے ایک نے کہا۔

گل ان کی سائیڈ سے ہوتا ایک طرف بڑھ گیا مریم کو کلاس میں چھوڑ کر وہ واپس آیا تو سیدھا ان پانچوں کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنی منھیاں زور سے جھینچ رکھی تھیں۔ لے بے قد والے کے سامنے جا کر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا ہو گیا۔

”اے گھونچو! اگر تیرا دل اس پر آ گیا ہے تو تجھے بھی اس کا ٹیٹ کرادوں گا۔ گل کرکھانے سے اتفاق بڑھتا ہے۔“ لے بے قد والے نے اتنی ہی بات کی تھی کہ جیسے گل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گل کا مڑا ہوا گھٹنا اس کی ٹانگوں کے درمیان پڑا تو وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔ گل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اس نے اچھل کر پانی کبھی اس کی کمر میں رسید کی تو وہ زمین پر دھول جانے لگا۔ دوسرے نے یہ دیکھا تو اپنی ہیٹ نکالی اور گل کی کمر پر مارنا چاہتا تھا کہ گل جو اس طرف سے غافل نہیں تھا مڑا اور اس کا وار اپنے ہاتھ پر دو کا ایک جھٹکے سے ہیٹ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس لے بے لڑکے کے باقی دوست بھی آگے بڑھے مگر اس کے بعد گل نے انہیں کوئی حملہ کرنے کا موقع نہ دیا اور سیٹوں گھونسوں اور نکلڑوں سے انہیں ادھ موا کر دیا۔ پانچوں لڑکے تھوڑی ہی دیر میں زمین پر پڑے کراد رہے تھے۔

گل بنے لے بے قد والے کو گریبان سے پکڑا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا۔ ”وہ لڑکی میری بہن ہے، آئندہ اگر اس کی طرف دیکھا بھی تو آنکھیں نوچ لوں گا۔“ پھر وہ اسے آخری ٹھٹھا مار کر کالج سے نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

”تمہارا دوسرا نشانہ لے لڑکی ہے غور سے دیکھ لو اسے اور اٹھا کر یہاں لے آؤ۔“ سردار لاماش نے میناش کو بلا یا اور شیشے میں اسے مریم کا کس دکھایا۔ میناش کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ اس نے سردار سے اجازت لی اور پلک جھپکتے ہی مریم کے گھر آ موجود ہوا۔



مریم اس وقت گل کو پڑھانے میں مگن تھی۔

میناش ان دونوں کی نظروں سے اوجھل ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس لڑکی کے چہرے سے دہی روشنی پھوٹ رہی تھی جو کبھی کبھار میناش کے اندر کے اندھیروں کو چھوڑ ڈالتی تھی، وہ چند منٹ کے لئے اس کے چہرے کو نکلتا رہا۔ قرآن پاک کے مقدس الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرانے لگے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جس سچائی کو وہ تلاش کرتا رہا ہے وہ اسے نہیں ملے گی۔ مریم کی آواز اس کے اندر بھونچال پیدا کر رہی تھی۔

”خدا نے یہ آسمان اور زمین بنائے۔ پھر اس آسمان میں برج مقرر کئے دن اور رات کا بنانے والا وہی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اور ہدایت دنیا بھی اللہ کے اختیار میں ہے، وہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔

یوم حساب کو جب کافروں کے سامنے ان کا اعمال نامہ رکھا جائے گا اور انہیں اللہ کی طرف سے دکھ دینے والا عذاب ہوگا تو وہ کہیں گے کہ ہائے شامت ہمیں ہمارے بپروں نے کہاں پھنسا دیا تھا۔ کاش ہم بھی ہدایت پانے والوں میں ہوتے۔“

مریم بولے جارہی تھی اور میناش کی اندر کی دنیا بدلتی جا رہی تھی۔ یہی کچھ تو وہ سوچتا رہا تھا۔ ان سوالوں کی ہی تو کھوج تھی اسے۔ ابھی تو نور کی ایک کرن اس کے اندر پھونچی تھی وہ پورا نور اپنے سینے میں سمیٹنے کے لئے بے چین تھا۔ مگر اس لڑکی نے وہ مقدس کتاب بند کر دی۔

مسجد سے مغرب کی نماز کا بلا وہ آ رہا تھا گل وہاں سے اٹھا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ مریم نے جانے نماز بچائی اس کی ماں سیکڑ بھی نماز پڑھ رہی تھی۔

وہ حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھنے جا رہا تھا وہ آج تک آگ کو سجدہ کرتا رہا تھا مگر یہ لوگ کسی ان دیکھی ہستی کو سجدہ کر رہے تھے وہ اس سب کو جان لیتا چاہتا تھا۔ جو طمانیت ان لوگوں کے چہرے سے ظاہر ہوئی تھی وہ خود محسوس کرنے کے لئے بے چین

تھا۔ مگر اس کے لئے اسے خود کو ظاہر کرنا پڑتا۔ اس نے چند روز کے لئے دہی رہنے کا پروگرام بنایا۔ اور اس گھر کے صحن میں لگے۔ ایک درخت پر اپنا پیرا کر لیا۔

دہ روزانہ فجر کے وقت اور عصر کے بعد اس لڑکی کی میٹھی آواز سنتا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل کے اندھیرے اگلے میں بدلنے لگے۔ وہ خود ان لوگوں جیسا بننا چاہتا تھا مگر اسے علم نہیں تھا کہ ان جیسا بننے کے لئے اسے کیا کرنا پڑے گا۔ اس لئے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ کب ان لوگوں پر اپنا آپ ظاہر کرے پھر قدرت نے اسے یہ موقع دے ہی دیا۔

گل اس دن فارغ تھا اور جہاں راج مستری بیٹھے تھے وہاں صبح صبح بیٹھا تھا جن لوگوں نے معاری کا کام کروانا ہوتا تھا وہ یہیں سے راج مستریوں کو ملے جاتے تھے۔ ایک چچھائی کا راکھ گھر کے عین سامنے رکھی، اس میں سے ریسہ نہ لباس میں ملبوس ایک شخص اترا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہارا نام گل ہے۔“

”جی میرا ہی نام گل ہے۔“ گل نے جواب دیا۔ ”آؤ تم سے کام ہے۔“ تو وارو نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ گل اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ابھی گاڑی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ بے ہوشی کے اندھے کونوں میں گرنا چلا گیا۔ اس کو ہوش آیا تو اس کے ہاتھ پاؤں پشت پر بندھے تھے اور وہ ایک گھڑی کی صورت کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ ہوش آنے کے کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی شخص منہ میں سگار دبائے اندر داخل ہوا ایک طرف پڑی کرسی صلیج کر وہ اس پر بیٹھ گیا۔ ”گلنا تو نہیں کہ تم نے اسکیلے پانچ جوان لڑکوں کی وھلا کی ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا ہوتا تو اتنی آسانی سے ہمارے قابو میں نہ آتے۔“ سگار کو اپنے پاؤں تلے ملتے ہوئے وہ شخص کو بایا ہوا۔

”دھوکے سے وار کر کے کہتا ہے کہ میں آسانی سے قابو آ گیا، ایک بار مجھے کھول پھر دیکھ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔“ گل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”بہت خوب رہی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ جن لڑکوں کو تم نے چٹان میں سے ایک میرا بننا تھا۔ تم نے عظمت بیک کے بیٹے پر ہاتھ اٹھایا ہے پورا شہر میرے نام سے کانپتا ہے۔ تجھے تیرے کئے کی سزا ملے گی اور وہ ہے موت، ایسی موت کہ تیری روح بھی کانپ اٹھے گی۔ ڈال دو اسے پراس میں۔“ اس شخص نے کہا۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ کھلا، دس بارہ افراد اندر داخل ہوئے جو چہروں سے چھپے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور کمرے سے باہر آئے۔ گل نے دیکھا یہ کوئی اسپنگ فیلڈی تھی جس میں دھاگا بٹا تھا۔ کپاس کو کٹی پراس سے گزار کر مشینیں دھاکے میں تبدیل کرتی تھیں۔

اچانک ہی مشین چلنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ان لوگوں نے اسے اٹھایا اور مشین کے پاس لائے۔ گل نے بہت جدوجہد کی مگر ہاتھ پیر بندھے ہونے کی وجہ سے خود کو بچا نہ سکا اور ردی دھنکے والی اس مشین میں داخل کر دیا گیا بے اختیار اس کے منہ سے کلمہ طیبہ کا درو شروع ہو گیا۔

گل کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر رونما ہوا۔ ایک حسین و جمیل نوجوان کہ ایسا نوجوان اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا اس کے پاس کھڑا تھا۔ یہ ایک وسیع میدان تھا عصر کے وقت کی ڈوبتی روشنی سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان شہزادوں جیسا لباس زیب تن کئے اس کے سر ہانے بیٹھا ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھا۔ اسے جان کنی کی تکلیف محسوس ہوئی تو اس خوبصورت نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس جوان کی مسکراہٹ میں وہ اپنی تکلیف بھول گیا اور خود بھی مسکرا کر اس کے چہرے کو سٹکنے لگا۔ پھر ایک دم ہی اس کے تمام احساسات پر تاریکی چھائی چلی گئی۔ گل کی ہڈیوں اور گوشت کا خون سے بھرا مٹنوبہ مشین کی دوسری طرف گر رہا تھا۔

گل کو گھر سے نکلے آج دوسرا دن تھا اور وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ ماں اور بہن کافی پریشان تھیں۔

”بہنا مریم! میرے دل میں بول اٹھ رہے ہیں پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گل نے کوئی رات باہر گزار دی ہو۔ تم جانتی ہو تمہارے بابا بھی اسی طرح کلم ہو گئے تھے مگر میں اپنے بیٹے کو کون نہیں چاہتی گل کے بنا میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“ سیکڑ نے روتے ہوئے اپنا دکھڑا بیٹی کو بتایا۔

”ماں وہ میرا بھائی ہے اس کے بناء میں بھی کیسے جی سکتی ہوں؟ خدا خیر کرے اور اسے واپس لے آئے۔“ مریم بھی رو رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور گل اندر داخل ہوا۔ ”خیر تو ہے یہ ماں بیٹی آج کس خوشی میں گلے مل رہی ہیں۔“ گل نے دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

”بہنا۔“ اتنا کہہ کر مریم ودر گل سے لپٹ گئی۔ ”ارے کیا ہوا تم لوگوں کو روکیوں رہے ہو۔ وہ تو مجھے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا اور میں بتا نہیں سکا۔“ گل نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا گل، میں تم دونوں کو کچھ کر زندہ ہوں۔ اگر تم میں سے کسی کو کچھ ہو گیا تو میں مرجاؤں گی۔“ سیکڑ نے لاڈ بھرے لہجے میں سرزنش کی۔

”آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا گل۔“ گل نے ماں کے آنسو صاف کئے مریم بھی چپ ہو چکی تھی۔

عصر کے بعد دونوں بہن بھائی قرآن پاک لے کر بیٹھ گئے۔ مریم نے اسے پڑھانا شروع کیا۔ وہ آیت کی تلاوت کرتی اور پھر اس کا ترجمہ کر دیتی۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 49 سے 52 کا ترجمہ و تفسیر بیان ہو رہی تھی۔ گل سر جھکائے بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ مریم کی شہد بھری آواز تلاوت اور ترجمے سے اس کے اندر چھانے غفلت کے پردوں کو چاک کر رہی تھی۔

”اور کہتے ہیں کہ جب ہڈیاں بوسیدہ اور چور چور ہو جائیں گی تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے۔ کہہ دو کہ خواہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک پتھر اور لوہے سے بھی زیادہ سخت ہو۔ جھٹ کہیں

گے کہ بھلا ہمیں دوبارہ کون جلائے گا؟ کہہ دو کہ وہی تم کو جس نے پہلی بار پیدا کیا۔ تو تعجب سے سر ہلانے لگے اور پوچھیں گے کہ ایسا کب ہوگا کہہ دو! سیدہ کہہ جلائے ہوگا۔“

مریم ابھی اتنا ہی ترجمہ کر سکی تھی کہ گل کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”کیا ہوا ہے بھیا! روتے کیوں ہو؟“ مریم نے حیرانگی سے کہا۔

”اپنی اور ان لوگوں کی قسمت پر روتا ہوں جو حق سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔“ گل نے خود کو سنبالتے ہوئے کہا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ گل نے سر جھکائے ہوئے کہا۔  
”پوچھو۔“

”میرا ایک دوست ہے وہ بے دین ہے مگر اسے ہمارا دین پسند آ گیا ہے وہ ہمارے دین میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ کیا کرے؟“ گل نے ٹھہر ٹھہر کر سوال کیا۔

”جزاک اللہ۔ اسلام ایسا مذہب ہے جو اتنا مشکل نہیں اسے کہو کہ کلمہ طیبہ سچے دل سے پڑھے اور جن کاموں سے ہمارا مذہب روکتا ہے وہ چھوڑ دے بس۔“ مریم نے اسے مسلمان ہونے کا ذریعہ بتایا۔

”کلمہ طیبہ کیسے پڑھے گا وہ؟“ گل نے بے چینی سے پوچھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں گل، کلمہ طیبہ بھلا کیسے پڑھا جاتا ہے اتنا بھی نہیں معلوم۔“ مریم نے حیرانگی سے گل کو دیکھا۔

”وہ تو مجھے معلوم ہے مگر میں یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا سر ڈھانپنا ہونا چاہئے یا نہیں۔“ گل ٹھہرا گیا تھا اور گھبراہٹ میں اس نے بات بنا دی۔ مریم ہنس پڑی۔  
”بہت بدحواس ہوتے جا رہے ہو۔ نماز کے لئے یا تلاوت کے لئے سر کو ڈھانپنا ضروری ہے۔ کلمہ طیبہ ایسا کلمہ ہے جس میں ہم دل سے اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔“

سر ڈھانپنا چاہئے یا نہ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں صرف کوئی غیر مذہب سچے دل سے کہہ دے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔“ مریم نے اسے بچوں کی طرح بھجایا۔

گل جو اصل میں میناش تھا بھی جانتا چاہتا تھا۔ اس نے دو دن پہلے جب مریم اور اس کی ماں کو گل کے لئے پریشان دیکھا تھا تو وہ گل کی تلاش میں نکل گیا تھا اور پھر اسے پتہ چلا کہ گل اب دنیا میں نہیں رہا تو وہ خود اس کی صورت لے کر یہاں چلا آیا تھا۔ اور اب جب تک اس کی زندگی تھی وہ یہیں رہنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اسلام کی پراگندگی سے واقف ہوتا گیا۔ وہ اس ذات کا بہت شکر گزار تھا جس نے اسے ہدایت کا راستہ دکھایا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ قوتوں کا استعمال بھی چھوڑ دیا تھا تاکہ مریم یا اس کی ماں کو کوئی شک نہ ہو سکے۔

مگر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے مریم کے ایم اے اسلامیات کے فاضل ایگزیکٹو ہو رہے تھے آج اس کا تیسرا بیچ تھا۔ میر نے دو سال اس کے ساتھ کلاس اینڈ کرتے ہوئے گزارے تھے۔ میر کافی رئیس خاندان کا اکلوتا چراغ تھا۔ مگر کافی بلبھا ہوا اور باہمذہب لڑکا تھا۔ لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا، عشق ناپ کا کوئی بھی مرض، فلتر وغیرہ سے اسے نفرت تھی۔ مگر یہ لڑکی اسے کالج میں داخلے کے دن سے ہی بے چین کئے ہوئے تھی۔ ننھی نگاہ، میک اپ سے عاری چہرہ اور اس کی پاکیزہ معصومیت نے میر کا دل موہ لیا تھا۔ پورے دو سالوں میں صرف تین مرتبہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکا تھا۔ وہ مکمل پروسے میں ہوتی تھی۔

میر نے کافی دفعہ ہمت کی مگر اس کے سامنے کچھ بول نہ سکا۔ میر اپنا پیپر مکمل کر کے امتحانی کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ اس کو دیکھ کر گھر جانا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی ننھی اور دواش روم کی طرف چلی گئی۔ میر نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ جانے کے لئے مڑنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر تین لڑکوں پر پڑی جو تیزی سے دواش روم کی طرف جا رہے تھے یہ کالج کے انجمنی

لوہر اور بدعاش قسم کے لڑکے تھے۔ ان میں ایک لمبا لڑکا عزت بیگ جو شہر کے نایا ذون کا بیٹا تھا سب سے آگے تھا۔ میر کو خطرے کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔ وہ تیزی سے دواش روم کے دروازے پر پہنچا وہ تینوں وہاں نہیں تھے اور لیڈر دواش روم سے مریم کی گھٹی گھٹی چھین سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ انہیں شاید یقین تھا کہ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ اندر کی صورت حال دیکھ کر میر کا خون جوش مارنے لگا۔ مریم کے ساتھ وہ تینوں زبردستی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میر نے قدم آگے بڑھایا تو لمبے قد والے نے ریوالت نکال لیا۔ اس لڑکی کے چہرے پر تھنوں کے نشان دیکھ کر میر کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریوالت کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ ”رک جاؤ وہیں ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ عزت بیگ نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا کہ میر اس کی دھمکی کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میر سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف لڑھک گیا۔

اسی وقت باہر سے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی ہیں تو وہ تینوں وہاں سے بھاگ نکلے تھوڑی ہی دیر میں وہاں اسنوڈس اور ٹیچرز کا مجمع سا لگ گیا۔ ”کوئی اسے اسپتال پہنچاؤ خدا کیلئے۔“ مریم نے جب دیکھا کہ سبھی تماشا دیکھ رہے ہیں تو وہ ہنسی آواز میں کہا۔ ان میں سے چار لڑکے آگے بڑھے میر کو اٹھایا۔ انہی میں سے ایک لڑکے کی گاڑی میں اسے ڈالا۔ مریم بھی ساتھ بیٹھی اور یہ سب اسپتال کی طرف چل پڑے۔

مریم اور میر کے گھر اس حادثہ کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور اب گل سیکرہ اور میر کی فیملی اسپتال میں موجود تھے۔ میر کی حالت خطرے میں تھی گولی دل کے قریب لگی تھی جو نکال گئی تھی مگر خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ڈاکٹر حضرات ناامید تھے۔ ایک نرس آپریشن ٹیمز سے باہر نکلی اور ایک پرچی میر کے والد

کو تھمائی۔ ”کہیں سے بھی اس بلڈ کا بندوبست کریں جلد سے جلد۔“ نرس نے اتنا کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میر کے والد نے سیل فون نکالا اور میر ملانے لگے مگر کافی جگہ رابطہ کرنے پر بھی بلڈ نہیں مل رہا تھا۔ اسنے میں گلو، ناصر وغیرہ بھی آگئے ڈاکٹر آپریشن ٹیمز سے نکلا تو میر کے والد نے پر امید نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ جب تک خون کا بندوبست نہیں ہوگا۔ مریم کی جان کو خطرہ رہے گا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”آپ ہی کہیں سے بندوبست کر لیں نا، میں نے تو بہت کوشش کی مگر۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میر کے والد نے کہا۔

”کیا کہا“ ڈاکٹر نے چاہئے وہ گردن تو گل کا بھی ہے۔“ مریم نے سنا تو خوشی سے جیسے چیخ کر کہا۔ ”کون ہے گل؟“ ڈاکٹر نے تیزی سے پوچھا۔ ”میرا بھائی، یہ کھڑا ہے۔“ مریم نے ایک طرف کھڑے گل کی طرف اشارہ کیا۔ گل کافی تذبذب میں پڑا ہوا تھا۔

”جلدی کرو بیٹا! جس لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر تمہاری بہن کی عزت کی حفاظت کی، کیا اس کے لئے تم خون نہیں دے سکتے؟“ سیکرہ نے گل کو تذبذب کے عالم میں دیکھا تو بولی۔

”نہیں ماں میں خون نہیں دوں گا۔“ گل کے یہ الفاظ سب پر قیامت بن کر ٹوٹے۔ ”میں کہیں اور سے خون کا بندوبست کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر گل اسپتال سے باہر جانے لگا۔ گلو وغیرہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا گل جب کہ تمہارا بلڈ گروپ اس سے ملتا تھا؟“ گلو نے اسپتال سے باہر نکلتے ہی سوال کیا۔

”یہ سب میں تمہیں نہیں بتا سکتا، اس وقت جلد سے جلد مجھے خون کی ضرورت ہے، تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ گل نے کافی غصیلے لہجے میں کہا۔ ”گل بھائی! اگر ہم آپ کے کسی کام آ سکتے



ہوں تو ضرور بتانا۔ مرزا نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ گل اس کی بات سن کر چونکا۔ تم نے بھی اپنا خون میٹ کر دیا ہے؟ گل نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں تو“ مرزا نے مختصر جواب دیا۔

گل کی خفیہ طاقتیں اس کی آنکھوں میں سمٹ آئیں اور وہ تینوں کا میٹ کرنے لگا۔ آخر اس کی سرخ و بہشت زدہ کر دینے والی آنکھیں ناصر پر آ کے رکیں۔ ”مل گیا۔ اڈنگلو، ناصر مجھے تیرا خون چاہئے۔“ گل کی آواز بھی اس وقت کافی وحشت سے بھری ہوئی تھی۔

”گل۔۔۔۔۔ گل۔۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔ ایسی۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ درندگی۔۔۔۔۔ اچھی۔۔۔۔۔ سن۔۔۔۔۔ نہیں ہوتی۔“ ناصر نے مرزا کے پیچھے پیچھے ہوئے کہا۔

گل کا تہیہ بلند ہوا اور پھر وہ اپنی اصلی جون میں آ گیا۔ ”ارے گل بھائی مریش کے لئے خون مانگ رہے ہیں تمہارا زہریلا خون کی کرکسی نے مرنا ہے کیا۔“ گلگو نے اسے جھپٹا پھر وہاں اسے ہسپتال آ گئے۔ ناصر کا بلڈ میٹ اوکے تھان کی دعاؤں اور خدا کے فضل سے سیر کی جان بچ گئی۔

مگر گل کا گھریلو ماحول کافی سرد ہو گیا۔ مریم اور سکینہ اس سے بات نہیں کرتی تھیں۔ کھانے کے وقت بھی تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے، گل اس وقت کافی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے آخر اس کا کردہ بولی ہی پڑا۔ ”آپ دونوں مجھ سے ایسا سلوک کیوں کر رہی ہیں؟“

مریم کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہو کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی جبکہ سکینہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”یہ سوال تو تم تب کر دو جب تمہیں اپنی غلطی کا پتہ نہ ہو۔“

”کیا کیا ہے میں نے؟“ گل نے آواز نیچی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کیا۔

”جس لڑکے نے تمہاری بہن کی عزت اپنی جان پر کھیل کر بچائی تم نے اس کو بھی خون دینے سے انکار کر دیا۔“ سکینہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

”تم تو میرے بیٹے لگتے ہی نہیں۔“

”نہیں ایسا مت کہو ماں میں تمہارا بیٹا ہوں۔“ گل باقاعدہ سکینہ کے قدموں میں جا گر اٹھا۔

”تو پھر تم نے میرے کہنے پر اسے خون کیوں نہیں دیا؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ گل نے سکینہ کے قدموں سے اٹھتے ہوئے افسردہ انداز میں کہا۔

”تو پھر میری بھی ضد ہے جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں مجھ پر پانی کا ایک قطرہ اور اناج کا ایک دانہ تک حرام ہے۔“ سکینہ نے کہا اور گل کے روکنے کے باوجود وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

مریم کا آخری پیچہ تھا گل مگر بیضا قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور مریم اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازے کا کی کنڈی اور لمبے لمبے سانس لیتی دروازے سے ٹیک لگائی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گل اس کی حالت دیکھ کر اٹھا قرآن مجید کو ایک طرف مخصوص جگہ پر رکھا اور جلدی سے مریم کے پاس پہنچا۔ وہ کافی خوف زدہ تھی۔

اجانک زور زور سے دروازہ پٹا گیا۔ مریم نے خود کو دروازے پر ایسے جھالایا جیسے اس کے ایسا کرنے سے دروازہ ٹکھٹکانے والے رک جائیں گے۔ مگر اب دروازے کو دھکے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ گل یہ سب حیرانگی سے دیکھ جا رہا تھا۔ اجانک ایک زوردار دھماکے سے مریم گل کے قدموں میں جا گری۔ دروازے کا ایک کواڑا کھڑکڑ زمین پر گر پڑا تھا۔ گل کی نظر سانسے کھڑے بد معاش پر جڑی جو اسلحہ ہاتھ میں لئے گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا اس کے پیچھے پانچ مشنرے اور تھے۔ انہی میں سے ایک چھوٹے قد والا بولا۔ ”عزت بھائی اتم نے تو کہا تھا کہ تمہارے پاپا نے اس لڑکے کا کانا نکال دیا ہے مگر یہ تو زندہ ہے۔“

”میں بھی حیران ہوں میرے پاپا جھوٹ کیوں بولیں گے پھر بھی اگر یہ اس وقت خفیہ تھا تو اب نہیں بچے گا۔“ لمبے قد والے نے پستول کا رخ گل کی طرف کیا۔

گل نے مریم کو اٹھایا اور بولا۔ ”اماں کو لے کر اندر جاؤ۔“

”مگر بھیا؟“ مریم نے اتکا کہا مگر گل نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں جانے کیا کہا تھا کہ مریم چپ چاپ اندر والے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں ماں بی بی بہت ڈری ہوئی تھیں۔ لمبے قد والے نے ٹھیکرو بایا گل نے چپ لیا اور اس کے اوپر سے اڑا ہوا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ عزت بیک نے مرزا جانا جا مگر گل نے اسے کار سے پکڑتے ہوئے کسی کھلونے کی طرح اٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ باقی پانچ لڑکوں کے پاس رائفلیں تھیں انہوں نے جب سچویشن دیکھی تو رائفلیں سیدھی کر کے فائرنگ شروع کر دی۔ تڑتڑ کی آواز سے پورا گھر گونگ اٹھا۔

گولیاں گل کے جسم کو چھید کرتی دوسری طرف نکل رہی تھیں۔ کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی مریم اور سکینہ کا کلیجہ منہ تو آ رہا تھا۔ مگر اگلا منظر کافی حیران کن تھا۔ گل نے ایک لمبا سانس کھینچ کر منہ کھولا تو اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکلنے شروع ہو گئے اس آگ نے ان پانچوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ پانچوں آگ میں جلتے ہوئے چیخے جارہے تھے۔ چیخے چیخے وہ ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکلے۔ گل بھی ان کے پیچھے تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو چھ عجیب شکلوں کے جانور نیچے اترے اور ان بد معاشوں کو اٹھا کر اوپر جا کر غائب ہو گئے۔

گل ہاتھوں کو جھاڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو سکینہ اور مریم اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ”کون ہو تم؟“ سکینہ نے غصے اور ڈر کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

”میں گل ہوں آپ کا بیٹا۔“ گل نے نظریں

چراتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم میرے بیٹے ہو ہی نہیں سکتے۔ جس طرح تم نے ان لوگوں کو جلایا ہے مجھے شک ہے کہ تم انسان نہیں ہو۔“ گل کے کندھے ڈھیلے پڑ چکے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ سچائی بتانے کا وقت آ گیا ہے۔ ”بتاؤ جلدی کون ہو تم؟“ سکینہ نے چلا کر کہا۔

”میں ایک جن ہوں۔“ گل کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔ ”میرا نام میناش ہے۔“ اور پھر گل نے کوئی بات چھپائے بغیر سب کچھ بتا دیا۔

”کیا کہا تم نے؟“ میرے شوہر کو تم اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب تو مجھے شک ہو رہا ہے کہ میرے بیٹے گل کو بھی تم نے ہی قتل کیا ہے، نام کسی دوسرے کا لگا رہے ہو۔“ سکینہ نے اس کی تمام بات سننے کے بعد کہا۔

”نہیں ماں میں نے آپ کو ماں کہا ہے ایک غلطی مجھ سے انجانے میں ہوئی جب میں نے گل کے ابا کو اغوا کیا، میں تو ای بریچہ تیار ہوں۔ گل کا قتل میں نے نہیں کیا۔“ میناش کا لہجہ گھبراہٹ سے بھرا تھا۔ ”جو بھی ہے تم نے میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔ ایک مہربانی کرو اس گھر کو چھوڑ دو۔ دفع ہو جاؤ ہماری نظروں کے سامنے سے۔“

”میناش نے اس وقت وہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ صحن میں کھڑے اتار کے درخت پر آ بیٹھا۔ آدھی رات کو اسے لگا جیسے کچھ غلط ہو رہا ہے۔ اس نے اوپر نگاہ اٹھائی تو کالی دھندلی پورے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ وہ اس دھند کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے وہاں سے اٹھنے میں دیر نہ کی، وہ اڑتا ہوا چھت پر پہنچا۔ اس دھند میں سے ڈراؤنی شکلوں کے جن چھت پر کود رہے تھے۔

اجانک اس دھند میں لاماش کا چہرہ نمودار ہوا۔ ”تو تم پر بھی ان لوگوں نے اپنا جادو کر دیا میناش مجھے افسوس ہے کہ بتا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ تمہارا بھی وقت ختم ہو چکا ہے۔“ اتکا کہہ لاماش نے اپنا منہ کھولا تو آگ کا بڑا سا گولہ میناش کی طرف

بڑھا۔ مگر میناش اپنی جگہ سے چلا نکل لگا کر منڈیر پر جا کھڑا ہوا۔ ”مگر جاہلیں میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ میناش نے ہاتھ کو تنہائی انداز میں آگے کرتے ہوئے کہا۔ لاماش کے منہ سے نکلنے والا گولا حقیقت میں بڑا سا سورجی کرچکا تھا۔ اسی دھماکے سے سکیڑ اور مریم کی آنکھ کھلی تھی اور وہ بھی چھت پر آ چکی تھیں۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو جلدی بولو۔“ لاماش کی آواز میں بکلیوں کی کڑک تھی۔ دھند میں سے بیوں کے رونے جیسی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

”آپ میرے والد ہیں میں نہیں چاہتا کہ آپ صراطِ مستقیم سے ہٹنے لگیں۔ اب تک آپ لوگ جو کرتے رہے وہ جاہلیت تھی۔ اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھر اور خود جلائی ہوئی آگ کی پوجا کرتے رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اندھیروں سے نکل کر روشنی کی طرف آئیں تاکہ قیامت کے روز دوزخ کا ایندھن نہ بنیں۔“ میناش کے لہجے سے خلوص نکل رہا تھا۔

”یکو اس بند کرو۔“ میناش کی بات سن کر لاماش طیش میں آ گیا تھا۔ ”یہ یکو اس نہیں! آپ ایک دفعہ اس مذہب میں داخل تو ہوں اگر آپ کو اس میں کوئی شائبہ ہو یا کوئی بات جھوٹی ہو تو بے شک مجھے ختم کر دینا۔ اللہ کا نازل کیا کلام سننے کے بعد آپ کو علم ہو جائے گا کہ ایک سچا مسلمان.....“ میناش کی بات ادھوری رہ گئی۔

”یہ تم نہیں ان مسلمانوں کا جاودہ تمہارے سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کتنے ہی مسلمانوں کو پتھر کی طرح مسل ڈال۔ ہمارے نزدیک مسلمان بہت حقیر مخلوق ہیں۔“ لاماش نے طنزیہ ہنسی ہنسنے ہوئے کہا۔

”تو ٹھیک ہے آج میں آپ کو بتاؤں گا کہ مسلمان کیا ہوتا ہے؟“ میناش نے کہا اور منہ ہی منہ میں ”سورۃ الناس“ پڑھنی شروع کر دی مریم نے بھی اسے بتایا تھا اور خود اس کا بھی پختہ یقین تھا کہ یہ سورۃ پڑھنے سے

ہر قسم کی آفات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ لاماش نے اپنی فوج کو جملے کا حکم دیا۔

میناش نے تین بار سورۃ الناس پڑھ کر جواب اپنے اطراف میں پھونکا تو چھت پر جیسے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے جو بھی اس فوج میں سے آگے بڑھتا جاں کر رہا کہ بن جاتا۔ سکیڑ اور مریم یہ دیکھ کر سکتے میں آ گئیں۔ لاماش کی فوج آہستہ آہستہ جاں کر خاک ہوئی جا رہی تھی۔ منڈیر کے پاس جیسے کوئی حصار سبندہ گیا تھا۔ لاماش کا ہر حربہ اس حصار کے آگے ناکام ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی لاماش نے تمام فوج کو واپس چلنے کا حکم دیا اور پتھر کے آس پاس چھائی دھند دور ہوئی مغرب کی طرف غائب ہو گئی۔

میناش واپس مڑا تو سکیڑ نے سوال پوچھا۔ ”کون تھے یہ لوگ اور یہ سب کیا تماشہ ہے؟“ ”یہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، میں نے آپ کو سب کچھ بتایا ہے۔ یہ جو جن مجھ سے بات کر رہا تھا یہ میرا والد ہے۔ اور یہ مریم کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔“ میناش نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

”مگر یہ مریم کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟“ ”کیونکہ طلعت شاہ صاحب کے بعد ان کی تعلیمات کو آگے بڑھانے کا فریضہ مریم انجام دے رہی ہے اور جب بھی ان لوگوں کو موقع ملے گا وہ اسے مارنے سے گریز نہیں کریں گے۔ میں بھی پہلے ان جیسا تھا مگر اللہ کی ذات کے بعد آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہدایت کا رستہ دکھایا۔“ میناش ممنون نظروں سے سکیڑ اور مریم کو دیکھ رہا تھا۔

”ماں! کیا ہم اس کو معاف نہیں کر سکتے۔ ہمارے نبی کا فرمان ہے۔ بدلہ لینے سے معاف کر دینے والا بہتر ہے۔“ مریم نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ خود سکیڑ کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ میناش اب بدل چکا ہے۔

”میں جب تک یہاں رہوں گا آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ میں آپ کو ایک بیٹا اور مریم کو بھائی بن کر دکھاؤں گا۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں

تو میں سدا آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔“ میناش نے عاجزانہ انداز میں کہا تو سکیڑ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا اور اسے گلے لگا لیا۔ ”مجھے تم کو بچنے میں غلطی نہیں ہوئی تھی۔ آج سے تم میرے بیٹے ہو۔“ پھر وہ تینوں چھت سے نیچے اتر آئے۔

تین دن بعد ہی سیر کے گھروالے مریم کے گھر آ گئے۔ سیر کے والد بہت اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ مگر سیر کی ماں ان کے الٹ تھی میناش بازار سے ان کے لئے لوازمات لایا تھا جس میں سے سیر بیگم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا وہ ہر چیز کو منہ بنانا کر دیکھ رہی تھی۔ پھر سیر نے خاوند کے کان میں سرگوشی کی تو انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ سکیڑ بچن سے نکلی اور ان کے پاس آ بیٹھی۔ ”میرا نام ارشاد ہے اور میرا ایک ہی اکلوتا بیٹا ہے جس کو آپ اسپتال میں دیکھ ہی چکی ہیں۔ اس کا نام سیر ہے۔“ ارشاد نے ہمید بانڈی۔

”جی میں دیکھ چکی ہوں۔“ سکیڑ نے آہستہ سے جواب دیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بیٹی ہماری بیٹی بن جائے آپ سمجھ تو نہیں ہوں گی ناں؟“ ارشاد نے مدعا بیان کیا۔

سکیڑ کے تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس نے ہاں کر دی اچانک ہی نسیم بیگم صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں آپ کو کیا سمجھا کے لائی تھی اور آپ نے کیا کر دیا؟“ ذرا ان لوگوں کا اٹلیٹس تو دیکھئے یہ تو بیٹی کو ٹھیک ٹھاک جہیز بھی نہیں دے سکیں گے۔ ”نسیم بیگم نے سکیڑ وغیرہ کی پرواہ کئے بغیر اونچا اونچا بولنا شروع کر دیا۔

”میری بات تو سنو بیگم! رشتہ داری اٹلیٹس اور دولت کی بنیاد پر نہیں ہوتی اس لڑکی سے اچھی بہو نہیں پھر نہیں ملے گی۔“ ارشاد نے نسیم کو دھیسے لہجے میں کہا۔

”اس لڑکی کو کون سے سرخاب کے پر لگے

ہوئے ہیں؟“ نسیم بیگم اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔ ”ادھر دیکھو! ارشاد نے نسیم کی توجہ سامنے لگی طلعت شاہ کی تصویر کی طرف کرائی۔ ”مت بھولو کہ یہ اسی خدا کے بندے کی بیٹی ہے جس کی وعائے تمہیں آٹھ سال بعد لاوا ہوتی تھی۔“

نسیم ایک لمحے کو تو کم صم ہو گئی مگر پھر اپنی انا پر قائم ہو گئی۔

میناش یہ سب سن رہا تھا اچانک آگے بڑھا اور بولا۔ ”آپ کو جہیز میں جو جو چیز چاہئے آپ اس کی لسٹ بنالیں۔ جتنا دل کرے لسٹ کو لمبا کر لیں کہیں بعد میں یہ نہ کہنا کہ ہم کچھ بھول گئے تھے۔ میں آپ کی ہر شرط پوری کر دوں گا۔“

”اے ہے کوئی ڈاکہ مارو گے کیا؟“ نسیم بیگم نے ہاتھ نہانے۔

”چپ کر بیگم! ارشاد صاحب کی آواز بھی اونچی ہوئی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے ایک ماہ کے اندر میری بیٹی ہوئی لسٹ کی تمام چیزیں پوری کر لینا دفرست تمہیں کل مل جائے گی۔ میں بھی تو دیکھوں اس وڑے میں رہنے والے لوگ ہمارے اٹلیٹس کا مقابلہ کیسے کرتے ہیں؟“ نسیم بیگم نے زہریلے انداز میں کہا اور دونوں میاں بیوی وہاں سے چلے گئے۔

”یہ تم نے کیا کیا بیٹا! اگر تم یہ چیزیں اکٹھی کر بھی لو گے تو ان کو مریم برتنے سے تو رہی۔“ سکیڑ نے بہم انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم اپنی جادوئی طاقتوں سے کسی اور کی دولت اٹھاؤ گے اور ان سے جہیز خریدو گے۔ مگر ہم لوگ حلال کی کمائی پر گزارا کرتے ہیں خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔“

”تو میرا بھی آپ سے وعدہ رہا کہ میں محنت کر کے ایک ماہ میں بہن کے لئے مطلوبہ جہیز بناؤں گا جس میں ایک ایک چیز میری حلال کی کمائی گئی رقم کی



ہوگی۔" میناش کا عزم اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔ دوسرے دن ہی چیزوں کی فہرست آگئی۔ کافی بیش قیمت چیزیں تھیں۔ جن میں سوہا ہی اتنی مالیت کا تھا کہ کوئی عام انسان اپنی عمر کا آدھا حصہ محنت مزدوری کرتا رہے تو تب خرید سکے۔ چیزوں کی لسٹ دیکھ کر میناش کافی پریشان ہو گیا تھا۔

میناش کے لئے دو کروڑ اکٹھا کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے چوری ڈکیتی یا اس طرح کا کوئی اور طریقہ استعمال نہیں کرنا تھا۔ یہ رقم اس کی اپنی محنت مشقت کی ہونی چاہیے تھی۔ اسی پریشانی میں وہ ٹھٹھا ہوا بہت دور نکل آیا اور بھی اس کی نظر دیوار پر لگے ایک اشتہار پر پڑی۔ یہ اشتہار ریلنگ کے ایک انٹرنیشنل مقابلے کا دعوت نامہ تھا۔ جیتنے والے کو پچیس ہینڈ شیلڈ اور ڈھائی کروڑ نقد ملے۔ اس نے پچیس ہینڈ شپ میں نام درج کروانے میں دیر نہ کی۔

ٹھیک دو دن بعد وہ رنگ میں کھڑا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنی خفیہ طاقتوں کے ذریعے بھی یہ لڑائی جیت سکتا تھا مگر اس نے صرف اپنی جسمانی طاقت کو ہی استعمال کیا۔ تیسرے حملے میں ہی حریف چاروں شانے چت ہو گیا۔ میناش رنگ سے نکلنا چاہتا تھا کہ ریفری نے اسے کہا: "اگر تم دو پہلو انوں کے ساتھ اور لڑو تو یہ انعام بڑھ سکتا ہے۔"

میناش نے ہائی بھری۔ جن کے آگے کوئی انسان کہاں تک سکتا تھا۔ اور وہ دونوں پہلو ان بھی ڈھیر ہو گئے۔ واپسی پر میناش کے بیک میں چار کروڑ تھے۔ اس نے فہرست کے مطابق چیزوں کا آرڈر دے دیا۔

میناش چھت پر موجود تھا کہ اچانک کالی دھند کا ایک گلو اس کے سامنے اتر اور ایک خوفناک جن کی شکل اختیار کر گیا۔ "سردار نے تمہارے لئے انعام بھیجا ہے۔ اگر اس لڑکی کو لے کر تم نہ پہنچے تو تمہارے تینوں دوست جو سردار کے قبضے میں آ چکے ہیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے، ایک کو بچاتے یا تین زندگیاں گویں۔" خوفناک شکل

والے جن نے تمہارا نہ لہجے میں کہا۔

میناش کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور کان لمبے ہو کر اوپر کونچہ چکے تھے۔ ہنسنے پورے ماتھے پر پھیل گئی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا لیا تو وہ لمبا ہوتا ہوا اس جن کی گردن پر جا پڑا۔ پھر میناش نے اسے ایسے پٹختا شروع کیا جیسے دھوبی کپڑے کو پٹختا ہے۔ کچھ ہی دیر میں اس خوفناک جن کے حصے بخرے ہو چکے تھے۔ میناش اس وقت کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ وہ گول دائرے میں گھوما اور وہاں سے غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

مرزا وغیرہ جنگل میں راستہ دھونڈ رہے تھے کہ اچانک ہر طرف کالی دھند سی چھا گئی۔ ان کے حواس پر تار بکی چھاتی چلی گئی۔ سب سے پہلے گلو کو ہوش آیا۔ وہ تینوں ایک بوسیدہ سے بدبودار کمرے میں بند تھے ان کے ہاتھ پیچھے کر کے بستوں سے باندھے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ باقی دونوں کو بھی ہوش آ گیا۔ "یہ ہم..... کون..... کہاں ہیں؟" ناصر نے سامنے ستون کے ساتھ بندھے گلو کو مخاطب کیا۔

"لگتا ہے ہم پکڑے گئے ہیں۔" گلو نے اندازہ لگایا۔ "مطلب۔" ناصر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور خوفناک شکلوں والے دو جن اندر داخل ہوئے۔ وہ تینوں ان کی شکلیں دیکھ کر کاٹنے لگے۔ ان میں سے ایک جن کے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھا اس نے ڈبیا کو کوئی تو اس میں ڈھیر ساری سوئیاں تھیں اس نے ایک سوئی اٹھائی اور ناصر کی طرف بڑھا۔ "نمبر جاؤ زلتاش ان کو سوئی لگانے کی ضرورت نہیں یہ تینوں ان پڑھ ہیں یہ کوئی ایسا کلام نہیں پڑھیں گے جس سے ہمیں کوئی نقصان ہو۔" لاش نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے میناش کو کہلوا دیا ہے کہ اگر تم ان تینوں کی زندگی چاہتے ہو تو اس لڑکی کو ہمارے پاس لے آؤ اور جب وہ آئے گا..... پھر ان سب کی موت ہوگی۔" لاش کی

مکروہی ان تینوں کے کان بھاڑ رہی تھی۔

رات ہو چکی تھی روشندان سے آئی چاند کی مدھم روشنی میں انہوں نے پہرے دار جن کا جائزہ لیا۔ وہ دو دیوار کے ساتھ ٹپک لگائے آنکھیں بند کر کے اٹھ رہا تھا۔ "گلو اے گلو۔" مرزا نے گلو کو مخاطب کیا۔ "کیا ہے؟" گلو نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "اگر تم اپنا جوتا تار کمرے کے ہاتھ اپنے پاؤں سے کھولو تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

"اوہ ہو۔ یہ بات تو میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔" گلو نے جلدی سے جوتا اتار اور پھر جیسے تیسے کر کے جرابیں بھی اتار لیں۔ دونوں ستون کا فاصلہ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ مرزا گھوم گیا اس کے ہاتھ اب گلو کے سامنے تھے جوڑی سے بندھے ہوئے تھے گلو نے اپنے جسم کو زور لگا کر دونوں پاؤں سے سامنے ستون کے ساتھ جمائے اور پیر کی انگلیوں اور انگوٹھے سے ری کی گانٹھ کھولنا شروع کر دی۔ پہرے دار جن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس کھڑا تھا اور اسے قبر بانظر توں سے گھور رہا تھا۔ توڑی دیر میں ہی تینوں زنجیروں میں بندھے اٹلے لٹک رہے تھے۔ "بھجورے گرے اور آسمان میں اٹکے اب تو خدا ہی ہمیں ان جھوٹوں سے بچا سکتا ہے۔" مرزا آنے بے بسی سے کہا۔

ناصر کچھ کہنے ڈالا تھا کہ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور میناش وہاں داخل ہوا اس نے تینوں کو کھولا اور کمرے سے نکلنا چاہتا تھا کہ لاش وہاں داخل ہوا۔ "تو تم نے ہماری پیشکش قبول نہیں کی۔ کوئی بات نہیں: ہار کی بھی ہمیں آ رہی ہے ان دونوں ماں بیٹی کو میں نے اٹھوایا ہے انتظار کرو تمہاری موت آنکھی ہوگی۔" لاش نے رانت پیٹتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ یہ واہیات چھوڑ کر حقیقت کی طرف لوٹ آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان اور ہر جاندار بے جان کا مالک وہ رب العالی العلیین ہے۔ میری بات مانیں اور شرک چھوڑ دیں۔

ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو بچھڑانا پڑے۔" میناش نے باپ کو خبردار کیا۔

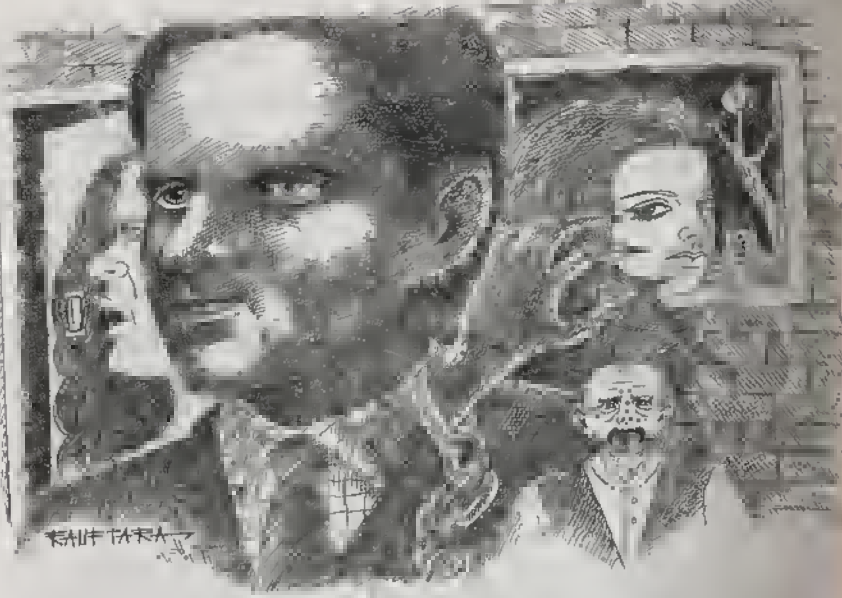
"بکواس بند کرو۔" لاش نے چیخ کر کہا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور دو جن مریم اور سیکینہ کو اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ "سب کے جسموں پر نجاست مل دو اور منہ میں سوئیاں پیوست کر دو تاکہ کوئی جادو وغیرہ نہ کر سکیں۔" لاش نے کہا اور میناش کی طرف تھوک دیا اس کے منہ سے الٹی سی نکلی اور میناش کے سارے کپڑے گندے ہو گئے۔ جبکہ مریم اور سیکینہ کو بے ہوشی میں ہی ان کے جسم پلید کر دیا گیا اور منہ میں سوئیاں لگا دیں۔

لاش نے میناش کی طرف پھونک ماری تو میناش کے گرد فولادی چھوڑا سا بن گیا۔ جس میں وہ گردن تک جکڑا ہوا تھا۔

مریم اور سیکینہ کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو وہاں دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ میناش پر نظر پڑتے ہی مریم نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان میں لگی سوئی کی وجہ سے کچھ نہ کہی۔

میناش نے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ چاروں طرف سے جکڑا ہوا تھا۔ لاش خنجر ہاتھ میں پکڑے مریم کی طرف بڑھا خنجر کی نوک اس کے پیٹ پر رکھی اور ہلکے سے پاؤں کے ساتھ پھیرنا ہوا نیچے لایا تو مریم کی چیخ کے ساتھ خون کی باریک کیر نیچے کی طرف آنے لگی۔ مریم کے منہ سے بھی خون جاری ہو گیا تھا۔ لاش نے اپنی لمبی کھردری زبان باہر نکالی اور چاہتا تھا کہ رستا ہوا خون چاٹ لے کہ اسی وقت ایک نورانی سا بولہ مریم اور لاش کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ لاش کو ایک جھلک لگا تو اس جھلکے سے دیوار میں جا لگا۔ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ دیوار میں دراڑیں پڑ گئیں پھر مریم اور سیکینہ کے پاؤں اور جو کوز خیرس آزاد کر چکی تھیں۔

وہ روشنی کا بولہ آہستہ آہستہ ایک شکل اختیار کر گیا۔ "ابو آپ!" "شاہ صاحب آپ۔" دونوں ماں بیٹی کے منہ



## کلون

ناصر محمود فرہاد فیصل آباد

خوبرو حسینہ کو نوجوان نے پانی میں اس وقت تک ڈبوئے رکھا جب تک کہ حسینہ بے جان نہ ہو گئی، نوجوان اپنے منصوبہ پر بہت خوش تھا کہ اچانک وہ حسینہ دوسرے دن اسی نوجوان کے سامنے مجسم زندہ کھڑی تھی۔

مقاہد پرست اور دھوکے باز اکثر گھائے میں رہتے ہیں۔ جس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

**جیک ڈنکن** بڑے بڑے ہوئے اپنے بستر سے اٹھا اور سلیپنگ گاؤن کی ڈوری کٹتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ تعزیت کرنے والوں کی آئے روز دستک سے اکتا چکا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی دوست یا رشتہ دار اس کے پاس اس کی تنہائی کا مداوا کرنے چلے آتے۔ حالانکہ چند ہی روز پہلے تو یہ سارے جانے بیچانے چرے اس کو یہ بتائے آئے تھے کہ اس کی بیوی کا مرنا اس کے لئے کیسا بڑا سانحہ ہے، اس کی جواں سال بیوی میرین کتنی اچھی تھی اور وہ اس کو کتنا یاد کرتے ہیں، اس کا یوں ایک دم دنیا سے چلے جانا جیک کے لئے کتنا بڑا نقصان ہے۔ وہ اس کو میرین کی باتیں سناتے اور اس سے اس حادثے کے متعلق بار بار شروع سے آخر تک پوچھتے جس میں میرین کی موت واضح ہوئی تھی۔ جیک ان سب باتوں سے اکتا چکا تھا اور

دوپہر سے شام تک لاماش کی ساری فوج اس کی بیوی سمیت اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ پھر وہ سب گھر آ گئے۔ مریم نے بتایا کہ عظمت بیک کو اس کے بیٹے کی کٹل کی خبر ملی تو وہ یہاں پر آیا تھا۔ اس نے سیکڑ اور مریم کو اٹھایا اور جیسے ہی گھر سے باہر نکلا کالی دھند نے ان کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ عظمت بیک اور اس کے کارندوں کو مار کر وہ دونوں ماں بیٹی کو ان کھنڈروں میں لے آئے تھے۔

میناش کے ریسٹنگ میں جینے روپوں کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ شاہ صاحب نے مکان میں بیٹے ایک تہ خانے کی نشاندہی کی جہاں وہ اپنی جمع پونجی رکھتے تھے انہوں نے وہ رقم ایک درس گاہ کے لئے رکھی تھی مگر بیٹی کا فرض ادا کرنے سے بڑا کام اور کیا ہوتا، انہوں نے تمام رقم میناش کے حوالے لکی۔ اور خود اپنے اصل مقام کی طرف پرواز کر گئے۔

مریم کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میناش نے اس کی ساس کو اکیلے میں اپنا اصلی روپ دکھایا اور کہا کہ اگر میری بہن کو کوئی تکلیف دی تو تمہاری خیر نہیں۔

مریم کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ مریم کافی بوڑھی اور نواسے نواسیوں والی ہو گئی ہے جبکہ گل محمد اب ایک مدرسے میں تعلیم دے رہا ہے۔ میناش نے اپنا نام گل محمد رکھ لیا تھا۔ لوگوں کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کر رہا ہے۔

وہ اپنے ہر طالب علم کو یہی درس دیتا ہے کہ ”قرون اولیٰ کا مسلمان کسی مسلک سے تعلق نہیں رکھتا تھا، نہ وہ شیعہ تھا، نہ سنی، نہ وہابی، نہ بریلوی، نہ دیوبندی، نہ اہل حدیث بلکہ وہ صرف ایک مسلمان تھا، فرقہ واریت میں پڑنے کی بجائے نبی اکرم کی سیرت کو اپنے لئے اسوۂ حسنہ بناؤ اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ مقرر آؤ۔“



سے ایک ساتھ نکلا۔ طلعت شاہ نے گلہ اور میناش وغیرہ کو آزاد کیا۔ لاماش دیوار میں لگ کر ابھی تک اٹھا نہیں تھا، وہ بے سدھ تھا اس کے چیلوں کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر ان کو روکیں۔

شاہ صاحب نے سب کو باہر نکلنے کا حکم دیا تو وہ کمر سے نکلے۔ یہ بے انتہا رقبے پر پھیلے کھنڈر تھے کھنڈروں سے نکل کر وہ سب ایک بڑے میدان میں پہنچ چکے تھے۔ اس میدان سے بہت دور گھنا جنگل تھا۔ انہیں صرف وہ میدان پار کرنا تھا پھر وہ لاماش کی پہنچ سے بہت دور ہوتے۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ کالی دھند نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شاہ صاحب نے اپنا لبادہ ہٹایا تو اندر پٹی بند کے ساتھ چھ نکواریں تھیں انہوں نے مریم سمیت سب کو ایک ایک نکواری اور خود بھی ایک پکڑ لی۔ کالی دھند جنوں کی صورت اختیار کر گئی وہ چاروں طرف سے گھیرے جا چکے تھے۔ بے شمار فوج ان کے گرد گھبراؤں چلی تھی۔ شاہ صاحب کے علاوہ سب ہی خوف زدہ تھے۔ ”جب میں کہوں تو حملہ کرو“۔ طلعت شاہ نے سب کو مخاطب کہا۔

”مگر شاہ جی یہ جن اتنی تعداد میں ہیں کیا ہم مقابلہ کر سکیں گے۔ جبکہ بلیڈ جسموں کے ساتھ ہم ان پر کلام پڑھ کر بھی نہیں پھونک سکتے آپ مریم اور اماں کو لے کر نکل جائیں میں اور میرے دوست ان کو روکتے ہیں۔“ میناش نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”حملہ کرو“ شاہ صاحب کا عزم اور ان کے لفظوں سے پھوٹی ایمان کی مضبوطی نے سب میں نئی روح پھونک دی۔ پھر واقعی نکواریں چلیں تو کافر جن کا جسمولی کی طرح کٹتے چلے گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت ہے جو ان کے ساتھ ہے۔ کیونکہ کافر جن جیج و پکار کرتے ہوئے قتل ہو رہے تھے۔ کئی جن بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے مگر واپس جانے والا ہر جن آسمان سے آنے والے انگارے کا نشانہ بن جاتا



اب وہ صرف بیمہ کمپنی کے چیک کا انتظار کر رہا تھا۔  
دروازے پر ایک انجینی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ  
اوسط قد، درمیانی عمر، برگشت چہرے اور ہتھکڑیا لے  
بالوں والا ایک عام سا شخص تھا جس نے نیلے رنگ کا  
سوٹ پہن رکھا تھا۔ سرخ ٹائی، سیاہ چمک دار جوتے  
اور اسی رنگ کا بریف کیس ہاتھ میں لئے وہ ایک مکمل  
سیلز مین نظر آتا تھا۔

”جی فرمائیے..... کیا کام ہے.....؟“  
دروازے کو تھوڑا سا کھولے ہوئے چیک نے پوچھا۔  
وہ آدمی دیر سے مسکرایا۔ ”مسٹر  
ڈنکن!..... میرا نام ٹوڈو ایورک ہے۔ میں جینی انشورنس  
کمپنی کی طرف سے آیا ہوں تاکہ آپ سے آپ کی  
بیوی کی بیمہ پالیسی کے متعلق بات کر سکوں..... کیا ہم  
اندرون میں گھر بات کر سکتے ہیں.....؟“

چیک نے دیکھا اس کے چہرے گلی میں نیلے رنگ  
کی ایک دین کھڑی ہے جس پر جلی حروف میں ”جینی“  
لکھا ہوا ہے۔ چیک نے مڑ کر گھر کے اندر دیکھا اور پھر  
بیورک کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”کیا..... میں پہلے  
کپڑے تبدیل کر لوں.....؟“  
”یقیناً.....“ بیورک خوش دلی سے بولا۔

اس سے پہلے کہ بیورک ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے کی  
کوشش کرتا۔ چیک نے فوراً دروازہ بند کر دیا کیونکہ  
ہوسکتا ہے اس کا سوال یہ ہوتا کہ کیا میں گھر کے اندر آپ  
کا انتظار کر سکتا ہوں، مگر جواب دینے سے بچتا تھا کہ  
سوال سننے سے پہلے ہی دروازہ بند کر لیا جاتا اور ”نہ“  
کہنے کا موقع ہی نہ آتا۔ چیک، اپنے بیڈروم کی طرف  
بھاگا اور کپڑوں کی الماری سے اپنا لباس سمجھتے ہوئے  
اس نے قریبی لنگا ہوں سے اپنے بستر کی طرف دیکھا جو  
آدھا چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور اس رسی چادر کے نیچے  
انہلی میٹھم پاؤں پیرے یوں اونڈھی لیٹی تھی کہ اس کا  
پورا جسم نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چمکدار بال نیچے پر  
پھیلے ہوئے تھے۔ رسی چادر کے نیچے اس کے پرکشش  
اور پر شباب جسم کا ایک ایک خط، ایک ایک انگ اور ہر

تشیب و فراز پوری طرح عیاں ہو رہا تھا۔ وہ جگہ سے  
کسمپائی۔  
”اٹھ جاؤ خوب صورت خاتون!..... باہر بیمہ  
کمپنی کا نمائندہ میرا انتظار کر رہا ہے۔“ چیک نے اسے  
پکارا۔  
”کیا.....؟“ ایملی کی آنکھیں پوری طرح  
کھل چکیں۔

”یہ سوالات کا وقت نہیں ہے ڈارلنگ!.....  
آج مجھے انشورنس کی رقم کا چیک ملے گا اور اگر ان لوگوں  
نے تمہیں یہاں میرے ساتھ دیکھ لیا تو یہ میرے اور  
تمہارے دونوں کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔ تمہیں اب  
جلدی سے یہاں سے کھسک لینا چاہیے۔“  
ایملی ایک جھپٹکے سے اٹھ بیٹھی اور پوچھنے لگی۔  
”کیا وقت ہوا ہے.....؟“

”وقت کو چھوڑو اور اپنا لباس پہنو..... باتیں بعد  
میں کر لیتا۔“ چیک نے اپنی چٹون پہنتے ہوئے کہا، پھر  
وہ اپنی پولو شرت میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔  
”کیا تمہیں جلدی رقم مل جائے گی.....؟“  
ایملی نے پھر پوچھا۔

”امید تو یہی ہے.....“ چیک نے بستر کی  
دوسری جانب ایملی کا لباس تلاش کیا اور اسے اس کی گود  
میں پھینک دیا۔ ”اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ  
تم انشورنس ایجنٹ کے اندر آنے سے پہلے یہاں سے  
نکل جاؤ۔ عقیقی طرف سے نکلو اور جا کر پیچھے کیراج میں  
چھپ جاؤ یا عقیقی دروازے سے اپنے گھر کھسک لو۔“  
”مجھے اس طرح کی جلد بازی اچھی نہیں لگتی۔“  
ایملی اپنے کپڑوں میں گھتی ہوئی بولی۔

”فکر مت کرو..... ایک دفعہ چیک کیش  
ہو جانے دو پھر میں یہ بوسیدہ گھر فروخت کر دوں گا اور  
ہم کسی اچھی اور شاندار جگہ گھر لیں گے، وہاں کوئی مسئلہ  
نہیں ہوگا..... میرا وعدہ.....“  
”لاس دیگاس.....؟“ ایملی نے مشتاق لہجے  
میں پوچھا۔

”ہاں..... کیوں نہیں.....“ چیک نے اسے  
دلاسڈیا۔  
چیک نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک  
اسے عقیقی دروازہ بند ہونے کی ہلکی آواز سنائی نہ دے گی،  
پھر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ انشورنس  
ایجنٹ ابھی تک وہاں کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ چیک  
نے دروازہ کھولا تو وہ اندر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔  
پھر اس نے اپنا بریف کیس نیل پر رکھا اور اس میں سے  
کاغذات کا ایک پلندہ نکال لیا۔ اس میں سے اس نے  
چند کاغذات نکالے اور انہیں چیک کے سامنے رکھ دیا۔  
”تمہاری بیوی کے مرنے کا سن کر بہت افسوس  
ہوا..... اگر میں کچھ زیادہ نہیں پوچھ رہا تو کیا تم تاؤ گے  
کہ کیا واقعہ ہوا تھا؟“

”اوکے.....“ چیک کی آواز نرم ہو گئی۔ آنکھیں  
ڈبڈبائیں، تاثرات رنجیدہ ہو گئے۔ دانت بچھ گئے۔  
ان سب باتوں کی اس نے پہلے سے ہی بہت اچھی مشق  
کر رکھی تھی اور ہر موقع پر اس نے اس کا اچھا اور عمدہ  
مظاہرہ بھی کیا تھا۔ پہلے پولیس کے سامنے پھر دوست،  
رشتہ دار اور اب انشورنس کمپنی والے۔ وہ کسی کو شک کا  
موقع دینے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

”..... ہم تفریح کے لئے نکلے تھے اور سینٹرل  
پارک میں کیسٹنگ کر رہے تھے۔ میرین دریا کے  
کنارے پانی میں ڈبکی لگانے چلی گئی، جب کہ میں  
کیک فب کر رہا تھا۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا اور میں نے  
اسے خبردار بھی کیا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ وہ بہترین  
جگہ اک ہے۔ تلاش اور مدد کرنے والوں کو اس کی لاش  
اس جگہ سے آدھ میل دور دریا کے کنارے پر جھاڑیوں  
میں پھنسی ہوئی ملی۔“

”افسوسناک..... بہت افسوسناک.....“  
بیورک کے تاثرات بتا رہے تھے کہ چیک کی اواکاری  
سوفیصد تھی۔  
”شاید میں آپ کے دکھ کسی حد تک کم کر سکوں  
اور آپ کو آپ کی کھوئی ہوئی خوشیوں کا کچھ حصہ واپس

دلا سکوں۔“ بیورک نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔  
”کیا میرے لئے آپ کے پاس میری بیوی کی  
انشورنس کی رقم کا چیک ہے.....؟“  
بیورک نے اس کی طرف اتنی حیرت سے دیکھا  
کہ چیک نے سوچا شاید اس سے کوئی چوک ہو گئی ہے اور  
وہ پکڑا گیا ہے، یا پھر اس کا سوال بے موقع اور جلد باز تھا۔  
”مسٹر چیک.....“ بیورک نے ایک ایک لفظ چبا  
چبا کر کہا۔ ”..... میرا خیال ہے آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی  
ہوئی ہے میرے پاس آپ کے لئے کوئی چیک نہیں  
ہے۔“

پہلے پہل تو بیورک کے الفاظ کو چیک سمجھ نہ پایا،  
مگر چند لمحوں کے بعد یہ الفاظ اس کے کانوں میں پھٹنے  
سیسے کی مانند اترنے لگے۔

”معاف کیجئے..... آپ شاید مذاق کر رہے  
ہیں مسٹر بیورک..... مگر یہ ذہن میں رکھئے خوشیاں اور  
مذاق اب میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ غلط فہمی شاید  
آپ کو ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی کمپنی سے اپنی اور  
اپنی بیوی کی زندگی کا بیمہ خریدا ہے اور بیمہ کی شرائط کے  
مطابق اگر ہم دونوں میں سے ایک بھی اس دنیا سے چلا  
جائے تو دوسرے کو بیس لاکھ ڈالر ملیں گے۔ یہ میں اچھی  
طرح جانتا ہوں کیونکہ ہم دونوں میاں بیوی نے اس  
بیمہ پالیسی پر دستخط کئے تھے۔ اور میں نے آپ کی کمپنی  
کے نام پر براہ پر بیمہ کی رقم کا چیک دستخط کر کے جمع کروایا  
ہے۔“

بیورک جو کاغذات کے پلندے کو بغور پڑھ رہا  
تھا اس کی بات سنی ان ہی کرتے ہوئے بولا۔  
”مسٹر چیک!..... شاید آپ کے علم میں نہیں  
ہے کہ آپ کی بیوی نے اس بیمہ پالیسی کی شرائط کو چند  
ہفتے پہلے بدل دیا تھا۔ یہ دیکھو، یہاں.....“ بیورک ایک  
کاغذ چیک کو تھماتے ہوئے بولا۔ ”..... آپ کی بیوی  
نے نقد ادائیگی کے بدلے ”کلون“ والی تجویز منتخب کی  
تھی۔ یہ دیکھو یہاں اس کے دستخط ہیں جو اس نے اپنے  
مرنے سے چند ہفتے پہلے کئے تھے۔“

## نماز کی قدر.....!

حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ ”نماز کے لئے تین خصوصی عزتیں ہیں پہلی یہ ہے کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سر سے آسمان تک رحمت الہی لکھنا بن کے چھا جاتی ہے اور اس کے اوپر انوار بادش کی طرح برستے ہیں۔ دوسری یہ کہ فرشتے اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں اور اس کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور تیسری یہ کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی اگر تو یہ دیکھ لے کہ تیرے سامنے کون ہے اور تو کس سے بات کر رہا ہے تو خدا کی قسم تو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔“ (ایس اتیا ز احمد۔ کراچی)

دارغ تھا نہ کوئی ثبوت، نہ کوئی گواہ..... پھر ان کو کیا اعتراض؟

”ہاں..... ہر چیز مکمل تھی سوائے ایک چیز کے.....“ جب سخت غصے میں آ رہا تھا۔ اس وقت اسکو اپنے غصے پر قابو پانے کی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی۔ اس نے ہتھوڑا اٹھایا اور غصے سے سامنے دیوار پر دے مارا جو سیدھا کھڑکی پر جا لگا، کھڑکی کا شیشہ ایک جھٹکا سے ٹوٹ گیا اور اس کی کرجیاں باہر گھاس پر بکھر گئیں۔ پہلی ایک دم دب گئی اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس نے اس سے پہلے بھی جبک کو اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ ”کیا معاملہ ہے.....؟“

”اس حراف نے مجھے بتائے بغیر میرے علم میں لائے بغیر بیہ پالیسی تبدیل کر دی۔ اب میں رقم حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک باقی بھی مجھے نہیں ملے گی۔ اس کے بجائے مجھے اس کا کلون ملے گا۔ یعنی اس کی فوٹو کاپی..... وہ جالاک لومڑی واپس آ رہی ہے..... یعنی کچھ بھی حاصل نہیں.....“

پہلی جبک کے ساتھ لیٹ گئی۔ ”ہاں میں نے پڑھا ہے کلون کے متعلق..... ہمیں اب کوئی اور راستہ تلاش کرنا ہوگا..... آگ..... یا پھر تیرا ب..... اس

کے.....“ جبک بوکھلا گیا۔

”یہ نکتہ اچھا ہے..... نہیں..... اسے یہ یاد نہیں ہوگا۔ اس طرح کی یادیں بہتر نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہم نے اس کلون..... میرا مطلب ہے میرین کے دماغ سے آخری دن کی یادیں بخور دی ہیں، وہ اس دن کو بالکل بھول چکی ہے۔“ بیورک جبک کی طرف دیکھے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجہ میں دوبارہ بولا۔ ”اس کو بالکل بھی اندازہ نہیں کہ اس دن کیا ہوا تھا۔ مگر اس کے سارے دوستوں اور خاندان کو تو علم ہے۔ ضروری ہے کہ تم ان سب کو بلاؤ، اکٹھا کرو اور انہیں بتاؤ کہ وہ واپس آ چکی ہے اور ان کو خبردار کرو کہ اس کی موت کے متعلق اس کے آس پاس یا اس کے ساتھ کوئی بات نہ کریں۔ تم خود کسی وقت اس کو یاد کرو کہ وہ دریا میں ڈوب گئی تھی مگر بچا لی گئی۔ اس طرح وہ اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لے گی۔ اس معاملے پر زیادہ تفصیل میں مت جاؤ ورنہ وہ خوف زدہ ہو جائے گی۔ اسے یہ صرف بتاؤ کہ ہم اس کو بچانے میں مشکل سے کامیاب ہوئے ہیں۔ سب دوستوں اور رشتہ داروں کا بھی یہی بیان ہونا چاہئے۔“

بیورک اٹھ کھڑا ہوا اور جبک کو اپنا ڈیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے بولا۔ ”اس پر میرا نمبر لکھا ہے میں صبح، شام ہر وقت اس نمبر پر دستیاب ہوں گا۔ کوئی مسئلہ ہو تو فوراً کال کرو میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا..... اب میں تمہیں کل صبح ملوں گا اور..... تمہاری بیوی میرے ساتھ آئے گی۔“

بیورک کے جانے کے بعد جبک عجبی دروازے کی طرف لپکا اور کیراج کی طرف گیا اسے امید تھی کہ ایملی میکم نے وہیں رکے گا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ واقعی وہاں پر رکنی ٹکی کی ایک پوری پر ٹانگیں لٹکاے بیٹھی تھی۔ جبک کو اندر آتے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ”لگتا ہے کام بن گیا..... کافی وقت لیا تم دونوں نے۔“

”کوئی کام نہیں بنا..... وہ لوگ رقم ادا نہیں کر رہے۔“

”میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ سب کچھ بے

ہیں یعنی وہی میں لاکھ ڈالر..... اگر یہ جان لیوا حادثہ تمہارے ساتھ ہوتا تو تمہاری بیوی میرین کو پورے میں لاکھ ڈالر ملتے..... اگر وہ تمہارے متعلق کوئی شرط بدلنے کی کوشش کرتی تو کمپنی کی طرف سے اسے اس کی اجازت نہ دی جاتی کیونکہ اس طرح کسی ایک فریق کو دوسرے کے خلاف افسوسناک عمل کی ترغیب ملتی۔“

”مگر وہ.....“ جبک کچھ کہتے کہتے ہلکی گیا۔ ”تم سمجھ رہے ہو..... میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اب اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ یہ ناممکن سا لگتا ہے۔“

بیورک سر ہلاتے ہوئے بولا..... ”میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں اور جنمینی کمپنی نے بھی اس چیز کی اہمیت کو سمجھا ہے اسی وجہ سے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں خصوصی تربیت دی گئی ہے۔“

جبک اپنے سامنے دیوار کو گھورتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”کیا وہ تمہارے ساتھ آئی ہے.....؟“

بیورک کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”نہیں..... اس کام کے لئے مزید ایک دن درکار ہے..... ہم کل صبح اس کو یہاں تمہارے پاس لائیں گے۔ تمہیں اس کے ساتھ اور اسے تمہارے ساتھ ایڈجسٹمنٹ میں کچھ وقت لگے گا۔“

جبک نے سکون کی ایک گہری سانس لی مگر اس کی بھنوس ابھی تک تپتی ہوئی تھیں اور مضامین بھیجی ہوئی تھیں۔ ”کیا وہ ٹھیک اسی طرح ہوگی جیسے اصل تھی.....؟“

”بالکل اسی طرح..... بلکہ وہ اصلی ہی ہوگی.....“

”..... اور کیا اسے پہلے ہی ہر چیز یاد ہوگی.....؟“

”یقیناً..... کیونکہ کوئی شخص بغیر یادداشت کے نہیں ہو سکتا ہے۔ جنمینی کمپنی اس طرح کے اجورے کام نہیں کرتی۔ میرا یقین رکھو تم کوئی فرق تلاش یا محسوس نہیں کر پاؤ گے۔“ بیورک نے اسے تسلی دی۔

”ہر چیز یاد ہوگی..... بشمول اس کی موت

جبک نے بے تابی سے اس کاغذ کو جھٹ لیا۔ دیکھنا واقعی میرین کے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے میرین نے اپنے خوب صورت، نرم ملائم ہاتھوں سے ایک زبردست طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا ہو۔ وہ کوئی جواب نہ دے پایا۔ وہ بے دست و پا ہو گیا تھا۔

”کلون!.....؟“ ”کیا خراس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔“

”آپ کلون کے متعلق نہیں جانتے.....؟“

بیورک کا انداز سنجیدہ تھا۔ ”یہ جدید سائنس کی ایک منفرد ٹیکنالوجی ہے۔ اس میں کسی بھی شخص کے جسم سے اس کے DNA کا نمونہ لے کر لیبارٹری میں اس کو اس طرح پرائیس کیا جاتا ہے کہ چند ہی ہفتوں کے اندر اس نمونے سے ایک اور جاندار وجود میں آ جاتا ہے اور وہ ہو یا اس شخص جیسا ہی ہوتا ہے جس کا DNA لیا جاتا ہے یوں جانو یہ اس شخص کی فوٹو کاپی ہوتی ہے۔ وہی شخص، وہی چال ڈھب، وہی عاداتیں اور وہی یادداشت، فرق نہیں ہوتا۔ عورت کا کلون عورت اور مرد کا کلون مرد۔ پہلے کلوننگ کا یہ عمل کافی سست ہوتا تھا مگر اب سائنس نے وقت کی رفتار پر قابو پا کر اس کو چند ہفتوں تک محدود کر دیا ہے۔ تمہیں وہ ڈوٹی بھیج دو یاد ہوگی جسے 5 جولائی 1996ء کو سائنسدانوں نے کلوننگ کے ذریعے پیدا کیا تھا۔ ہم نے اسی ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ انسانی جان کا بدل کوئی رقم نہیں ہو سکتی اور کوئی رقم، کوئی قیمت، محبت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی، اپنے پیاروں کا بدل نہیں ہو سکتی..... کیا تم اس شرط پر راضی نہیں ہو.....؟“

”یہ غیر قانونی ہے کہ میاں بیوی میں سے ایک دوسرے کی شرائط کو تبدیل کر دے اور دوسرے کو اس کی خبر بھی نہ ہو..... کمپنی نے اس کی اجازت کیسے دے دی.....؟“

جبک بوکھلا گیا۔

”بالکل ٹھیک کہا تم نے مسٹر جبک..... یہ دیکھو تمہاری بیوی نے شرائط صرف اپنے حوالے سے تبدیل کی ہیں۔ جو شرائط تمہارے متعلق ہیں وہ اسی طرح برقرار



طرح اس کا کلون بھی دوبارہ نہیں بن پائے گا۔“  
جیک اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کو نرمی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”ہم ایسا نہیں کر سکتے، کوئی شخص دودھ کیسے سرسکا ہے۔ سب کو ہم پر ہی شک ہوگا پھر ہم نہیں بچ پائیں گے۔ اس لومڑی نے ہمیں نہایت صفائی اور آسانی سے چکھ دے دیا ہے۔ شہ مات بے بی۔ کھیل ختم ہو گیا۔“

ایملی نے اس کی طرف پیار سے دیکھا، اس کی موٹی موٹی سبز آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ ”ابھی کھیل ختم نہیں ہوا میری جان۔ ہم ضرور کوئی راستہ تلاش کر لیں گے۔ ہم اتنی آسانی سے ہار نہیں مان سکتے۔ فرض کرو کلون کچھ کام نہیں کرتا تب وہ یہ کہہ لیتی کیا کرے گی؟“

”میں نہیں جانتا۔“ جیک کے لہجے میں حیرت تھی۔

ایملی مسکرائی۔ ”آؤ یہ پالیسی کو دوبارہ غور سے پڑھو، شاید کوئی نکلتی جائے۔“

جیک مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ایملی! تمہارے چالاک دماغ کی داد دینا پڑے گی۔“

ایملی اور جیک دونوں سر جوڑے تیرے کے ان کاغذات پر عرق ریزی کر رہے تھے جو بیورک ان کے لئے ٹیبل پر چھوڑ گیا تھا۔ جس طرح ایملی سنجیدگی سے کاغذوں کو کھنگال رہی تھی وہ جیک مفکر نظر آ رہی تھی۔ اس کی ذات کا یہ اندازہ جیک پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ ایملی کاغذ کی عبارت کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس پر انگلی بھی پھیر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں لفظوں پر تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ اچانک وہ بوڑائی۔ ”..... نہیں..... نہیں.....“ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں اور انگلی ایک جگہ ٹھم گئی۔

”..... یہ دیکھو!..... یہاں لکھا ہے خراب شدہ کلون کی درنگی۔“ اس نے جیک کو مخاطب کیا، مگر اس کی آنکھیں کاغذ پر پوری طرح مرکوز تھیں۔ ”..... یہاں لکھا ہے، اگر کلون میں کچھ خرابی پیدا ہو جائے تو..... تم

انشورنس کی نصف رقم کے حقدار ہو گے۔ اس کے ساتھ سینکڑوں قسم کی خرابیوں کی ایک تفصیل درج ہے۔..... زیادہ تر خرابیاں باہر نفسیات کے دائرہ کار میں آتی ہیں۔..... اور خوش قسمتی سے یہ نقص پیدا ہو سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے خودکشی کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔..... اور یہ نکتہ اس پالیسی میں نہایت آسان زبان میں صاف لکھا ہے۔“

”..... نصف۔“ جیک بوڑایا۔ ”اس لومڑی نے میرے لئے کوئی چارہ نہیں چھوڑا۔ مرنے کے بعد بھی مجھے پوری طرح شکستے میں کسا ہوا ہے۔“

”کچھ ہونا۔ کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔“ ایملی نے اسے حوصلہ دیا۔

واقعی رقم ہی چرچ نہیں مگر جیک کو تو صرف رقم ہی چاہئے تھی ایملی تو ایک قیمتی فائدہ تھا جس سے کئی بھی وقت چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن ٹھیک دس بجے صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ جیک پہلے ہی کھڑکی میں کھڑا، ان کا منتظر تھا اور ان کو آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بیورک اپنے گزشتہ دن والے لباس میں ہی ملبوس تھا اور اس کے پہلو میں جیک کی بیوی میرین تھی۔..... یا شاید اس کا دوسرا کردار۔ وہ سفید سادہ لباس میں ملبوس تھی، اس کے پاؤں میں سلپربتھے، وہ بھی بیورک اور بھی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بے تاب اور بے چین نظر آ رہی تھی۔ جیک نے ایک آہ بھری آدھیں بند کر لیں۔

میرین بالکل اصلی نظر آ رہی تھی، اس کا قد بیورک سے چند انچ زیادہ تھا اس کے لہراتے بل کھاتے بال چہرے اور گردن کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دلکش عورت تھی، مگر مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ حسین نہیں تھی، مسئلہ اس کی عادتیں تھیں، اس کا انداز فکر تھا، جو جیک کو پسند نہیں تھا، ان دونوں کے انداز زندگی میں فرق تھا۔ اس کے کئی خواب جو میرین کی وجہ سے تعبیر پائے بغیر مر گئے تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنے

ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ بٹائی۔  
جیک نے بیورک کو دیکھ کر اپنا سر ہلایا اور آگے بڑھ کر اپنی بیوی کو گلے لگالیا۔ میرین کے انداز میں سرد مہری تھی۔ جیک کو اس کے بازو اور جسم اکڑا ہوا محسوس ہوا۔ جب جیک نے اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حائل کیا تو میرین نے اپنا چہرہ موڑا اور اس کے سینے میں چھپایا۔ یہ اس کے پیار کا پرانا انداز تھا۔

”جہیں اس گھر میں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی!..... اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ وہ پوچھنے لگا۔

میرین نے گھر کے اندر قدم رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔ ”اب میں بہتر ہوں، لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک اجنبی جگہ پر تھی۔ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟..... کوئی مجھے بتا تا کیوں نہیں؟.....“

جیک نے ایک نظر بیورک کی طرف دیکھا جو میرین کے پیچھے پیچھے تھا۔

”بہتر ہے، ہم بیٹھ کر بات کریں۔“ بیورک نے پیشکش کی۔ جیک نے صوفے پر اپنی بیوی کے پہلو میں بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بیورک ان سے کچھ دور ایک کرسی پر جم گیا۔

”..... جنہیں سب سے آخری کیا بات یاد ہے؟.....“

میرین کی آنکھیں میں رنج گئیں جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”ہوں..... کل ہم پارک میں دریا کے کنارے چٹک مٹانے گئے تھے۔ میں نے کار میں ہر چیز رکھ دی تھی اور صوفے پر ہم گھر سے نکل گئے تھے، پھر میری آنکھ ایک سفید کمرے میں کھلی، میں جانتی ہوں اس دوران میرے ساتھ کچھ ہوا ضرور ہے جو کوئی بھی مجھے بتائیں رہا۔“

بیورک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی انگلی سے اپنے گٹھے کو بجاتے ہوئے بڑی خفیف آواز میں بولا۔ ”..... جنہیں ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ مگر شکر ہے..... ہم جنہیں بچانے میں کامیاب رہے۔ یہی ہے وہ چیز جو جنہیں یاد نہیں۔.....“

میرین نے اٹھتے انداز میں بیورک کی طرف دیکھا اور پھر جیک پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”کس قسم کا حادثہ؟.....؟“

”اس وقت، اس حادثے کی تفصیل اتنی اہم نہیں۔“ بیورک بولا۔ ”اہم یہ ہے کہ تم اپنے گھر میں، اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی ہو۔ اگر تم جانا چاہو تو ہم حادثے کی تفصیل جنہیں بعد میں کسی وقت مناسب وقت بتا سکتے ہیں۔“

”میں کتنا عرصہ بے ہوش رہی؟.....؟“

”دو ہفتے۔“

میرین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ”دو ہفتے..... کیا میں کو مامی تھی؟“

جیک ایک دم کھڑا ہو گیا اور بیورک کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میرین سے کہنے لگا۔ ”ہم ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں تم یہیں انتظار کرو۔“

جیک بیورک کو بچن میں لے گیا۔ ”مجھے میرین ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ جیک نے سرگوشی کی۔ ”میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ اپنے اوپر بہت کنٹرول رکھتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ہر چیز جانا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے اس سے کچھ چھپایا تو یہ ہمارے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔“

بیورک نے تسلی دینے کے انداز میں اپنا ایک ہاتھ جیک کے کندھے پر رکھا۔ ”مجھے اس قسم کی صورت حال کا بہت تجربہ ہے۔ میرا اعتبار کرو اور مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“

جیک سر ہلا کر رہ گیا۔

”بھروسہ رکھو۔“ بیورک نے دہرایا۔ ”اپنے خاندان کی ایک پارٹی کرو اور سب کو اکٹھا کر دو، سب دوستوں کو بھی بلاؤ تاکہ ان کا میرین سے دوبارہ رابطہ ہو سکے، یہ بہت ضروری ہے۔ میرین کی بہترین کی جانب جیش قدی پر پہلا مثبت نشان بنی پارٹی ہوگی۔ سمجھے۔“

جیک نے پھر سر ہلا دیا۔

جیک کے لئے بیورک کباب میں ہڈی کی مانند تھا کیونکہ وہ ہر روز بلا تاخیر اسے فون کرتا یا خود آ جاتا۔ جب بھی چاہتا جیک سے میرین کی ذہنی کیفیت کی رپورٹ طلب کر لیتا۔ جیک اس سے تنگ تھا مگر یہ اس کے مستقبل کے پروگرام کے لئے بھی بہت ضروری بھی تھا کیونکہ اس کے منصوبے کے مطابق کچھ دن بعد جب میرین خود کشی کی کوشش کرتی تو بیورک کی یہ رپورٹیں ثبوت پیش کرتیں کہ میرین کی ذہنی حالت قابلِ بھروسہ نہیں تھی اور اس کی علامتیں پہلے سے موجود تھیں۔

جیک نے اپنے گھر کے بجائے ایک ایٹھ ہوٹل میں اس پارٹی کا بندوبست کیا۔ اس دن میرین اپنے سیاہ چمک دار لباس میں نہایت دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کا حسن ہوش رہا تھا۔ شام قدرے گرم تھی۔ میرین ہوٹل کی بالکونی میں کھڑی پرسکون اور خوش محسوس کر رہی تھی۔ دور نیچے سڑک پر ٹریفک کا جھوم تھا اور سامنے بلند و بالا عمارات میں چمکنے اور جلتے والی روشنیاں ستاروں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔

جیک مہمانوں کے درمیان بولکھلا اور بھاگتا پھر رہا تھا۔ ایک ایک کو پکڑ کر اپنی بیوی کے متعلق بتا رہا تھا، ہدایات دے رہا تھا۔ ان کو سمجھا رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ابھی مستحکم نہیں ہے اور وہ افسردہ ہے۔ کسی کو اس سے کوئی دل آزاری والی بات نہیں کرنا چاہئے۔

جیک کے لحاظ سے یہ شام ہر طرح سے کامیاب تھی۔ سارے ہی لوگ شریک تھے اور اپنی طرف سے اس نے اپنی بیوی کی ممکنہ خود کشی کی ساری وجوہات لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دی تھیں۔ ہر کوئی میرین کی وابستگی سے خوش تھا۔ حتیٰ کہ میرین کے خاندان بھی، اب غذا کا شکر ادا کر رہے تھے اور امید ظاہر کر رہے تھے کہ جیک اپنی بیوی کو دوبارہ زندگی کے دھارے میں لانے کے لئے بھرپور کوشش کرے گا۔

پارٹی کے اختتام پر گھر کے لئے واپس نکلنے تک میرین نے اپنے مہمانوں کے ساتھ جس شائستہ رویہ کا مظاہرہ کیا تھا وہ اب غائب ہو چکا تھا اور وہ اکھڑی

اکھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں۔ بے اسکرین پرچی ہوئی تھیں، چہرہ بے تاثر تھا اور وہ جیک سے یوں لائق بیٹھی تھی جیسے وہ کار میں موجود ہی نہ ہو۔ جب کار فرسٹ ایونیو کے پل پر پہنچی تو وہ بولی۔ ”یہاں رک جاؤ۔۔۔۔۔۔“

مجھے کچھ تازہ ہوا چاہئے۔“

جیک نے سڑک کے کنارے ایک پارکنگ میں کار روک دی اور اس کو اس تنگی دیوار کے پاس پارک کیا جو دریا کے کنارے چٹانوں نے بچنے کے لئے بنائی تھی۔ میرین باہر نکل آئی اور اس نے سڑک کے ساتھ بنے راستے پر چلنا شروع کر دیا، جو پل کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ تھا۔ میرین نے اونچی ایڑی والی جوتی پہن رکھی تھی، اس کا سیاہ گاؤں ہوا کی وجہ سے پیچھے کی طرف لہرا رہا تھا۔ اس کے سامنے پل کے آہنی جھنگے کی جالی تھی۔ جیک اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ آدھے راستے میں ہی رک گئی اور پل کی ریلنگ پر جھک کر نیچے شور کرتے پانی کو دیکھنے لگی۔ جب جیک اس کے قریب پہنچا تو وہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور مسکرانے لگی۔ ”کتنا حسین منظر ہے۔۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔

”جیک کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سوچا اس طرح کی جگہ اس کے منصوبے کے لئے بہت کار آمد ہے۔ شہر میں یہ پل ”خود کشی پل“ کے نام سے مشہور تھا کیونکہ ہر خود کشی کرنے والا کوونے کے لئے اسی کو منتخب کرتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ خود اس جگہ چلی آئی، اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لے تو۔۔۔۔۔۔ پل پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ سڑک تقریباً سنسان تھی۔ صرف ایک دھکا۔۔۔۔۔۔ پھر 911 پر ایک ایمر جنسی کال۔۔۔۔۔۔ پھر دوبارہ ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایسیلیمک کا گداز جسم۔

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔۔ تم نے کیا کیا تھا جیک۔۔۔۔۔۔“ میرین نے پرسکون لہجے میں ایک دم لفظوں کا ہم چھڑوایا۔ اس کی آواز پر یقین تھی۔ ”۔۔۔۔۔۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارا اگلا منصوبہ کیا ہے؟“

جیک اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا اسے یوں لگا جیسے

دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہو اور کسی نے اس کے سینے کو کھینچ لیا ہو یا وہ۔۔۔۔۔۔ کیا واقعی وہ سب جانتی تھی؟۔۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ الفاظ اس نے آج کی پارٹی کے متعلق کہے ہوں۔۔۔۔۔۔ اس کی نظریں سڑک پر چلنے والی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر بڑ بڑھند مسکراہٹ تھی۔

”بے وقوف مت ہو۔۔۔۔۔۔“ وہ دوبارہ بولی۔ ”اور۔۔۔۔۔۔ نہ ہی میں بے وقوف ہوں۔ مجھے تمہاری گرل فرینڈ ایسیلیمک کے متعلق علم ہو چکا تھا اور تمہارے نام نہاد کاروباری دوروں اور میٹنگوں کا بھی، جو اس حرافہ کے نرم گرم بستر میں ہوتے تھے۔ مجھے خطرہ تھا کہ تم مجھے ضرور کوئی نقصان پہنچاؤ گے اس لئے میں نے بیہ پالیسی جیل کر دی۔۔۔۔۔۔“ وہ بولتے بولتے رک گئی اور جیک کے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے تردید یا تصدیق کی خاطر ہو۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو میرین نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

”آج پارٹی میں کوئی بھی میرے حادثے کے متعلق بات نہیں کر رہا تھا۔ صرف مجھے پتہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا، یا پھر تم۔ جس نے یہ سب کیا تھا۔ اب کیا منصوبہ ہے؟۔۔۔۔۔۔ میرے دوستوں کو اور خاندان والوں کو بتانا کہ میں اس قدر ذہنی تناؤ کا شکار ہوں کہ خود کشی بھی کر سکتی ہوں، کیا خیال ہے تمہارا میں تمہارے لئے ری کے ساتھ لنک جاؤں۔۔۔۔۔۔ گولیاں کھالوں۔۔۔۔۔۔“ وہ دوپل کے لئے رکی پھر پل کے نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”۔۔۔۔۔۔“

یا پھر اس پل سے نیچے چلا ٹنگ لگا دوں۔۔۔۔۔۔“

جیک کا نہ جرات کے بارے کھلا ہوا تھا۔ ”۔۔۔۔۔۔“

”تم نے آج پارٹی میں میری دوست کیرل سے میری ذہنی کیفیت اور تناؤ کے متعلق جو کچھ کہا۔۔۔۔۔۔“ وہ

اس نے سب مجھے بتا دیا۔۔۔۔۔۔“

جیک نے تردید کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ پہلے بھی اس کے لئے ترنوالڈ ثابت ہوئی تھی اور اب بھی ہو سکتی تھی۔ میرین نے اس کے ساتھ بیدل اس پل پر آ کر اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے تھے۔ ”تم عقل کل نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ اپنے آپ کو چالاک سمجھتے ہو مگر ہو نہیں سکتے۔۔۔۔۔۔ کیوں جیک۔۔۔۔۔۔ کیا تم سمجھتے تھے کہ مجھے علم نہیں ہوگا۔؟“

جیک اس کی خود اعتمادی اور دلیری پر حیرت زدہ تھا۔ اس نے اس دن کے متعلق سوچا جب اس نے اس کا سر اس وقت تک دیرا کے پانی میں ڈبوئے رکھا جب تک اس کا سانس نہیں رک گیا۔ وہ اس دن بھی نہیں بچ سکی تھی اور۔۔۔۔۔۔ اب بھی نہیں بچ سکے گی۔ جیک کو اس کا وہ چمٹا، اس کا ترنپنا اور پھر دھیرے دھیرے موت کے منہ میں اتر جانا یاد تھا۔ وہ آزادی تھی، کامیابی تھی جسے۔۔۔۔۔۔ جیسی کہنی نے چڑا لیا تھا۔ مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ جیک کے لبوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی میرین دوبارہ کہنے لگی۔

”تم کیا سمجھتے تھے، میں تمہارا انتظار کرتی رہوں، تمہاری کا عذاب بھگوتی رہوں اور تم۔۔۔۔۔۔ ایسیلیمک کے پر شاب جسم کو کھینچتی راتوں میں جوتی کا خرچ پیش کرتے رہو۔۔۔۔۔۔ تم کیا سمجھتے تھے، میں کسی اور کے قابل نہیں ہوں، مجھے تمہارے سوا کوئی نہیں مل سکتا تھا، جب تمہارے لئے جائز تھا وہ میرے لئے کیسے ناجائز ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ کیا تم نے سنا نہیں۔۔۔۔۔۔ جینا کرو گے ویسا بھرو گے۔“ میرین نے اپنے دائیں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جیک نے بھی غیر ارادی طور پر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پل کے اسی طرف دیکھا تو اس کو قریبی ستون کے پیچھے کچھ حرکت محسوس ہوئی اور ایک طویل القامت آدمی سامنے سے نکل کر سامنے آ گیا، اس کے کندھے چوڑے، بال سیاہ اور آنکھیں چمکدار تھیں۔

میرین نے اپنی بھنوس اچکا میں اور جیک کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔





## لبے بال

رفعت محمود - راولپنڈی

ایک سیاہ ناگ لڑکی کی گردن سے لپٹا ہوا تھا، ناگ کا پچھلا حصہ لڑکی کے سینے اور پیٹ پر تھلا ناگ نے اپنا منہ لڑکی کے بالوں میں دبے دکھا تھا، لڑکی کی آنکھیں پھٹی پڑی تھیں اور چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا۔

حدود سے تجاوز کرتے ہی اکثر اوقات انسان پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ سبق آموز کہانی

جب اس کی نظر پڑی تو وہ اس کو گئی۔ وہ شفی جواس کے چہرے پر قصاں بھی اچانک ختم ہو گئی۔  
شبیم کی خوبصورتی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس کے چھوٹے بال اکثر اس کا دل دکھاتے تھے۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کے بال بھی اس کی سہیلی تہید کی طرح لمبے ہو جائیں۔

تہید کو خوب صورت نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن وہ بدصورت بھی نہ تھی گندی رنگ اور کچھ یونی سٹائل نقش تھا۔ لیکن اس کے لمبے بال جیسے بہت ہوا ہوا دکھاتا ہوا آتشبار۔ سر

**شبیم** نہا کر اپنے کمرے میں بوسے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو کسی پھول کی مانند کھل اٹھی۔ معمول کے مطابق آج بھی وہ اپنے آپ کو حسین نظر آ رہی تھی۔ شریفی آنکھوں میں کنول کی سی پاکیزگی تھی۔ رخساروں پر پھولوں کی دلفریبی تھی۔

رات کو وہ دیر سے سوئی تھی۔ نہانے کے باوجود اس کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ اس نے میک اپ کرنا شروع کیا۔ لیپوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل لگائی۔ وہ کسی معصوم کا حسین شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن اپنے بالوں پر

مجھے خود بھی اس کا پتہ نہیں چل سکا۔“  
میرین سوچنے لگی۔ ”کیا وہاں کوئی گواہ تھا؟  
نہیں..... کوئی نہیں ہو سکتا تھا ورنہ آج انشورنس پالیسی کے نمائندے کے بجائے پولیس اس کے دروازے پر ہوتی۔“  
ہیورک نے اپنا سر ہلایا۔ ”مجھے بری خبریں پہنچانے سے نفرت ہے اچھا نہیں لگتا اور وہ بھی اتنے مختصر وقت میں ایک ہی گھر میں، مجھے اس کا بہت ہی افسوس ہے۔“  
میرین نے اندرونی طور پر سکھ کا سانس لیا۔  
”..... میں جانتی ہوں مگر یہ سب حادثہ میری موجودگی میں ہوا..... میرا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔“  
ہیورک کے چہرے پر چمک آ گئی۔ ”..... مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میرے پاس آپ کے لئے ایک اچھی خبر ہے جو آپ کے نقصان کو پورا کر دے گی۔“

میرین کے دل میں لڈو پھونٹنے لگے اور اس کو بیس لاکھ ڈالر اپنے سامنے نظر آنے لگے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ہیورک دوبارہ کہنے لگا۔  
”..... کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر جیک نے پچھلے ہفتے اپنی بیوہ پالیسی کی شرائط تبدیل کر دی تھیں؟“

میرین کے چہرے پر پریشانی اور الجھن نمودار ہوئی وہ بجائے بولنے کے صرف لگی میں سر ہلا کر رہ گئی۔  
”ہاں.....“ ہیورک نے کہا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”..... اس نے بھی تمہاری طرح کلون والی تجویز منظور کر لی تھی۔ اب تمہیں بھی نقد رقم نہیں بلکہ اپنے پیارے شوہر کا کلون ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں یہ تم دونوں کے لئے بالکل نیا آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک دوسری مون منانے کا موقع..... نئی اور جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ۔ اب موت بھی سچے پیار کو نہیں روک سکتی۔ کل ٹھیک اسی وقت جیک کا کلون آپ کے ساتھ ہوگا۔“  
مبارک ہو۔“



”تم کیا سمجھتے تھے میں بغیر کسی منصوبے کے اس اکیلے سسٹن انڈیجرے پل پر تمہارے ساتھ آ گئی ہوں۔ جیک!..... اس سے ملو..... یہ ہے براڈ۔ پولیس میں ہے اور میرا ہوائے فریڈ ہے..... براڈ!..... یہ میرا خاندان جیک ہے، یہ مجھے پہلے بھی ایک بار قتل کر چکا ہے اور میرا خیال ہے یہ دوبارہ یہی حرکت کرنا چاہ رہا ہے۔“  
اتنا کہہ کر میرین چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور براڈ جیک کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ جیک کا رد عمل ست اور تاخیری تھا، اس سے پہلے کہ وہ سنبھلا براڈ اس کو دھکیلا ہوا جھٹکے کے قریب لے گیا۔ جیک کی مٹھیاں جھنجھکیں اور نتھنے پھول گئے۔

براڈ نے ایک زوردار جھٹکا مارا اور جیک ریڈنگ کے ساتھ جا کھڑا ہوا، اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ ریڈنگ پر جھٹک گیا، پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلا براڈ نے اس کو ٹانگوں سے پکڑ کر ریڈنگ پر اٹا دیا۔ جیک نے بچاؤ کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کا جسم ایک زوردار دھماکے سے نیچے چٹانوں پر جا گرا اور جس وحشت حرکت ہو گیا۔ اس کو دوسرا سانس لینے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چیخ اس کے گلے میں گھٹ کے رہ گئی۔ پل پر میرین کے قہقہے گونجنے لگے۔

☆.....☆.....☆

میرین نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دروازے پر ٹووا ہیورک کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں کالا بریف کیس تھا اور ہونٹ مسکراہٹ سے بالکل عاری۔ وہ سوچنے لگی کہ کہیں کچھ غلط تو نہیں..... اس نے ہیورک کو اندر آنے کی دعوت دی اور چائے کے کپ کی پیشکش کی۔

”مسز جیک!..... آپ کے شوہر جیک نے نہایت غیر ضروری اور عجیب حرکت کی۔ میری پوری توجہ آپ پر تھی اس کو دو تو میں سمجھ ہی نہیں پایا۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ اگر میں تھوڑی توجہ دیتا تو شاید..... اس کو اس طرح خودکشی سے باز رکھ سکتا تھا۔“

”اس میں..... تمہارا کیا قصور..... اس وقت

سے پاؤں تک بال بڑے بھلے لگتے تھے۔ جس شادی اور پارٹی میں وہ جاتی، لڑکیاں اس کے بال دیکھتی رہ جاتیں۔ جب وہ بال کھول کر شانوں پر ڈالتی تو ایسے معلوم ہوتا جیسے ناگ شانوں پر چھول رہے ہوں۔

کانچ کی لڑکیاں ٹاہید کے بال دیکھ کر رشک کرتیں۔

تمام لڑکیاں بال بڑھانے کے فحشوں کی جستجو میں رہتی تھیں۔ لیکن کسی کے بال بھی ٹاہید جیسے نہ ہو سکے تھے۔ شبنم تیار ہونے کے بعد ٹاہید کے گھر جا پہنچی۔

”تمہیں بھی بڑی لگن رہتی ہے بال بڑھانے کی۔“ اخبار پڑھا ہے آج کا تم نے۔“ ٹاہید نے باتوں باتوں میں کہا۔

”کیوں کوئی خاص ترکیب چھپی ہے؟“ شبنم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ترکیب کیا ہے۔ ایک محترمہ نے وہی سانپ کی پٹیوں کا نسخہ آزمائے کا لکھا ہے۔“

”کون سا نسخہ؟“ شبنم بولی۔

”سانپ کی پٹیوں کا نسخہ۔“ ٹاہید مسکرا کر بولی۔ ”تم نہیں جانتی کیا؟“

”نہیں۔“ شبنم دھیرے سے بولی۔ ”ارے کیا نسخہ ہے کچھ بتاؤ گی بھی۔“

”سانپ کی پٹیاں اور سرسوں کے تیل میں کچھ دوائیں ملا کر لگانے سے بال بڑھتے ہیں۔ اتنے گھنے اور لمبے ہو جاتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔“ ٹاہید نے شبنم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ شبنم حیرانی سے بولی۔ ”مگر سانپ ملے گا کہاں سے اور اسے مارے گا کون؟“

”ہاں یہ مشکل کام ہے۔“ ٹاہید فکر مند سی سے بولی۔ ”اچھا وہ خبر تو سننا ڈرنا پوری۔“ شبنم بولی۔

”ارے خبر کیا ہے۔“ ٹاہید بولی۔ ”ایک لڑکی تھی تمہاری طرح۔ سانپ نکلا تو دوڑ کر مارنے کو لگی۔ تو سانپ نے ڈس لیا۔ اگرچہ پچھتاؤ لیکن نہ رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے مگر بے چاری کا کام تمام ہو گیا۔“

”گھر میں اور کوئی نہ تھا۔“ شبنم نے پوچھا۔

”نہیں۔ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ مگر واسے شادی میں گئے ہوئے تھے۔“

”ارے ہاں بالوں کے لئے نسخہ کیا بتایا تھا تم نے۔۔۔“

سانپ کی پٹیاں اور سرسوں کا اصلی تیل نکلاؤ۔ اس میں دو دوائیں اور بھی ملائی جاتی ہیں۔ ان کا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ جب نسخہ تیار ہو جائے تو اسے بالوں میں لگا کر شروع کرو۔“

”لیکن سانپ کی پٹیاں کہاں سے آئیں گی۔“

”ارے کسی پیرے سے کہو۔ زیادہ پیسوں کی خاطر لادے گا۔“

”ہاں بھئی۔“ شبنم نے اکڑ کر کہا۔ ان ہزار ہزار کے ٹوٹوں میں بڑی کشش ہے۔ انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ کہیں خود نہ مارنے نکل جانا گاؤں میں۔ ورنہ ماری جاؤ گی۔“ ٹاہید نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”اچھا۔“ یہ کہہ کر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ سانپ کی پٹیاں کیسے حاصل کی جائیں۔

شبنم والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ لیکن ایسی خواہش سانپ کی پٹیاں کہاں سے لاتے۔

”ابو جان سے کہوں گی کیا پتہ وہ مانیں نہ مانیں۔“

ای تو بالکل نہیں مانیں گی۔ وہ اسی سوچ میں کافی دیر تک غرق رہی۔ شبنم کے والد ایک دولت مند آدمی تھے۔ کارخانہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ شبنم نے ان سے اس بات کے لئے کہا تو وہ ہنس پڑے۔

”بہٹی۔“ وہ بولے۔ ”مجھے بھی معلوم ہے کہ اس دوائی سے بال لمبے ہوتے ہیں لیکن سانپ کی پٹیاں کہاں سے آئیں گی؟ یہ ناممکن چیز ہے۔“

”ابو۔“ جب آپ دریائے سوال پر مرغایوں کے شکار کے لئے جایں تو مار لائے گا۔ سانپ کو۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔“ وہ آکٹا ہٹ سے بولے۔ ”جب گاؤں جاؤں گا تو دیکھا جائے گا۔“

شبنم کے ابو مرغایوں کی تلاش میں دریائے سوال کی جھیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دو دوست اور بھی تھے۔ دس بارہ فٹ کے فاصلے پر انہیں ایک کالا سانپ نظر آیا تین شکریاں تھیں اور ایک اکیلا سانپ بھلا کیسے بچ سکتا تھا۔ انہوں نے سانپ پر ناز کر کے اسے مار دیا۔ شبنم کے ابو جب گھر لوٹے تو انہوں نے ایک مرا ہوا سانپ بیٹی کے آگے ڈال دیا۔

وہ ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کے دل میں خوشیوں کے پھول کھل اٹھے۔

سانپ کو لان کے حصے میں دفن کر دیا گیا۔ دس دن بعد کھودا گیا تو سانپ کی پٹیاں نکلیں پھر دوسری دوائیں ملا کر تیل تیار کیا گیا اور شبنم نے اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

دن اور راتیں گزرتی گئیں۔ چالیس دنوں میں شبنم کے بال کافی لمبے ہو چکے تھے۔ اب وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتی تھی۔ گھنٹوں اپنی زلفوں سے کھیلا کرتی۔

وقت کا سورج چل رہا ایک دوڑ بچوں کا شور سن کر شبنم دروازے پر جا پہنچی اس نے دیکھا ایک پیرا بچوں کو سانپ کا تماشا دکھانے کی تیاری کر رہا تھا پیرا نے ایک پٹاری کھولی۔

اور تین کی تیز آواز پر ایک سیاہ ناگ نمودار ہوا۔ وہ پھن پھیلائے لہرانے لگا۔ پھر ایک دم وہ پٹاری میں بیٹھ گیا۔

دس چندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ ایک جھپٹکے کے ساتھ پٹاری سے پھن نکال کر اُپر اُپر دیکھنے لگا۔ جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شبنم کے دروازے کی طرف دوڑنے لگا۔ شبنم نے دروازہ بند کر لیا۔ ناگ دروازے سے راستہ تلاش کرتا رہا کسی نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی مگر شبنم سمجھ گئی۔

ڈر اور خوف کے مارے اس کا برا حال ہوا جا رہا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے کے بستر پر جا گری۔ باہر پیرا تین بجا بجا کر سانپ کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام تماشاخیوں کے چہرے فنی ہو گئے تھے اور پیرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کا سانس پھول جانے سے گلے کی رگیں موٹی

ڈوریوں کا جال معلوم ہو رہی تھیں۔ تین بجاتے بجاتے وہ

شاید تھک چکا تھا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور ناگ بھی دھیمپاڑا تو پیرے کے دم میں دم آیا۔ اس نے ناگ کو پٹاری میں بند کر دیا پیرے کا خیال تھا کہ ان کے گھر میں کوئی سانپ معلوم ہوتا ہے اس لئے سانپ ان کے گھر میں جانا چاہتا تھا۔ پھر پیرا چلا گیا اس واقعہ کے بعد شبنم بہت خوف زدہ رہنے لگی۔ طرح طرح کے خوفناک خواب اسے پریشان کرنے لگے۔ لیکن وہ خاموش رہی اور کسی کو کچھ نہ بتایا۔

پھر ایک رات وہ ایک دم جاگ پڑی اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہی ناگ اس کی چار پائی کے گرد کھڑا

بھٹکار رہا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی کیونکہ ناگ ایک دم انسانی شکل میں نمودار ہو گیا اس کے سر پر سرخ رنگ کا خوب صورت ساتاج تھا۔

”اے لڑکی۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”تمہارے باپ نے میری ناگن کو مارا ہے اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”ہاں۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے۔“ وہ ہٹلا کر بولی۔

”تم۔۔۔ تم نے میری ناگن کی پٹیاں پس کر اپنے بالوں میں لگائی ہیں اسنے بال لمبے کرنے کے لئے، تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔“

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اور شبنم کے ماتھے پر بھٹکارے ہوئے ڈنک مار دیا۔

شبنم کا پورا جسم نیلا ہو کر ایک طرف کوڑھلک گیا۔

صبح ناشتے پر شبنم موجود نہ تھی اس کے ابو نے اس کی ای سے کہا کہ وہ جا کر شبنم جو جگا دیں۔ شبنم کی ای کمرے میں داخل ہوئی رہی تھیں کہ ان کی نظر شبنم پر جا پڑی اور ایک دم وہ چیخ کر گر پڑیں۔

ایک سیاہ ناگ شبنم کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔ ناگ کا پچھلا حصہ اس کے سینے اور پیٹ پر تھا۔ اور اس نے اپنا منہ شبنم کے ریشمی بالوں میں دے رکھا تھا۔ شبنم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ سیاہ ہو چکا تھا۔ ناگ نے اپنی مری ہوئی ناگن کا انتقام لے لیا تھا۔





وہ واقعی پر اسرار تو توں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جاوٹی کرشمہ سازیاں آپ کو دمک کر دیں گی

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ سن کر خوشبو بولی۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں بھلا آپ کی طاقت کے آگے کسی کی مجال ہے جو آپ کی نگرانی کرے لگتا ہے کہ آج آپ زیادہ پریشان ہیں اس سے پہلے تو آپ نے بھی ایسی بات نہ کی، آپ پریشان نہ ہوں، خوشبو کی بات سن کر روشاک بولا ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہوا اور پھر اس نے خوشبو کا ہاتھ پکڑا تو خوشبو بے سدھ ہوئی اور پھر اچانک روشاک کی گردجار اور غصیلی آواز گونجی۔ اگر کوئی ناویدہ قوت کمرے میں موجود ہے تو میرے سامنے آئے ورنہ اگر میں نے اپنے طریقے سے معلوم کر لیا تو تمہاری خیر نہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ ایک جن کی طاقت کیا ہوتی ہے، اب بھی وقت ہے تم جو بھی فوراً ظاہر ہو جاؤ نہیں تو..... اور پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ دیوار کی طرف کر دیا تو اس کی پانچوں انگلیوں سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکلنے لگیں وہ چاروں طرف کمرے میں گھوم کر یہ عمل کرتا رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وہ قہر آلود نظروں سے دیوار کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر مزید بیٹھا پھر خوشبو کے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ پھر دوسرے دن رات کے وقت وہ خوشبو کے کمرے میں آیا اور خوشبو سے والہانہ طریقے سے باتیں کرتا رہا کہ اچانک اس کی آنکھوں سے سرخ شعاعوں کی دو دیکھیں نکلیں اور خوشبو کے دماغ میں کھتی چلی گئیں اس کے بعد ان سرخ شعاعوں کا وجود ختم ہو گیا۔ تو وہ سکراتے ہوئے مجسم خوشبو کے پورے وجود پر اوندھے منہ جیسے ڈھے گیا۔ خوشبو کا دل دماغ اپنے حواس میں نہ تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنی سن مانی کرنے کے لئے خوشبو کے ذہن کو مازف کر دیتا تھا، اس وقت خوشبو بے سدھ ہو کر بستر پر پڑ جاتی، آج بھی اس نے جب ایسا ہی کیا وہ اپنی حدود سے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک گردجار آواز گونجی۔

(اب آگے پڑھیں)

”خبردار!! حدود سے آگے بڑھنا اب ختم ہوا۔ اب تو اپنی سن مانی نہیں کر سکتا۔“ اور اس کے ساتھ ہی کسی ناویدہ ہاتھ نے روشاک کو پشت سے پکڑ کر اوپر کو اٹھا لیا۔ اس کے بعد خود بخود دروازہ کھلا اور روشاک ہوا میں معلق دروازے سے باہر کو نکلتا چلا گیا۔ دروازے سے نکلنے ہی دروازہ پھر خود بخود بند ہو گیا۔

روشاک پر جیسے سکتے طاری ہو چکا تھا۔ وہ بالکل پتھر کا بت بن چکا تھا۔ وہ ہوا میں معلق ایک طرف کو بڑی تیزی سے اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس ناویدہ ہاتھ نے اسے بڑی مضبوطی سے اپنے پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ روشاک کی ذہنی صلاحیت بھی مفقود ہو چکی تھی۔

کافی دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اچانک اس ناویدہ ہاتھ نے اسے ایک جھٹکے سے اوپر کو اٹھایا اور کھڑا کر دیا۔ کھڑا ہوتے ہی روشاک کو جیسے ہوش آ گیا۔ اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کے جسم کا جوڑ جوڑ شدید درد میں مبتلا



اسے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ”خبردار! اب اگر تو نے خوشبو کے ساتھ کوئی بھی گری ہوئی حرکت کی تو۔۔۔“ اور آواز اذھوری رہ گئی۔

”تو کون ہے؟ میرے سامنے آئیں بھی دیکھوں کہ تجھ میں کتنی طاقت ہے، ارے چھپ کر وار کرتا ہے یہ مردانگی نہیں، بزدلی ہے۔ چل آ میرے سامنے۔“ روشاک طیش میں بولا۔

”اگر تجھ میں طاقت ہے تو مجھ پر غلبہ حاصل کر لے، کسی کمزور انسان پر اپنا تسلط جمانا کہاں کی مردانگی ہے، اگر تجھ میں مردانگی ہے تو کسی طاقتور سے ٹکرا، پھر تجھے پتہ چلے گا کہ طاقت و مردانگی کیا ہوتی ہے۔ میں جا رہا ہوں، میری بات یاد رکھنا، خوشبو کے ساتھ اب اگر کوئی گری ہوئی حرکت کی تو تیری خیر نہیں۔“ اور آواز بند ہو گئی۔

کانی دیر تک وہ اس دیرانے میں بے سدھ کھڑا رہا، اس کی ساری جتنی طاقتیں جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس ناپیدہ قوت کے متعلق جان سکے مگر یہ جاننا اس کے بس سے باہر تھا، وہ سوچتے سوچتے تھک گیا تو غڑھاں ہو کر اس جگہ دھب سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

روشاک کانی دیر تک مراقبہ کی صورت میں اس جگہ بیٹھا رہا پھر اچانک جیسے وہ ہوش میں آ گیا اس نے اپنا سر اوپر کھٹایا اور بہت لمبا سانس کھینچا۔ پھر وہ غڑھاں طریقے سے اٹھا اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا، جب اس کی توانائی کچھ بحال ہوئی تو اپنے قبیلے کی جانب بڑھنے لگا، اور پھر چند گھنٹوں میں ہی اپنے قبیلہ میں پہنچ گیا۔

قبیلہ میں رات کے وقت کئی جہات اپنی ڈیوٹی انجام دیتے تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر روشاک پر پڑ گئی تو وہ بھاگ کر اس کے قریب آیا اور پوچھا۔ ”روشاک خیریت تو ہے نا؟ اس پہر کہاں سے آ رہے ہو، آج سے پہلے تو تم اس وقت کبھی نظر نہیں آتے؟“

”آج نہ جانے کیوں میری طبیعت کچھ زیادہ ہی گھبرا رہی تھی، یہی نہیں بلکہ میرے پورے وجود میں بے چینی سی ہونے لگی تھی، اس لئے قبیلہ سے فوراً باہر چلا گیا تھا۔ ایک جگہ سے میں گزرنے لگا تھا کہ اچانک ایک روحانی حصار میرے سامنے آ گیا اور اس حصار سے میری ٹھہر بیٹھ ہو گئی۔ وہ حصار کچھ زیادہ ہی طاقتور تھا۔ بس میں بھی کچھ ضد میں آ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ میں اس حصار کو توڑ دوں اور پھر اس کنکشن میں لگ گیا۔ وہ حصار تو ٹوٹا نا مگر پھر ایک طرف کو وہ چلا گیا۔ اور اس چکر میں میں کچھ غڑھاں سا ہو گیا۔“ روشاک نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”روشاک اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک طاقتور پڑا ہے، اپنے کام سے کام رکھا کرو، خواہ وہ کسی سے الجھنا تھک نہیں۔ تم جس طرح ضد میں آئے، اگر وہ حصار وانی ہستی بھی ضد میں آ جاتی تو بولتو تمہارا کیا بنتا، جبکہ تمہارا اعتراف ہے کہ تمہاری کوشش کے باوجود بھی وہ حصار اس سے ٹک نہیں ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حصار کو قائم کرنے والا یعنی اس حصار میں یقیناً کوئی بہت زیادہ طاقتور ہستی ہوگی۔“

اب تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ ایک جن زادہ کی کوشش سے وہ حصار نہیں ٹوٹا تو اس کا مطلب کیا لیا جاسکتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس حصار میں مقید ہستی کو ضد نہیں آیا ورنہ تمہارا کام ضرور ہو جاتا اور تمہاری ضد دھری کی دھری رہ جاتی۔ تم خنجر کرا گئے، ابھی آئندہ خیال رکھنا، خیر! اب جاؤ اور جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو، رات بہت بیت چکی ہے تھوڑی دیر میں فجر ہونے والی ہے۔“ یہ سن کر روشاک بولا۔ ”وہ حصار ایک طرف کو بڑھ گیا اور میں خاموشی سے آ گیا مگر اب میں یہ کوشش ضرور کروں گا اور معلوم کروں گا کہ وہ کون تھا؟ کسی نہ کسی دن معلوم کر کے ہی رہوں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ ”روشاک تم غلطی کرو گے اس ہستی کے راستے میں آنے کی، میں نے تو اندازہ کر لیا ہے کہ وہ ہستی تم سے بہت زیادہ طاقتور ہے اور اگر تم نے ضد نہ چھوڑی تو تمہارا

ناقابل یقین نقصان بھی ہو سکتا ہے اور پھر تم سردار یعنی اپنے والد کو بھی جانتے ہی ہو کہ وہ اصول کے کتنے پکے ہیں۔ ضد کو اپنے دل و دماغ سے نکال دو، اور جا کر آرام کرو، میرا مشورہ یاد رکھنا۔“ یہ بول کر پہریدار جن خاموش ہو گیا اور دشاگ اپنے کمرے میں آ گیا۔

ادھر خوشبو اپنے کمرے میں رات بھر بے چین رہی۔ دشاگ کے اس طرح کمرے سے غائب ہونے پر اس کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے یہ پریشانی تھی کہ کبھی ایسا تو نہ ہوا تھا کہ روشاک اس طرح اچانک غائب ہوا تھا۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ اب وہ ہمارے ساتھ کوئی بدسلوکی کرے، کہیں غصے میں آ کر کوئی ایسی ہی حرکت نہ کر بیٹھے۔

مگر یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ ایسا ہونے میں بھی یقیناً حکیم کامل کا ہی ہاتھ ہوگا کیونکہ حکیم کامل نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اب روشاک کسی صورت بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن پھر بھی اس کے دماغ میں ایک پھل پھل رہتی تھی۔

خوشبو اپنے کمرے میں کبھی اٹھ کر ٹھہرتی اور پھر بستر پر بیٹھ جاتی، پھر لیٹ جاتی اور پھر اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتی وہ یہ بھی سوچتے لگی تھی کہ کہیں اس کا اور حکیم کامل کا ٹھہر نہ ہو جائے، اور حکیم کامل کا کوئی نقصان نہ ہو جائے۔

پھر اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ ”وہ حکیم کامل پر غلبہ نہیں پاسکتا، حکیم کامل زیادہ طاقتور ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو کئی مرتبہ اس نے کمرے میں کسی ناپیدہ قوت کا ذکر کرتا رہا ہے اور پھر اس نے اپنی پوری طاقت اور صلاحیت بھی آزمایا ہے مگر اس ناپیدہ قوت کا نہ ہی پتہ لگا سکا اور نہ ہی اس پر قابو پاسکا اور وہ ناپیدہ قوت یقیناً حکیم کامل کی ہوتی ہے۔“

روشاک کسی صورت بھی حکیم کامل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا، اگر ایسا ہوتا تو اب تک وہ حکیم کامل کو نقصان پہنچا چکا ہوتا۔

پھر اس نے کھڑے کھڑے اپنے دونوں ہاتھ دھو کے لئے اٹھا دیئے۔ ”اللہ تعالیٰ میری غلطیوں، کوتاہیوں اور نافرمانیوں کو معاف فرما، ہم تمام گھر والوں پر اپنا رحم و فضل فرما اور حکیم کامل پر بھی نظر کرم کر، اور انہیں تمام پریشانیوں سے بچائے رکھنا، اور حکیم کامل کو مزید طاقت بخش کہ وہ اس جن زادے پر قابو پاسکیں۔ اللہ جلد از جلد اس موزی سے ہماری جان چھڑا اس کو نیست و نابود کر دے، اس نے ہماری زندگی ایک طویل عرصے سے اذیت ناک بنادی ہے۔ ہماری تمام خوشیاں خاک میں ملا دی ہیں، اللہ تو دلوں کا عہدید بھی جانتا ہے تو ہماری نیوٹوں کو بھی جانتا ہے، ہماری کوششوں سے بھی واقف ہے، اللہ تو ہی دین و دنیا کا خالق و مالک ہے، تو ہی نے دنیا کے تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے تو نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اللہ تیری پیدا کردہ اس مخلوق نے ہماری زندگیوں میں زہر گول دیا ہے، بل بل بل ہمیں سہا کر رکھ دیا ہے، اللہ ہمیں اس سے فوری نجات دے۔ فوری نجات دے۔“ اور خوشیوں کی آواز زندہ ہو گئی، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اس حالت میں وہ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی اور پھر سکیوں سے رونے لگی۔

فرش پر بیٹھی ہوئی خوشبو سسکتی رہی کہ اسٹے میں اذان فجر کی آواز اسے سنائی دی۔ اذان فجر کو سنتے ہی اس نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ اس نے اپنے پورے جسم میں عجیب تو اتانی محسوس کی، اس کا دل جیسے مطمئن ہو گیا تھا، وہ بار بار لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی، اس حالت میں چند منٹ گزرے پھر وہ طمانیت سے اٹھی اور بستر پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی سیزنوں سے اتر کر نیچے صحن میں آ گئی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ غسل خانے سے نکلی منہ ہاتھ دھو اور وضو کرنے لگی۔ وضو سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ اپنی والدہ کی آواز سنئی۔ ”ارے خوشبو! آج اتنی جلدی۔۔۔؟“



”ہاں امی آکھ کھل مٹی اور ازاں فجر کی آواز سنائی  
دی تو نماز ادا کرنے کے لئے نیچے آگئی۔ آج میں اپنے  
اندہ بہت زیادہ طہانیت محسوس کر رہی ہوں۔ میرے دل  
و ماغ میں ایک عجیب طرح کی توانائی محسوس ہو رہی  
ہے۔“

آج واقعی سارا گھر خوشیوں سے جھوم رہا تھا، ہر کسی کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی سرشاری نظر آ رہی تھی، ایک طویل عرصہ بعد گھر والے یہ سرشاری محسوس کر رہے تھے۔

اور اگر یہ اپنی ضد پر ڈٹا رہا اور اوجھے، ہتھکنڈوں پر اتر آیا تو پھر جنگ آمد جنگ آمد۔

ضرورت محسوس ہوتی ہے تو آ جاتا ہوں اور پھر بڑے آرام سکون سے چلا بھی جاتا ہوں۔

آ کر اس کے سامنے آ جاؤں، اگر میں طیش میں آ جا تا اور اس کے سامنے ظاہر ہو جاتا تو اس کے حق میں ٹھیک نہیں ہوتا۔

اور یہ حقیقت ہے کہ مجرم کے سامنے اس کے تصور کو لایا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تمہاری ذات سے یہ تصور سرزد ہوا ہے۔

میرے یہاں آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ بہت طیش میں آ گیا ہے ویسے تو میں نے اپنے کارندوں کو اس کے قبیلے کے باہر کی ہر حرکت کو ٹوٹ کرنے پر لگا دیا ہے اور پھر میں نے آپ لوگوں کے گھر کے گرد بھی ایک مضبوط حصار قائم کر دیا ہے لیکن یہ حصار ایسا ہے کہ صرف وہی آپ کے گھر میں آ سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی اور جن یا کوئی اور دیگر ماورائی قوت یہاں نہیں مار سکتی۔

خاص طور پر تمہارے وہ کسی وقت بھی بہت زیادہ طیش میں آ سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے وہ آپ لوگوں کے سامنے آپ لوگوں کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دے سکتا ہے۔

لیکن اس کی تمام دھونس دھمکی سٹی ہوگی گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں، اس گھر کے کسی بھی فرد کا وہ بال تک با کا نہیں کر سکتا، اچھے کو دے گا بہت زیادہ۔

وہ ہر طرح سے کوشش کرے گا کہ آپ لوگوں کی زبان سے یہ نکل جائے کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا علم آپ لوگوں کو ہے اور خاص طور پر تمہارے علم میں ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چند منٹ کے لئے وہ تم پر دباؤ ڈالے یا پھر کسی کرب میں مبتلا کر دے مگر اس معاملے میں اپنی زبان نہیں کھولنا۔

میرا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اس قدر تھک جائے کہ اسے اپنی زندگی اجیرن معلوم ہونے لگے، وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے چند خیر خواہ اور دوستوں کو کہہ دے کہ تم لوگ گھر والوں کو تنگ کرنا شروع کر دو مگر وہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوگا۔

میں چاہوں تو اسے آج ہی ختم کر سکتا ہوں مگر

جنات قوم میں یہ خامیت ہے کہ ان کی کسی سے اگر دشمنی ہو جائے تو یہ اس دشمنی میں بہت دور تک جاتے ہیں اور مونیق کی تلاش میں رہتے ہیں کہ نقصان پہنچائیں۔ اگر ایک کو ختم کر دیا جائے تو اس کے گھر والے اس کے خاندان اس کے دوست احباب اور پھر اس کے قبیلہ والے دشمنی پر اتر آتے ہیں۔

ان ہی تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے میں اس کے گرد ایسا جال بنا چاہتا ہوں کہ وہ کسی بھی طرح اس گھیرے سے نکل نہ سکے اور اگر اس کے خاندان یا اس کے قبیلہ والوں کو علم ہو جائے تو وہ سب بھی اسے تصور دار ٹھہرائیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ماورائی قوت کو قید کر کے کہیں دفن کر دیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی بولٹ میں قید کر کے دریا سمندر برد کر دیا جاتا ہے مگر اس میں یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ کسی بھی وجہ سے اگر کبھی وہ بولٹ ٹوٹ جائے یا جہاں اسے دفن کیا گیا ہے کسی بھی وجہ سے اگر وہاں سے نکل جاتا ہے تو پھر وہ ایک طویل عرصہ بعد بھی اپنے ساتھ دشمنی کرنے والے یا پھر جس کے لئے اسے قید کیا گیا تھا، اس سے انتقام لیتا ہے یا پھر ایسا بھی کرتا ہے کہ اگر ان لوگوں تک نہیں پہنچ پاتا جن کی وجہ سے اسے سزا دی گئی تھی تو پھر دوسروں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیتا ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ سرکش جن کا خاتمہ کر دیا جائے یا پھر دیگر آسیب وغیرہ کا بھی خاتمہ ضروری ہوتا ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عتیق صاحب بھی کمرے میں آ گئے ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے میں چائے کے دو کپ تھے، ٹرے کو انہوں نے ردلوکا کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

”عتیق صاحب اس کی کیا ضرورت تھی، یہ بھی آپ لوگ تکلف نہ کیا کریں۔“ ردلوکا بولا۔

”حکیم صاحب یہ تکلیف نہیں، ایک کپ چائے میں کون سی پریشانی ہو جاتی ہے، یہ آپ کا بڑا بین ہے اور آپ ایک رحم دل انسان ہیں جو کہ دوسروں کے لئے

انتھک پریشانی اٹھاتے ہیں، دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہوئے لوگوں کو دکھ تکلیف اور پریشانیوں سے چھڑکا رہا دلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہت اجر دے گا۔“

”حکیم صاحب انسانیت ہے دوسروں کا احساس کرنا، دوسروں کے دکھ درد میں کام آنا، اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ دینا، جہاں تک ہو سکے ڈوبے کو سہارا دے کر کنارے لگانا، سب کچھ نہیں رہ جاتا ہے، صرف انسان کا فیصل اور کیا دھرا اعمال ہی اس کے ساتھ جاتا ہے۔“

جانے والے چلے جاتے ہیں اور جانے والوں کو لوگ دو طرح یاد کرتے ہیں انھوں کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے اور بروں کو جانے کے بعد بھی برائی ملتی ہے برے الفاظ سے یاد کرنے پر، میں ہر نماز میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حوصلہ دے دے اور آپ دوسروں کی پریشانیوں کو دور کریں۔

حکیم صاحب آپ کا یہ احسان مرنے دم تک میں یاد رکھوں گا اور اپنی اولاد کو بھی کہہ جاؤں گا کہ وہ بھی آپ کے حق میں دعا کرتے رہیں۔“ عتیق صاحب نے کہا۔

”عتیق صاحب! آپ کی ساری باتیں درست ہیں، میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ اصل انسانیت یہی ہے کہ انسان دوسروں کے کام آئے، اور اپنی ذات سے کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچائے، مگر کون ہے جو اس کے حکم پر عمل کرتا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حکم کو من و عن ماننے ہیں اور اپنی ذات سے دوسروں کو فیصل پہنچاتے ہیں۔“

میں جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ باتیں میں نے خوشبو کو بتادی ہیں۔ دراصل یہ کہنا تھا کہ وہ جن اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہو سکتا ہے کچھ زیادہ اچھل کود کرے یا پھر دھمکی جیسے الفاظ بولے، اس صورت میں آپ لوگ بالکل بھی نہ گھبرائیں، اندر دنی طور پر مطمئن رہیں، یہ خیال بالکل بھی اپنے دماغ سے نکال دیں کہ

اس کی ذات یا کسی بھی عمل سے آپ کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ نقصان پہنچانے والی اس کی تمام طاقتیں میں نے سلب کر دی ہیں، اچھا خوشبو، اب تم جاؤ اور آرام و سکون سے کھاؤ پو اور رہو۔“ ردلوکا نے کہا۔

”جی حکیم صاحب، میں آپ کی باتوں کو ذہن میں رکھوں گی۔“ یہ بول کر خوشبو اٹھی اور ”خدا حافظ“ کہتی ہوئی بیٹھک سے نکل چلی گئی۔

”حکیم صاحب چائے بخندی ہو رہی ہے آپ چائے پیئیں۔“ عتیق صاحب نے کہا تو ردلوکا کپ اٹھا کر چائے پیئے لگا۔ چائے پی کر ردلوکا بولا۔ ”عتیق صاحب اب میں اجازت چاہتا ہوں، ایک دو کام اور بھی ہیں اور اس کے لئے میرا جلدی پہنچنا بھی ضروری ہے۔“

”حکیم صاحب میں کو چوان کو بلاتا ہوں، آپ گھوڑا گاڑی پر چلے جائیں۔“ عتیق صاحب نے کہا۔

”عتیق صاحب اس کی ضرورت نہیں، میرا آنا جانا تو لگا رہتا ہے، میں جس طرح آتا ہوں، اسی طرح چلا بھی جاتا ہوں۔ خواہ خواہ کسی کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ، اب میں چلتا ہوں پھر بہت جلد آپ لوگوں سے ملاقات ہوں۔“ یہ بول کر ردلوکا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

عتیق صاحب بولے۔ ”حکیم صاحب جیسے آپ کی مرضی۔“ اور ردلوکا عتیق صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ اس جگہ سے نکلنے کے بعد ردلوکا خراماں خراماں چلتا ہوا، اس آم کے باغ میں پہنچا جہاں سے وہ آیا تھا۔ باغ میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ اس جگہ کوئی اور نہیں جو کہ اسے دیکھ رہا ہے تو وہ ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر اسے کمرے کا تصور کیا اور فوراً غائب ہو کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

اس وقت دن کے ساڑھے بارہ کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر حکیم دقار کے کمرے میں آ گیا۔ ردلوکا کو دیکھ کر حکیم دقار اپنی کرسی سے اٹھ گئے اور ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ کیا۔ ”حکیم



صاحب اور سنائیں! کیسے ہیں، میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ صبح کے وقت اپنے کمرے سے نہیں نکلے اور میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یقیناً آپ مصروف ہوں گے، اگر فارغ ہوتے تو نیچے ضرور تشریف لے آتے۔ کیا بنا خوشی والے مسئلے کا؟“ حکیم وقار نے کہا۔

”حکیم صاحب! کم بخت بہت ہی ضدی اور ہٹ دھرم جن سے واسطہ پڑ گیا ہے، ابھی وہ نو جوان ہے، شادی شدہ نہیں، اور آپ تو جانتے ہیں کہ کسی بھی نو جوان کی سوچ کیا ہوتی ہے، جوانی اور نو جوانی سب پر آتی ہے، اگر کوئی جانور بھی ہو تو وہ بھی جوانی میں زیادہ چاک و چوبند اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر زیادہ پھر بیٹلا ہوتا ہے اور جسمانی توانائی و طاقت کے ڈوم میں کہیں تک کر نہیں بیٹھتا ہے۔“

میری تو اب تک یہی کوشش ہے کہ وہ اپنے غصہ سے باز آئے اور خوشی کی ذات سے الگ ہو جائے اور اگر وہ اسی طرح ہٹ دھرمی پر اڑا رہا ہو تو سوائے نقصان کے اس کے ساتھ اور کچھ نہیں آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جانی نقصان بھی اٹھائے۔

جبکہ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ اس کے اس عمل میں اس کا ساتھ کوئی اور نہیں دے رہا ہے، اس کا تعلق مسلمان جنات کے قبیلہ سے ہے اور اس کے والد اس قبیلہ کے سردار بھی ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دل میں یہ بات ہو کہ وہ سردار کا بیٹا ہے، اس لئے اور بھی جنات اس کا ساتھ دیں گے۔

جس طرح دنیا میں عام طاقتور لوگوں کا ساتھ ہوتا ہے کہ طاقتور کا ساتھ دوسرے لوگ بڑھ چڑھ کر دیتے ہیں۔

ابھی تک میری کوشش ہے کہ میں اسے تھکا تا رہوں اور وہ اس قدر تھک جائے کہ اس میں سکت باقی نہ رہے، طاقتور کے جب مہرے پٹنے لگتے ہیں تو وہ اور زیادہ پھر جاتا ہے اور پھر طیش میں آ کر سارے غلط اقدام اٹھانے لگتا ہے جس کی وجہ سے وہ مزید پریشان ہو

تے دوچار ہوتا چلا جاتا ہے۔ بڑوں نے یہ حقیقت کہا ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔“ رولو کا مسکراتے ہوئے بولا۔

”بالکل آپ صحیح فرما رہے ہیں، بہر حال میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد کامیاب و کامران کرے اور کم بخت اس جن کو منہ کی کھانی پڑے۔“ حکیم وقار نے کہا۔

اس کے بعد حکیم وقار نے میز پر کئی کتنی بجائی تو فوراً ایک ملازم آیا تو حکیم وقار نے کہا: ”بھئی فوراً دو کپ چائے لے آ دو اور ہاں! ساتھ ہی کچھ کھٹ بھی لانا۔“ یہ سنتے ہی ملازم فوراً پلٹا اور حکیم وقار کے کمرے سے نکلنا چلا گیا۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ملازم چائے اور بسکٹ لے کر آیا گیا اور میز پر دونوں چیزوں کو رکھ کر واپس چلا گیا۔ حکیم وقار نے کہا: ”حکیم صاحب گرما گرم چائے پیئیں اور ساتھ ہی بسکٹ بھی کھا لیں، کئی دن ہو گئے تھے آپ کے ساتھ چائے پئے ہوئے، یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ چند گھنٹی آپ کے ساتھ گزار لیتا ہوں، ورنہ آپ کو دیکھتے ہوئے ہفتہ بلکہ ہفتے گزر جاتے ہیں اور آپ سے ملاقات نہیں ہوتی۔“

رولو کا حکیم وقار کی باتیں سن کر بولا: ”حکیم صاحب یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ دلی طور پر مجھے یاد کرتے ہیں، میری تو خواہش ہوتی ہے کہ میں بلا ناغہ وقت مقررہ پر مطب میں بیٹھا کروں مگر یہ بھی مجبوری ہے کہ کام کے پیش نظر آپ کی نظروں سے اوجھل رہتا ہوں، آپ کی دعاؤں اور اور دواپے کی مہربانی سے میں حتی الامکان مسئلے مسائل کو قابو کر لیتا ہوں، ارے کیا جاتا ہے، میری تھوڑی بہت محنت سے، اذیت و کرب سے دو چار مصیبت زدہ لوگ اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔“

اگر دیکھا جائے تو دنیا میں سبھی لوگ بہت کم ہیں۔ ہاں ایک شعر یاد آیا۔  
دنیا ہے سکھ سے خالی دکھ چار سو بھرا ہے

غم کے سوا یہاں پر سوچو تو کیا دھرا ہے  
”بالکل صحیح! آپ نے حقیقت بیان کر دی، پوری دنیا میں ایسا ہی ہے اور ایسا صرف اس لئے ہے کہ انسان مقرر کردہ اپنی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔“

اگر انسان فرمان الہی پر قائم رہے تو وہ کسی صورت بھی تکالیف کا آماجگاہ نہیں بن سکتا۔ حکم ربی کو ماننے والے قناعت پسند ہوتے ہیں، زیادہ اور زیادہ کے چکر میں نہیں پڑتے، اپنی نفسانی خواہشات کے غلام نہیں بن جاتے، اپنے حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی خوشی زندگی گزارتے ہیں، جو لوگ خوب سے خوب تر کی جستجو میں دن رات لگے رہتے ہیں، وہ اپنا سکون غارت کر دیتے ہیں اور بل بل کرب و اذیت محسوس کرتے رہتے ہیں، اگر انسان سنجیدگی سے اس بات پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں کیوں بھیجا ہے، اور پھر دنیا میں بھیج کر اس پر اپنا کیا حکم صادر کر دیا ہے تو اس دنیا میں جگہ و بدل اور خون خرابہ نہ ہو، کوئی کسی کا جانی دشمن نہ بنے بلکہ پوری دنیا امن و شانتی کا گہوارہ بن جائے۔“ حکیم وقار نے کہا۔

”حکیم صاحب یہی تو اصل مسئلہ ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنی ذمہ داریوں کے متعلق غور سوچتا نہیں، قناعت کو اپنا تا نہیں اور آسان پر چڑھنے کے تک و دو میں دغما تے ہوئے سر پٹ بھاگتا رہتا ہے۔ خبر جو حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے وہی نقصان میں رہتا ہے۔“

اتنے میں ایک ملازم آیا اور بولا: ”حکیم صاحب بغیر اجازت اندر آنے کے لئے معذرت خواہ ہوں، دراصل ایک صاحب آئے ہیں جو کہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، جب وہ بائیں کمرے سے تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں اندر بھیج دوں۔“

”لگتا ہے وہ بہت زیادہ پریشان ہیں، انہیں جلدی سے اندر بھیجو۔“ حکیم وقار نے کہا۔ یہ سن کر ملازم کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور پھر جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک

بارش بزرگ تھے، سینے تک آتی ہوئی سفید واڑھی اور نکھرے ہوئے بال، چہرے پر واضح طور سے گہرے و دھنڑلے آرہا تھا۔ آتے ہی گڑ گڑانے لگے۔“ حکیم صاحب میں بہت زیادہ پریشان حال ہوں بڑے مہربانی میرے بچے کو بچائیں، کل رات سے اس کی حالت بہت زیادہ خراب ہے، رات میں اچھا بھلا سویا تھا کہ آدھی رات میں اچانک اٹھ بیٹھا اور دھنڑلے و قفے سے خون کی لٹیاں کرنے لگا ہے۔“

میں نے بہت کوشش کی اسے آپ کے پاس لانے کی مگر اتنی کوشش کے باوجود بھی وہ اپنی چار پائی سے اٹھ نہیں اور پھر جب میں نے زبردستی کی تو اس نے مجھے دھکا دے دیا جس سے میں کافی دور جا کر، حالانکہ وہ میرا بہت ہی نیک اور فرمانبردار بچہ ہے، اس نے کبھی بھی مجھ سے زیادہ تیز آواز میں بات تک نہیں کی اور نہ ہی کبھی اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات بھی کی، گاؤں کے کئی کئی اور نو جوانوں نے بھی کوشش کرنی مگر وہ کسی سے بھی اٹھ کر نہیں دے رہا ہے، کئی نو جوانوں کی کھلائی مرد و کر انہیں الگ کر چکا ہے، کوئی بھی اس کے قریب جانے سے ڈر رہا ہے، میں سامنے والے گاؤں شانتی پور میں رہتا ہوں۔

حکیم صاحب میرے بچے کو بچائیں، میں تا زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا، وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، اس کے علاوہ کوئی اولاد نہیں۔“ اور یہ بول کر بزرگ سسکیاں بھرنے لگے۔

حکیم وقار جلدی سے اٹھے اور بزرگ کو پکڑ کر کرسی پر بیٹھایا اور کندے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے لگے۔  
”آپ پریشان نہ ہوں، اللہ کی مہربانی سے آپ کا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اسی طرح کی اور بھی تسلی آمیز باتیں حکیم وقار کرتے رہے۔

مگر جب انہوں نے رولو کا پر نظر ڈالی تو رولو کا اپنی آنکھیں بند کئے بالکل خاموش تھا۔ پھر چند لمحے بعد رولو نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بزرگ کی طرف دیکھا۔

”محترم! آپ کے بچے کو کوئی جسمانی بیماری نہیں بلکہ اس کے ساتھ بہت ہی مہلک ہوائی پتھر ہو گیا ہے، آپ فکر نہ کریں، آپ کا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

پھر رولوکا حکیم وقار سے مخاطب ہوا۔ ”حکیم صاحب بزرگ کی باتیں سن کر مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ بچے کو کوئی جسمانی بیماری نہیں کیونکہ اگر کوئی جسمانی بیماری ہوتی تو وہ نو جوان ان کے ساتھ یہاں تک ضرور آتا، اور پھر اس نے ان کے ساتھ بدتمیزی کی اور انہیں زور کا دھکا دیا، جسمانی بیماری والے مریض ایسی حرکت نہیں کرتے بلکہ ان مریضوں کو کسی بھی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس لے جائیں تو وہ خاموشی سے چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔“

ویسے میں نے معلوم کر لیا ہے کہ اس پر کوئی ہماری اثر ہو گیا ہے، بزرگ بہت زیادہ پریشان ہیں اور پھر یہ معاملہ بہت گہمیر بھی ہے اس میں زیادہ وقت نہیں، کرنے والے نے بہت تیز اور مہلک عمل کر دیا ہے، سفلی عمل ہے جو کہ جان لیوا ثابت ہوگا، اس کی موت کے لئے تین دن کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔“

حکیم صاحب! آپ فکر نہ کریں میں ان بزرگ کے ساتھ جا رہا ہوں، میں نے اگر دیر کر دی تو ہو سکتا ہے کہ بچے کی جان۔۔۔ اور رولوکا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“

”ٹھیک ہے آپ جائیں، میں آپ کے لئے دعا گو ہوں۔“ حکیم وقار نے رولوکا سے کہا۔

”جناب آپ چلیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کے پاس کیا کوئی سواری ہے یا پھر کسی سواری کا انتظام کروں۔“ رولوکا بولا۔

”میرے پاس اپنی گھوڑا گاڑی ہے، آپ تشریف لے چلیں۔“ بزرگ نے بدحواسی کے عالم میں کہا اور چلتے ہوئے رولوکا کے ساتھ باہر آ گئے۔ باہر ایک گھوڑا گاڑی کھڑی تھی اسے دیکھ کر بزرگ نے کہا۔ ”حکیم صاحب یہی میری گاڑی ہے۔ آپ گاڑی میں تشریف رکھیں۔“

رولوکا گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گیا تو بزرگ نے کوچان کی جگہ سنبھالی اور گھوڑے کو چابک سے اشارہ کیا تو گھوڑا آگے کو بڑھنے لگا اور پھر چند منٹ بعد ہی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

ایک گھنٹہ سے پہلے ہی گھوڑا گاڑی ایک گاؤں میں پہنچ کر ایک گھر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بزرگ نیچے اترے اور بولے۔ ”حکیم صاحب یہی میرا گھر ہے آپ نیچے تشریف لائیں۔“ یہ سن کر رولوکا گھوڑا گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ گھر کے باہر کئی لوگ کھڑے تھے اور باتوں میں مصروف تھیں۔ بزرگ کو دیکھ کر ایک صاحب آگے بڑھے اور بولے۔ ”کمال الدین! اچھا ہوا کتم آ گئے، ہم کافی دیر سے باہر کھڑے ہیں، جب تم گئے تھے تو اس وقت ہم اندر ہی تھے مگر پھر اچانک شرفو اپنی چار پائی سے اٹھا اور میری کلائی پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور بولا۔ ”اُوئے بڑھے چل یہاں سے بھاگ جا، یہاں کوئی تماشہ نہیں ہو رہا ہے کہ تم سب بیٹھے ہو۔“ چلو جلدی سے باہر جاؤ ورنہ ہر ایک کی گردن مروڑ دوں گا، جس کے لئے تم لوگ آئے ہو اور پھر اُسے رہے ہو، اب یہ زیادہ دیر کا مہمان نہیں، میں اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا، گرو اپنی جگہ بیٹھے میرا اور اس کا انتظار بڑی بے چینی سے کر رہے ہیں، میرا نام چندرا ہے اور تم لوگ چندرا کی طاقت سے واقف نہیں، چلو بھاگو یہاں سے۔“

اور ہم لوگ فوراً سر پر پاؤں رکھ کر باہر نکل آئے اور اس وقت سے یہیں کھڑے ہیں۔“

”سلامت، بھیا! سب ٹھیک ہو جائے گا، میں حکیم صاحب کو لے آیا ہوں، یہ بھی ہماری خوش قسمتی اور اللہ کی مہربانی کہ حکیم صاحب مجھے وقت پر مل گئے، ورنہ۔۔۔“ اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی، وہ رولوکا سے بولے۔ ”حکیم صاحب! آپ اندر تشریف لے چلیں۔“

کمال الدین رولوکا کو لئے ہوئے اندر کمرے میں آ گئے، ان کے پیچھے جو چار لوگ باہر کھڑے تھے وہ بھی اندر آ گئے۔

اندر کمرے میں ایک صحت مند نو جوان چار پائی

پر بے سدھ پڑا تھا۔ پورے کمرے میں چٹائی چھٹی ہوئی تھی۔ سارے لوگ چٹائی پر بیٹھ گئے تو رولوکا نے کمال الدین سے کہا۔

”کمال صاحب! آپ ایک کٹورے میں تھوڑا سا صاف پانی لائیں اور ساتھ ہی ایک مٹی کی ہاڑی میں کوئلے یا لے کی آگ بھی دھکا کر لائیں اور ہاں تھوڑی سی رانی بھی لیتے آئیے گا۔“

یہ سن کر کمال الدین اٹھے اور اندر گھر میں چلے گئے۔ ویسے اندر گھر میں جیسے پورے گاؤں کی عورتیں موجود تھیں۔

چند منٹ میں ہی کمال الدین نے ایک مٹی کی ہاڑی میں دھکا ہوا کوئلہ اور ساتھ میں ایک کٹورے میں پانی اور ایک چھوٹے پیالے میں تھوڑی سی رانی لا کر رولوکا کے سامنے رکھ دی۔ اور ایک طرف کو بیٹھ گئے۔

رولوکا نے کٹورے میں موجود پانی پر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا، تین بار پانی پر پھونکنے کے بعد تھوڑا سا پانی چلو میں لیا اور زور سے چار پائی پر لینے ہوئے شرفو کے چہرے پر چمک کر دیا، پانی کا چہرے پر پڑنا تھا کہ شرفو کے منہ سے ایک بہت ہی ڈراؤنی اور وحشت ناک غراہٹ نکلی، جسے سن کر اس جگہ بیٹھے ہوئے لوگ لرز کر رہ گئے۔

شرفو فوراً سوتے سے اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا اور قبر برساتی آنکھوں سے رولوکا کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر رولوکا بولا۔ ”اُوئے تو کون ہے؟ اپنا نام بتا! اور یہ بھی بتا کہ تو نے اس نو جوان پر دھڑکیوں دیا تو کیا چاہتا ہے، جلدی بول ورنہ پھر۔۔۔“ رولوکا نے بات یہی تک کہ مٹی کی شرفو کے منہ سے کرخت اور بھاری آواز نکلی۔

”اُوئے تو کون ہے؟ اور تیری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی اور یہ جو تو نے مجھ پر گرم پانی پھینکا ہے، اس پانی سے میرا سارا شریر مل رہا ہے، میرے شریر میں انگارے بھر گئے ہیں، اگر تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو جلدی سے اٹھ اور یہاں سے چلنا۔“ دیکھ میں زیادہ بولنے کا عادی نہیں، میرا نام چندرا ہے۔“

اس درمیان رولوکا نے اپنے چلو میں پانی لیا اور سامنے چار پائی پر بیٹھے ہوئے شرفو پر پھینک دیا۔

پانی کا جسم پر پڑنا تھا کہ شرفو کی آنکھیں جیسے انگارے بن گئیں، اس کی آنکھوں میں روشنی نظر آنے لگی جیسے کہ وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ دو دھکتے ہوئے انگارے ہوں، منہ سے باشت بھرزبان باہر کو نکل پڑی، زبان کیا تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے تازہ خون کا ٹوٹھرا ہو، زبان بار بار اندر باہر کہہ رہی تھی کہ پھر اچانک رولوکا نے ایک چلو پانی اور اس کے جسم پر پھینک دیا۔ اب کی بار پانی کا جسم پر پڑنے ہی، منہ سے باہر کوندر باہر نکلتی ہوئی زبان اندر کو ہو گئی اور شرفو کرخت آواز میں قہقہہ لگانے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ جنونی ہو گیا ہو اور پھر اس کے منہ سے گرم گرم بھاپ باہر کو نکلنے لگی۔

وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ یہ دیکھ کر اٹھنے لگے کہ رولوکا نے ان لوگوں کو اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا جسے دیکھ کر لوگ اپنی جگہ سہم کر بیٹھ گئے۔

”اُوں دیکھ! اب تو جلدی سے بھاگ جا، اگر اب بھی تو نہیں اٹھا تو تیری اور یہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی گردنیں مروڑ کر رکھ دوں گا۔“

اگر تجھ میں شفیق ہے تو اب سنبھال۔ اور اس کے ساتھ ہی شرفو کے منہ سے ایک بھیا تک شکل وجود برآمد ہوا، اس وجود کا صرف چہرہ ہی نظر آرہا تھا، چہرہ اتنا بھیا تک اور ڈراؤنا تھا کہ شاید ہی کسی نے اپنی زندگی میں اتنا بھیا تک چہرہ دیکھا ہوگا۔

رولوکا نے چلو میں پانی بھرا اور شرفو پر پھینک دیا۔ اب کی بار پانی کا جسم پر پڑنے ہی، شرفو کے منہ سے شریر کے مشابہد صاؤں کی آواز نکلی۔

”اُوئے مورکھ، تو میرا کچھ بھی نہیں لگاؤ سکتا، میرے گرد کا حکم ہے کہ میں اسے ساتھ لئے بغیر یہاں سے نہ نکلوں، میں ہر صورت اسے لے کر ہی جاؤں گا۔ اب زیادہ سے میرے پاس نہیں، بس صرف ایک رات کا سہ ہے، کل کا سورج یہیں دیکھ جائے گا۔“

”کیا تجھے یہ پتہ ہے کہ تو کل کا سورج دیکھ سکے



میری بات مان لی تو بچ جائے گا ورنہ جل کر بھس ہو جائے گا، ابھی جو تونے شہدہ دکھایا، یہ بند کروے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تیرا گرد اپنے استھان پر ٹپکتے ہیں جکڑا پڑا ہے، میرے گارندوں نے اسے دبوچ کر بے بس کر دیا ہے۔“

”مورکھ! میری بات مان لے، ورنہ تو بھی پھٹتے گا، تجھے بھی میرے گرد کی ٹپکتی کا اندازہ نہیں، بڑے بڑے بیرادڑ مہاپیر میرے گرد کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، تو میرے گرد کو نہیں جانتا، گرد مہاشکتی شالی کے مالک ہیں، میں تجھے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میں کسی صورت بھی اس مالک کا پران لے بغیر خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔“ یہ باتیں شرفو کے منہ سے نکلتیں۔

”اگر تو نہیں مانتا تو نہ مان یہ تیری مرضی۔“ اور یہ بولی کر رولوکا نے مٹی کی ہانڈی میں دیکتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر بھونک ماری اور پھر مٹی کی ہانڈی کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے ہاتھ میں رائی لے کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر رائی پر بھونک مار کر رائی کو دیکتے ہوئے لوگوں پر ڈال دیا۔ رائی کا آگ پر پڑنا تھا کہ اچانک گاڑھے رنگ کا پیلا دھواں اوپر کو اٹھنا شروع ہوا، اور پھر آہستہ آہستہ تمام دھواں چارپائی کے چاروں طرف جمع ہونا شروع ہو گیا، پھر رولوکا کے اشارے پر وہ دھواں جو کہ چارپائی سے کچھ دوری پر جمع ہوا تھا، روشن دان کے راستے باہر کو نکلتا چلا گیا، جب وہ دھواں باہر نکل گیا تو رولوکا نے چارپائی کے گرد جو دھواں جمع ہوا تھا، رولوکا کی انگلی کا اشارہ پاتے ہی چارپائی کے گرد اپنا گھبراہٹ کرنا شروع کر دیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے شرفو کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اچانک شرفو نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ کر چیخا شروع کر دیا۔ ”اوئے مورکھ، مجھے چھوڑ دے، اوئے میں نمٹ ہو رہا ہوں، مجھے چھوڑ دے، مجھے کٹی دے، میں یہاں سے چلا جاؤں گا، میں گرد کی باتوں میں آ کر پھنس گیا، ادائے ظالم مجھ پر دیا کر، مجھے

مگھ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے ساتھ ساتھ گرد کا بھی وجود ختم ہو جائے۔ اب میں کہتا ہوں کہ تو اپنی خیر منا، اور اپنے گرد کی بات نہ مان کر یہاں سے چلا جا، میں تیری جان آزاد کر دوں گا، اور اس میں تیری بھلائی ہے، میری بات پر سنجیدگی سے غور کر، ورنہ پھر تیرا ستیا ناس ہو جائے گا، تیرا وجود اس سنسار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔ تیری اور تیرے گرد کی ٹپکتی تپتی ہے تو اس کا اندازہ کر لے کہ تو اس چارپائی کی حدود سے ایک انچ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔“ رولوکا بولا۔

”مورکھ! تجھے بھی اندازہ نہیں کہ میرا گرد اپنے استھان پر بیٹھا میری سہائتا ضرور کرے گا، اور تیرا دایاں بھی، تو میرے ساتھ یہ حربہ اس لئے کر بیٹھا کہ میرے گرد کا حکم ہے کہ میں اس پرش کا شریا یک پل کے لئے بھی نہ چھوڑوں، اگر مجھے آزادی ہونی کے میں آگے پیچھے ہو جاؤں تو پھر میں تجھے دکھاتا کہ ٹپکتی کیا ہوتی ہے، میں اپنے گرد کا اطمینان نہیں ہونے دوں گا۔ ان تمام باتوں کا میرے گرد کو یہ پتہ لگ گیا ہو گا جو کہ تو میرے ساتھ کر رہا ہے۔“ اور پھر شرفو کے منہ سے ایک زبردست اور کان بھار دینے والی چیخ نکلی۔ چیخ اتنی زور دار تھی اور ساتھ ہی آندھی نما ہوا بھی اس میں شامل تھی جس سے کمرے میں موجود ساری چیزیں ہلنے لگیں اور کمرے میں رود و یوار پر ہی انہیں چھت پر موجود گرد بھی چھڑنے لگی تھی۔

اس کے اس حربے کو دیکھ کر کمرے میں موجود دیگر لوگ اور شرفو کے والد کمال الدین بھی بدحواس ہو کر ایک بیک اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے کہ اچانک رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ”آپ لوگ اپنی اپنی جگہ فوراً بیٹھ جائیں، یہ اس قسم کا صرف شہدہ بازی کر رہا ہے تاکہ میں ڈر کر یہاں سے چلا جاؤں اور ساتھ ہی آپ لوگ بھی ڈر کر بھاگ جائیں اور کمال الدین صاحب خوفزدہ ہو کر مجھے یہاں سے چلے جانے کا کہیں۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر بیٹھے رہیں۔“

رولوکا بولا۔ ”چند را ب تو اپنی خیر منا، میں تجھے چند پل و تپا ہوں کہ تو اچھی طرح سوچ لے، اگر تو نے

جانے دے، مجھے مت مار، میں تیرے آگے بقی کرتا ہوں، مجھے کئی دے، ہائے..... ہائے..... اوہ..... اوہ.....“ اس طرح کی اور بھی آوازیں شرفو کے منہ سے نکلنے لگیں، میں جا رہا ہوں، مجھے جانے کا راستہ دے، میرے راستے کی تمام رکاوٹیں ہٹا دے، میں چلا جاؤں گا، مجھ پر یا کر مجھے جانے دے۔“

”اچھا خیر، اب جلدی سے بتا دے کہ تو یہاں تک پہنچا تو کیوں پہنچا، کس دشمنی پر تیرے گردنے تجھے یہاں بھیجا، وہ کون ہے جو دشمنی پر اتر آیا، اور تیرے گرد کے پاس آیا، چل جلدی سے بتا دے۔“ رولو کا نے پوچھا۔

”اس گاؤں کا گنگا رام گرد کے پاس آیا تھا۔ کھیٹوں میں پانی لگانے پر ان کی منہ ماری ہوئی تھی، اسی کارن گنگا رام نے دشمنی کے عیوض ایسا کر لیا۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ خیر شروع میں تو نے میری بات نہ مان کر اپنا نقصان کر لیا، اب تیرا ہر حال میں خاتمہ ہے، میں نے تو تجھے بہت سمجھایا تھا مگر انہوں نے نہ مانا۔“ اور پھر رولو کا نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو تمام دھواں شرفو کی ناک اور کان کے راستے اندر جانا شروع ہو گیا۔ تمام دھواں جب اندر چلا گیا تو پھر وہ دھواں اندر سے کان اور ناک کے راستے باہر کو نکلتا شروع ہوا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام دھواں نے ایک ہیولہ کی شکل اختیار کر لی اور پھر وہ ہیولہ آہستہ آہستہ رولو کا کے پاس پڑی ہوئی ہانڈی کی طرف آئے لگا۔

اس ہانڈی میں دیکھتے ہوئے کوئلے موجود تھے۔ اور پھر وہ ہیولہ بڑے کرب و اذیت کی حالت میں ہانڈی کے اوپر آ کر ٹھہر گیا۔

رولو کا اس ہیولے کو غور سے دیکھتا رہا پھر رولو کا نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو وہ ہیولہ ہانڈی کی آگ میں اتر گیا۔ اس کا ہانڈی میں اترنا تھا کہ ہانڈی میں دیکھتے ہوئے کوئلے بھڑکنے لگے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے دیکھتے ہوئے کوئلوں میں بھونچال آ گیا ہے، مگر انکارے بنے کوئلے مجال ہے کہ ہانڈی سے باہر نکلے ہوں۔ رولو کا کے

منہ سے نکلا۔ ”خس کم جہاں پاک۔“ اس کے بعد رولو کا نے کچھ پڑھ کر ہانڈی میں پھونک ماری تو ہانڈی میں موجود دیکھتے ہوئے کوئلے خود بخود راگھ کی شکل اختیار کر گئے تو رولو کا نے ہانڈی پر دھکن رکھ کر ہانڈی کا منہ بند کر دیا۔

ہانڈی کا منہ بند ہوتا تھا کہ چار پائی پر موجود شرفو چار پائی پر اوندھے منہ گر کر بے سادہ ہو گیا۔ پھر رولو کا نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر شرفو کی طرف پھونک ماری تو شرفو کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں اور اچنبھ کی حالت میں لوگوں کو دیکھنے لگا۔

رولو کا بولا۔ ”کمال الدین صاحب! سارے حالات کھل کر آپ لوگوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ جس پنڈت نے یہ عمل کیا تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے، اور پھر آپ کا دشمن گنگا رام بھی بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ جائے گا، اب چاہے وہ لاکھ بھگم بھگم کرے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور یہ تمام باتیں آج رات میں آپ سب کے دماغ سے نکل جائیں گی، کسی قسم کی کوئی بھی کارروائی آپ لوگوں کو یا انہیں رہے گی، اب آپ کا بچہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے، اور آئندہ بھی ٹھیک ہی رہے گا۔“

اس ہانڈی کو آپ لے جا کر گاؤں سے باہر جو ندی بہہ رہی ہے اس میں ڈال دیجئے گا، اور واپسی پر کسی قسم کی بھی آوازیں سنائی دیں، یعنی اگر کوئی آپ کا نام لے کر پکارے تو آپ برائے مہربانی پلٹ کر پیچھے مت دیکھئے گا، یہ خاص تاکید ہے۔“

”ٹھیک ہے عظیم صاحب! ایسا ہی ہوگا۔“ کمال الدین نے کہا۔ ”عظیم صاحب آپ ہمارے ساتھ اگر کھانا کھائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

یہ سن کر رولو کا بولا۔ ”کمال الدین صاحب میرا پیٹ بھر اچھا ہے، کھانے کی کوئی بات نہیں، میں جلد از جلد مطب پہنچنا چاہتا ہوں، مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔“

”عظیم صاحب اگر آپ کھانا نہیں کھاتے تو ہمارے ساتھ ایک کپ چائے پی لیجئے۔“ کمال الدین

نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”اور آپ بتائیں اس کا اندر اندہ کتنا ہے، آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے، میرے بچے کو جی زندگی دی ہے، آپ نہ ہوتے تو آج میرا بچہ موت کے منہ میں چلا جاتا۔ میں تاحیات آپ کا احسان ماننا رہوں گا۔“ کمال الدین نے کہا۔

”کمال الدین صاحب کسی قسم کا بھی نذرانہ نہیں چاہئے۔ میں یہ سارا کام اوپر والے کی خوشی کے لئے کرتا ہوں، اوپر والے نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے، بس آپ مجھے دعاؤں میں یاد کر لیا کیجئے گا، چلے اگر آپ کی خوشی چائے میں ہے تو چائے پی لوں گا مگر ذرا جلدی کیجئے۔“ رولو کا بولا۔

چند منٹ میں چائے آگئی تو کمرے میں موجود سب نے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد رولو کا بولا۔ ”کمال الدین صاحب اب مجھے اجازت دیں۔“

یہ سن کر کمال الدین بولے۔ ”چلئے میں آپ کو مطب تک چھوڑا تا ہوں۔“

”کمال الدین صاحب اس کی ضرورت نہیں، میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ رولو کا بولا۔

”عظیم صاحب یہاں سے مطب کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اور پیدل جانا، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے، اور اس طرف سے کوئی گاڑی بھی دلی تک نہیں جاتی۔“ کمال الدین نے کہا۔

”دراصل مجھے گاؤں سے باہر جوندی ہے وہاں ہر ایک ضروری کام ہے، اور میں اکیلا ہی جاؤں گا، کسی کا ساتھ مناسب نہیں اور آپ مجھے کی کوشش کریں، میں آرام سکون سے مطب تک پہنچ جاؤں گا۔ میں اپنی خوشی اور ایک اہم کام کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔“ رولو کا بولا۔

”ٹھیک ہے عظیم صاحب! ابھی آپ کی مرضی، ہم آپ کی خوشی میں خوش ہیں، میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ہم اسی قائل ہیں اس کام کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ دے گا، آپ جیسے بہت کم لوگ دنیا میں موجود ہیں، جو اس طرح دوسروں کے کام آتے ہیں۔ خیر میں آپ کو رات دن دعاؤں میں یاد کروں گا۔“ کمال

الدین نے کہا۔ اور پھر رولو کا نے سب سے ہاتھ ملایا اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چلنا شروع ہو گیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ گاؤں سے باہر نکل آیا ہے اور کسی کی نظر اس پر نہیں تو ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر مطب کے اپنے کمرے کا تصور کیا اور آنکھیں بند کر لیں تو پلک چمکتے ہی وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجتے ہی روشاک بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں نکل رہا تھا، اسے کسی پل بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ اندرونی طور پر وہ بہت سہا ہوا تھا۔ وہ ہر صورت میں خوشبو کے پاس جانا چاہتا تھا۔ لیکن خوف اس کو اپنے کھٹے میں جکڑ چکا تھا مگر رات کے پونے بارہ بجتے ہی اس کی بے چینی میں ناقابل برداشت حد تک اضافہ ہو گیا تو وہ عاتبانہ طور پر اپنے کمرے سے نکلا اور خوشبو کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

اور پھر چند لمحوں میں وہ خوشبو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ خوشبو اپنے ماتھے پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھے خیالوں کی دنیا میں غرق تھی کہ اچانک اسے سنائی دیا۔ ”خوشبو“ اپنا نام سنتے ہی وہ خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئی اور آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کے سامنے روشاک کھڑا تھا۔ اس کی حالت بہت خیر ہو رہی تھی۔ چہرے پر صاف طور پر پریشانی عیاں تھی جسے خوشبو نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا۔

”آپ آگئے! میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ اور کل رات آپ اس طرح گئے کہ مجھے بالکل بھی خبر نہ ہوئی، ورنہ آپ تو ہمیشہ مجھے بتا کر جاتے رہے ہیں، کل کیا کوئی اہم کام یاد آ گیا تھا کہ مجھے بتائے بغیر ہی چلے گئے۔“ خوشبو ہر ایک لفظ کو جباتے ہوئے بولی۔

”خوشبو ایسے ہی ایک اہم کام پڑ گیا تھا۔ اور امیر جنسی میں مجھے جانا پڑا، خیر تم فکرت کرو، ایسے کام کبھی کبھار پڑتے رہتے ہیں۔“ یہ بول کر وہ خوشبو کے قریب



ہوا، اور جب اس نے خوشبو کو چھونے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو ایک دم ٹھنک گیا کیوں کہ اس کے اور خوشبو کے درمیان ایک اندھیری دیوار حائل تھی۔

یکدم اس کا دماغ غلاؤں میں پھکر کھانے لگا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر خوشبو سے ہٹ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ مگر اب اس کے اور خوشبو کے درمیان اندھیری دیوار حائل نہیں تھی اور یہ دیکھتے ہوئے وہ انجینے میں پڑ گیا۔ آج اس کے چہرے پر برمردی چھائی ہوئی تھی جسے خوشبو نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ لیکن خوشبو کسی بھی رد عمل کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔

بستر پر بیٹھنے کے بعد مزید وہ خوشبو کے قریب کھسک گیا اور بولا۔ ”خوشبو دراصل آج میری طبیعت اندرونی طور پر کچھ سنا ساز ہے، پہلے تو میں نے سوچا کہ آج کی رات تمہارے پاس نہ آؤں مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قدم تمہارے گھر کی طرف اٹھنے لگے، بس یہی تو اصل معاملہ ہے کہ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔“

اور ہاں یاد آیا۔ وہ سانسے بیک پڑا ہے۔ اس میں اچھی خاصی رُم موجود ہے اپنے والد صاحب کو دے دینا تاکہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق خرچ کریں، ان سے کہنا کہ اگر اور چاہے ہوں تو میں لیتا آؤں گا۔“

اتنے میں اس نے اپنے ہاتھ خوشبو کی طرف بڑھادیے اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں خوشبو کا ہاتھ لیتا چا اور جو بھی اس کا ہاتھ خوشبو کے ہاتھ سے چھوا تو اسے ایک زبردست کرنٹ کا جھٹکا لگا اور فوراً وہ اپنے ہاتھ کو ہٹا لگا مگر منہ سے بولا کچھ بھی نہیں۔

کسی طرح وہ اپنی تکلیف کو خوشبو پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس کیفیت کو خوشبو نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

آج سے پہلے کبھی اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی دونوں آنکھوں کو بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ خوشبو بنور اسے ایک نکتہ دیکھنے جا رہی تھی۔ پھر خوشبو سے رہا نہیں گیا تو وہ بولی۔ ”کیا بات ہے؟ آج کچھ زیادہ ہی

اپ سیٹ لگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے تو میں نے کبھی آپ کی ایسی حالت نہیں دیکھی۔ اگر آپ کی طبیعت زیادہ سنا ساز ہے تو آپ تشریف لے جائیں اور جا کر مکمل آرام کریں۔“

”خوشبو! نہ جانے مجھے آج کیا ہو رہا ہے، مجھے شک ہو رہا ہے کہ میرا کوئی جانی دشمن مجھے پریشان کر رہا ہے، مگر میں نے اس معاملے میں بہت غور کیا کہ میرا دشمن کون ہو سکتا ہے؟ لیکن جہاں تک مجھے معلوم پڑتا ہے کہ اس طرح کا میرا کوئی بھی دشمن نہیں۔“

آج کل میں جن حالات سے دوچار ہو رہا ہوں تو کبھی کبھی میرے دل میں یہ بھی آتا ہے کہ نہیں میرے والد صاحب کو تو تمہارے اور میرے حالات کا علم نہیں ہو گیا اور اس طرح خفیہ طور پر وہ میری نگرانی کے ساتھ ساتھ مجھے پریشان کر رہے ہوں تاکہ میں دل برداشتہ ہو کر تم سے ملنا چھوڑ دوں۔

وہ کھل کر مجھ سے بات نہیں کر سکتے اور یہی راستہ ان کے دماغ میں آیا ہو کہ اسے زیادہ پریشان کر دو، اس کے راستے میں اتنی زبردست رکاوٹیں کھڑی کر دو کہ اس سے ناقابل برداشت ہو جائے۔

مگر یہ خیال پھر دل میں آتا ہے کہ یہ ناممکن ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں مانا کہ میرے والد بہت اصول پسند اور دین کے پابند ہیں اور اس طرح کی حرکت کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتے، میں سمجھتی ہوں کہ ان کے اصول اور طور طریقے دیکھنا آ رہا ہوں، وہ دارے لپے اور ابھارے والی کوئی بات نہیں کرتے، حقیقت پسند ہیں اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔

ان کی صاف گوئی اور انصاف پسندی دور دراز تک دیگر جنات کے قبیلوں تک پھیلی ہوئی ہے، اگر کوئی مسئلہ زیادہ الجھ جاتا ہے اور کسی قبیلے کے سردار کی سمجھ میں بات نہیں آتی تو وہ سردار والد صاحب سے مشورہ کرنے آ جاتا ہے، یا پھر کبھی کبھی وہ والد صاحب کو اپنے قبیلے میں لے جاتا ہے اور اس طرح اس کے قبیلے میں درپیش مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ”روشا کے کہا۔“

اگر دیکھا جائے تو روشا کے پر ایک طرح سے لرزہ طاری تھا مگر وہ اپنے پیردنی و اندرونی کیفیت پر خاصی حد تک قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

خوشبو بولی۔ ”آپ آج عجیب کیفیت سے دو چار ہیں، آج تو آپ مجھ سے بھی ہٹ کر بیٹھے ہیں، کیا میں آپ کو بری لگنے لگی؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، ارے تم پر تو جان بھی قربان ہے۔“ وہ پھر آگے بڑھ کر اس نے خوشبو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس مرتبہ جب اس نے خوشبو کا ہاتھ پکڑا تو اسے کسی قسم کا بھی کرنٹ جیسا جھٹکا نہیں لگا۔ وہ پھر اچنبھے میں پڑ گیا۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جب اس نے خوشبو کے ہاتھ پکڑے تھے تو اسے زبردست کرنٹ کا جھٹکا لگا تھا اور اس بنا پر اس نے فوراً خوشبو کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس نے خوشبو کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبانا شروع کر دیا۔ اب وہ والہانہ طریقے سے خوشبو کے قریب ہو گیا۔ اب اس کے چہرے پر خوشی کے آثار جھلکنے لگے تھے، اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی خوشی رقصاں تھیں، وہ قریب بلکہ خوشبو کے بہت قریب ہو گیا اتنا قریب کہ اس کی سانس کی گرامٹ خوشبو اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگی۔

جب بھی وہ خوشبو کے بہت قریب ہوتا تو خوشبو اندرونی طور سے بے سدھ ہی ہو جاتی، اس کی ذہنی صلاحیت جیسے مفقود ہو کر رہ جاتی، خوشبو بالکل غڑبالی ہو کر خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی تھی۔

یہ تمام معاملہ یوں ہوتا تھا کہ روشا کے کی آنکھوں سے عجیب طرح کی سفید بلیک روشنی نکلیں کی صورت میں نکلتی اور خوشبو کی آنکھوں میں گھمتی چلی جاتی۔ یعنی روشا کے اپنی مادرائی قوتوں سے خوشبو کا دماغ ساکت کر دیتا تھا اور پھر خوشبو کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔

اور پھر اس نے خوشبو کو اپنے دونوں بازوؤں میں پھنسا لیا کہ چانک اسے ایک زبردست جھٹکا کرنٹ کا لگا۔ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ وہ بستر سے نیچے فرش پر جا پڑا اور

خوشبو بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑی۔ خوشبو کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ بالکل ساکت تھی۔

روشا کے پر کچلی طاری ہو چکی تھی۔ خوشبو کو وہ نکتہ دیکھے جا رہا تھا کہ پھر وہ اچانک گھبراہٹ میں اٹھا اور بدحواسی کے عالم میں کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اس کی حالت بہت غیر اور دیدنی تھی۔ چند لمحوں کے بعد کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اپنے قبیلے کی طرف اڑان بھری۔

مگر شاید وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ایک سایہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ واقعی بہت بدحواس تھا۔ اگر وہ بدحواس نہ ہوتا تو شاید اسے اپنا پیچھا کرنا اس سائے کا علم ہو جاتا۔

چند لمحوں میں وہ اپنے قبیلے کے حدود میں پہنچ گیا۔ پھر وہ ایک حویلی نما مکان کے قریب پہنچا اور اس مکان میں گھستا چلا گیا اور پھر وہ سایہ جو کہ اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا وہاں اس جگہ سے پلٹ آیا۔

دراصل وہ سایہ کوئی اور نہیں بلکہ ردلو کا تھا، جس نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے قبیلے تک اس کا گھر دیکھنے آیا تھا۔ خوشبو کے کمرے میں جب روشا کے آیا تھا اس وقت بھی ردلو کا غائبانہ طور پر کمرے میں موجود تھا، پہلے تو ردلو کا اس کے اور خوشبو کے درمیان ایک اندھیری شیشی کی دیوار قائم کر دی، پھر اس دیوار کو ختم کر کے خوشبو کے جسم میں بجلی کا اثر پیدا کر دیا جس کی وجہ سے روشا کے کو کرنٹ کا جھٹکا لگا۔ پھر ردلو کا نے خوشبو کے جسم سے بجلی کا اثر ختم کر دیا۔

مگر پھر روشا کے جب حد سے آگے بڑھنے لگا تو ردلو کا نے دوبارہ خوشبو کے جسم میں بجلی کا اثر زیادہ تھا پیدا کر دیا جس سے روشا کے کو اتنا زبردست جھٹکا لگا کہ بستر سے وہ نیچے فرش پر جا پڑا تھا۔

ردلو کا اپنے کمرے میں واپس آ کر اطمینان سے بستر پر لیٹ گیا اور آنے والے وقت کے متعلق سوچنے لگا اور پھر اس کے ہونٹوں پر زبردست معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، پھر وہ دھڑکے سے بڑبڑایا۔ ”روشا کے نیچے تیری وہ حالت کر دوں گا کہ مگر کبھی تو بھول نہیں سکتا،

تو نے معصوم لوگوں پر بہت ظلم کر لیا۔“

اوس رو شاک اپنے کمرے میں بیٹھتے ہی بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔ وہ مایوسی سے آب کی طرح تر پنے لگا تھا۔ اسے ایک بل کے لئے بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں پھلنے لگیں اور کان پیڑی ہو گئیں۔ ساتھ ہی اس کی ہنسیوں چوڑی ہو کر تن گئیں اس کے لمبے بال نیچے کی طرح کھڑے ہو گئے، اس کا چہرہ بہت ڈراؤنا اور بھیاں لگنے لگا تھا۔ اس کا غصہ اپنے انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

وہ بار بار اپنے ہاتھ کی دونوں مٹھیوں کو اس قدر زور سے بھینچتا کہ لرز کر رہ جاتا، وہ بھی بستر سے اٹھ جاتا اور کمرے میں بیٹھنے لگتا اور پھر بستر پر اوندھے منہ پڑ جاتا اور پھر اسی صورت میں وہ وقت بھی آن پہنچتا جب اس کے والد نماز فجر کے لئے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیتے۔ والد نے دروازہ کھٹکھٹایا تو فوراً وہ اپنے نارمل حالت میں آ گیا اور کپکپاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

والد نے جب اس کی حالت دیکھی تو گھبرا گئے اور بولے۔ ”رو شاک خیریت تو ہے، تمہاری طبیعت بہت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔“ اور پھر انہوں نے اس کی کٹائی پکڑی تو انہیں بہت زیادہ گرم کس محسوس ہوا، ”رو شاک تمہیں تو زبردست بخار ہو رہا ہے، تم نے ہمیں بتایا نہیں۔ خیر تم لیٹ جاؤ، تم پر تو کچھ ٹپکی طاری ہے، نماز کے بعد میں حکیم صاحب سے بات کروں گا، وہ علی الصبح آ کر دوا دے دیں گے۔ گھبراؤ نہیں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ یہ بول کر وہ نماز فجر کے لئے چلے گئے۔

دو پہر تک رو شاک کا بخار ٹھیک ہو چکا تھا۔ وہ پہر کے بعد اپنے قبیلے سے تھوڑی دور درختوں کے جھنڈ میں ایک درخت کے پاس بہت اداس بیٹھا تھا اس کا دماغ سوچ سوچ کر شل ہو رہا تھا۔ جو حالات اس کے ساتھ پیش آ رہے تھے ان کے متعلق وہ جتنا زیادہ سوچتا اس سے کہیں زیادہ الجھتا جا رہا تھا۔

اپنا سر نیچے کئے مرنے کی صورت میں بیٹھا تھا

کراتے میں اس کے تین دوست بیٹھے ہوئے اس طرف آنکھ۔ جب انہوں نے اس حالت میں دیکھا تو بہت تشویش میں پڑ گئے اور پھر وہ تینوں ایک دوسرے کو مسموع خیر لگا ہوں سے دیکھنے لگے اور اشارے سے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ”یہ معاملہ کیا ہے؟“

وہ تینوں انچھنے کی حالت میں تھے انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا اس حالت میں دیکھ کر کیونکہ رو شاک ایک بہت ہی منجلا اور کھنڈرا جن زادہ تھا۔ ایک منٹ بھی خاموش رہنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہر وقت اچھل کور غل شپازہ چائے رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ کھاؤ پیو اور منو کھیلو۔ اس سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں سوچتا تھا۔

وہ تینوں اس کے پاس خاموشی سے بیٹھ گئے اور اسی حالت میں کچھ وقت تک اسے دیکھتے رہے مگر وہ جس حالت میں تھا اس سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ تب ان میں سے ایک بولا۔ ”رو شاک! رو شاک!“

اپنا نام سننے ہی اس نے فوراً سر کو اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور اسی اثنا میں اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔ اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے منہ سے کچھ بھی نہیں بولا بلکہ ٹکڑا نہیں دیکھنے لگا۔

ایک بولا۔ ”رو شاک خیریت تو ہے ناں! کیا بات ہے تمہاری یہ حالت؟“

دوسرا بولا۔ ”جلدی سے بتاؤ ہوا کیا ہے؟“ تیسرا بولا۔ ”آخر بات کیا ہے؟ اگر کسی نے زیادتی کی ہے تو ہم اس کا نام اس دنیا سے مٹا کر رکھ دیں گے۔“

”الطاف میری اس حالت کے پیچھے کوئی ناویدہ قوت ہے جس نے میری زندگی کو اجیرن کر دیا ہے، اس نے میرا بل بل کا چین چھین لیا ہے، وہ ناویدہ قوت میری قوت سے کہیں بڑھ کر ہے، لاکھ کوشش اور تنگ دود کے باوجود بھی میں اس کی گردنک کو نہ پاسکا۔ دراصل میں ایک آدم زاری کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور آج بھی میں

اس آدم زاری کی محبت کا دم بھرتا ہوں، اب میں اس بچ پر پیچ چکا ہوں کہ اس آدم زادی سے ایک بل کی دوری بھی مجھے حال سے بے حال کر رہی ہے۔

یہ سلسلہ ایک طویل عرصہ سے چل رہا ہے، اس بات کو میں نے سب سے چھپائے رکھا، وہ آدم زادی بھی مجھے نوٹ کر چاہتی ہے۔ لیکن اب تھوڑے دنوں سے ایسا ہونے لگا ہے کہ میں جب بھی اس کے پاس جاتا ہوں، تو وہ ناویدہ قوت مجھے پریشان کرتی ہے، بلکہ اب تو مجھے اذیت دینے لگی ہے۔ میں اپنی تمام جتنی قوتوں کو آزما چکا ہوں مگر ہر صورت وہ میری تیغ سے بہت دور ہوتا ہے۔ بلکہ ایک رات تو اس قوت نے مجھے اس آدم زادی کے پاس سے اٹھا کر فلاں دیرانے میں لا کر اوپر سے نیچے زمین پر پڑ دیا تھا اور کل رات بھی اس قوت نے مجھے بہت اذیت سے دو چار کر دیا۔“ رو شاک نے اتنا کہا اور آنسو اس کی آنکھوں سے پھلنے لگے۔

”اس ناویدہ قوت اور ہستی کی ایسی کی تھی۔ تم اس آدم زادی کے گھر کا پتہ بتاؤں، ہم تینوں اس جگہ بھی جاتے ہیں، اس گھر اور اس گھر کے اطراف رہتے ہوئے پتہ کرتے ہیں کہ وہ ناویدہ قوت ہے کون؟“

رو شاک ہم تینوں تمہاری پریشانی کے لئے اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے، دوست کے لئے اگر دوست کی جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس آدم زادی یا اس کے گھر والوں نے کسی بڑے عامل سے رابطہ کیا ہو، اور وہ عامل تمہیں تنگ کر کے پریشان کر رہا ہے اور پھر آہستہ آہستہ تمہارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے تمہاری حفاظت کو سلب کر دینا چاہتا ہو، اگر ایسی بات ہے تو یہ بہت پریشان کن ہے۔

اور ہاں یاد آ یا تمہیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ہمارے سردار یعنی تمہارے والد کتنے با اصول ہیں۔ کیا وہ تمہاری اس حرکت یعنی آدم زادی سے میل جول کو سراہیں گے؟

ایک دوسرا بولا۔ ”اور پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری مدد کے چکر میں ہم سردار کی نظروں میں آ جائیں اور ہماری جان کی بخشی نہ ہو، خیر تم گھبراؤ نہیں، ہم غصہ طور پر ان معاملات کو معلوم کرنے کی کوشش کریں گے، تم ایسا کرو کہ ہمیں اس آدم زادی کے گھر کا پتہ بتاؤ اور ساتھ ہی یہ بھی کرو کہ چند دن اس آدم زادی سے نہ ملنا، پھر دیکھتے ہیں کہ ہوتا کیا ہے۔“

”چلو اٹھو، اس میں دیر نہیں کرنی چاہئے، ہمارے ساتھ چلو اس کا گھر دکھانے کے لئے۔“ ایک نے کہا۔

رو شاک اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر وہ چاروں غائب ہو کر خوشبو کے گھر کی طرف آنے لگے۔ اس جگہ پہنچ کر رو شاک نے خوشبو کے گھر کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد وہ چاروں اپنے قبیلہ کی جانب واپس ہوئے تاکہ کافی سوچ بچار کرنے کے بعد اس مسئلے کا حل تلاش کریں اور ساتھ ہی اس ناویدہ قوت کا پتہ بھی چلائیں۔

جب وہ چاروں جن خوشبو کے گھر کے پاس آئے تو فوراً رولوکا کے کارندوں نے ان کے آنے کی خبر رولوکا کو دے دی۔ جسے سن کر رولوکا مسکرانے لگا تھا۔ اس کے بعد رولوکا نے اپنے کارندوں کو کسی انجان زبان میں کچھ ہدایات دیں اور پھر انہیں جانے کا اشارہ کر دیا۔

اوس رو شاک کے تینوں دوست الماش، داماں، کالاں، خوشبو کے گھر کے چکر لگانے لگے، ایک جاتا تو دوسرا موجود ہوتا، اندرونی بیرونی تمام جگہوں کو وہ چیک کرنے لگے تھے بلکہ غائبانہ طور پر ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی خوشبو کے گھر والوں کے درمیان موجود ہوتا تھا تاکہ گھر والوں کی زبان سے اس معاملے کی کوئی بھی تو بات نکلے، مگر تین دن ہو گئے تھے مگر اس درمیان کوئی ایسی بات یا پھر ہنک نہ ہوئی نہ بھانپ سکے اور نہ ہی کسی ناویدہ قوت کو ہی محسوس کر سکے، تین دنوں کی ایک ایک بل کی خبر رو شاک کو دیتے رہے اور پھر اس طرح پورا ہفتہ گزر گیا۔ وہ تینوں کسی بھی ناویدہ قوت کا پتہ نہ چلا سکے۔

پورا ہفتہ رو شاک خوشبو کے پاس نہیں آیا اور رو شاک کے تینوں دوست تھک ہار کر اپنے قبیلے میں بیٹھ



گئے، ان تینوں کو یہ بھی ڈرتھا کہ کہیں ان کی ان حرکتوں کا علم سردار کو نہ ہو جائے اور پھر اس معاملے میں ان کی کھپائی شروع ہو جائے۔

اس قبیلہ کا مسلم اصول تھا کہ اس قبیلے کے کسی بھی جن سے کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر کسی نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو تکلیف پہنچائی تو پھر اس کی خیر نہیں، اور سارے جن اس معاملے میں احتیاط برتتے تھے کہ کہیں بھول کر بھی ان کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچ پائے۔

ٹھیک آٹھویں دن روشاک کو خوشبو کی جدائی ناقابل برداشت ہوگئی تو نماز جمعہ کے بعد وہ اپنے قبیلہ سے نکلا اور خوشبو کے کمرے میں آن دھکا۔ اس وقت خوشبو اپنے کمرے میں نماز پڑھ کر آرام کر رہی تھی کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

جس وقت روشاک خوشبو کے گھر کے قریب پہنچا تھا کہ اس کی خبر روٹو کا اس کے کارندوں نے فوراً کر دی اور پھر روٹو کا سکرانا ہوا عاتبانہ طور پر خوشبو کے کمرے میں پہنچ گیا۔

اور دیکھا کہ خوشبو سے روشاک اپنی داستان جدائی سنانے میں مصروف ہے۔ ویسے خوشبو کافی سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

خوشبو دی۔ ”حیرت ہے آپ ایک ہفتہ بعد آئے اور وہ بھی دن میں اور آپ تو خاص کر جمعہ کے دن کبھی آئے نہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ جمعہ کے دن آپ کے والد صاحب قبیلہ میں درس دیتے ہیں، محفل منعقد ہوتی ہے اور اس وقت قبیلے کے سارے جن اس محفل میں موجود ہوتے ہیں، مگر آپ کو اس محفل میں نہ پا کر آپ کے والد اور دیگر جنات کیا سوچیں گے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی کھوج شروع ہو جائے۔“

روشاک بولا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو جائے، خوشبو میں شہزادی جدائی۔۔۔۔۔ اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس کے گال پر ایک زمانے دارزبردست چھپر پڑا تھا۔ وہ چھپر اتنا زرد تھا کہ وہ بدحواسی کے عالم میں

کمرے کے دروازے سے باہر کو بھاگا اور ہوا کے دوش پر اپنے قبیلے کی جانب بڑھنے لگا روٹو کا بھی اس کے پیچھے ہی قبیلہ میں پہنچ گیا۔ روٹو کا غائب حالت میں تھا۔ بدحواسی کے عالم میں روشاک دوڑتا ہوا ایک طرف محفل میں آ کر بیٹھ گیا روشاک کی اس حرکت کو محفل میں بیٹھے ہوئے سب نے واضح طور پر محسوس کیا۔

روشاک کے والد ایک اونچی کرسی پر بیٹھے ہوئے درس دینے میں مصروف تھے کہ اچانک ان کے منہ سے نکلا۔ ”آدم زاد۔۔۔۔۔! ہماری محفل میں۔۔۔ وہ خاموش ہو گئے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اپنے سردار کے منہ سے لفظ آدم زاد اچانک سن کر قریب کے جنات ششدر ہو گئے اور پھر انہوں نے دیکھا کہ سردار نے اپنی آنکھیں فوراً بند کر کے کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ روٹو کا بھی اس محفل میں عاتبانہ طور پر آ کر سردار کے دائیں طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ سردار نے چند لمحے بعد اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر سردار کی بارعب آواز سنائی دی۔ ”قابل محترم آدم زاد۔ میں آپ کو سلام کرتا ہوں۔ میں آپ کے رتبے، قابلیت، بڑائی، عظمت اور روحانی طاقت کا اقرار کرتا ہوں اور یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے کی اور وہ بھی اچانک۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کی میں دوا دیتا ہوں کہ آپ نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا؟ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ اچانک بے مقصد یہاں آئے ہیں۔ میرے قبیلے کے سارے جنات آپ کی آمد کو محسوس نہ کر سکے مگر میرا تجربہ میرا علم روحانی طاقت نے آپ کی آمد کو محسوس کر لیا۔

آپ کی آمد ہمارے لئے باعث خوشی ہے، کیا میں آپ کی آمد کے بابت جان سکتا ہوں۔“ دیے خیر تو ہے نا؟“

”سردار! خبریت نہیں ہے!“ روٹو کا بولا۔ ”خبریت نہیں ہے! کیا مطلب؟ آپ حکم کریں! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا ہم سے کسی قسم کی کوئی زیادتی ہوئی یا پھر۔۔۔۔۔“ سردار نے بات ادھوری

چھوڑ دی۔

سردار کی باتیں سن کر پوری محفل پر اچانک جیسے سنگت طاری ہو چکا تھا۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے تمام جنات اچنبھے کی حالت میں تھے۔ روٹو کا جو عاتبانہ طور سے موجود تھا کس کو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سردار کو بھی نظر نہیں آ رہا تھا مگر سردار نے روٹو کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔

کچھ جنات غصے کی حالت میں بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی جتنی قوتوں سے یہ معلوم کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہے تھے کہ معلوم ہو جائے کہ یہ کون انسان ہے اور اتنی طاقت کا مالک ہے کہ وہ نہانا ہوا ہماری محفل میں آن دھکا اور وہ بھی بغیر اجازت اور بغیر کسی اطلاع کے بھی بکھارایا بھی ہوتا تھا کہ کوئی بہت پہنچا ہوا انسان سردار کی دعوت پر آیا پھر کسی اور ضرورت کے تحت سردار سے ملنے آ جاتا تھا۔ مگر آج یہ اچانک کیا ہوا کہ ایک اجنبی اس طرح اچانک وارد ہو گیا اور وہ بھی کسی شکایت کے تحت۔

سردار کے برابر والی کرسی پر ایک بہت ہی ضعیف پاریش جن بیٹھا تھا، وہ سردار کی اور روٹو کی باتیں سن کر بالادب اپنی جگہ سے اٹھا اور سردار سے مخاطب ہوا۔ ”معزز سردار! اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟“

سردار نے کہا۔ ”محترم استاد آپ کو اجازت ہے آپ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ سکتے ہیں لیکن یہ خیال رہے کہ انجی اپنے مزاج پر کچھ بار نہ محسوس کرے۔“

”سردار ایسا نہیں ہو سکتا، میں ان تمام باتوں کو بخوبی سمجھتا ہوں اور میں نے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ محترم انجی نے جب یہاں اس طرح آنے کی جسارت کی ہے تو یقیناً کوئی بہت ہی اہم معاملہ ہے، اور اجنبی کی روحانی قوتیں بھی اپنی جگہ مسلم ہیں۔ ایک عام انسان اس جگہ آ ہی نہیں سکتا، ان تمام باتوں کے پیش نظر میں اجنبی کی مدعا جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔“ پاریش جن نے کہا۔

پوری محفل میں جتنے بھی جنات موجود تھے ان سب میں ابھی تک روٹو کی آمد صرف وہ پاریش جن

اور سردار نے ہی سنی تھیں۔

بزرگ جن نے روٹو کی طرف اپنا منہ کیا اور اپنا سرخم کر کے تنظیم دی اور پھر گویا ہوا۔ ”محترم اجنبی کیا میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟“

”محترم استاد! میرا نام روٹو کا عرف کامل ہے۔ لوگ مجھے حکیم کامل کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔“ روٹو کا نے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”محترم! ہم آپ کو آپ کے اصل نام سے ہی مخاطب کرتے ہیں۔ محترم روٹو کا صاحب! سب سے پہلے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی روحانی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا کروں کہ محفل میں موجود سارے جنات آپ کی گفتگو کو سن سکیں اور آپ کے مدعا کو سب جان سکیں، ہمارے قبیلہ کا اصول ہے کہ ہم کسی بھی گھمبیر مسئلے کو سب کے سامنے لاتے ہیں اور پھر سب کی متفقہ رائے جانتے ہیں۔ ہمارے قبیلے میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا معاملہ نہیں ہے جس کا جو مقام ہے وہ اپنی جگہ خوش ہے۔

محترم روٹو کا صاحب! میں آپ کی روحانی قوت پہنچ کر بخوبی کچھ چکا ہوں اور یہ بھی جان چکا ہوں کہ آپ بھی بہت با اصول اور انصاف پسند ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ جس شکایت کے تحت یہاں تشریف لائے اس کا ازالہ آپ اپنی جگہ کر سکتے تھے۔

اور جس بات یا پھر جس کسی کی حرکت سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے اور یقیناً غصہ بھی آیا ہو گا تو اس غصہ کے تحت آپ کوئی اہم فیصلہ کرتے ہوئے اس جن کو ناقابل فراموش اذیت سے دوچار کر سکتے تھے یا پھر اس جن کو قید کر لیتے یا پھر اس کی زندگی کا صفایا کر سکتے تھے۔

آپ نے جس بردباری اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے، میری عمر کوئی چار ہزار سال کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے اور اب تک میں نے اپنی اتنی عمر میں آپ جیسا تحمل مزاج اور قوت برداشت والا نہیں دیکھا جس کا میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ہم مسلمان جن ہیں، ہم احکام خداوندی کو مانتے ہیں، ہم حدود شرعی سے آگے نہیں جاتے، ہماری کوشش رہتی ہے کہ ہمارے قبیلہ کا کوئی بھی جن خلاف شریعت کوئی قدم نہ اٹھائے، ہماری ذات سے کسی انسان کو دکھ اور اذیت نہ پہنچے اور اگر تاوان لگتی ہیں کسی انصاف سے ہمارے مزاج کے خلاف کوئی غلطی سرزد ہو بھی جاتی ہے تو ہمارے سردار کا حکم ہر جن کے لئے ہے کہ اس انسان کی غلطی کو درگزر کرو دیا جائے۔

شریعت کی تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے سردار ہر جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد ایک محفل منعقد کرتے ہیں جیسے کہ آج کی محفل آپ کے سامنے ہے، اس محفل میں درس دیا جاتا ہے، پورے نئے کی ہر کسی کی کارکردگی کو مد نظر رکھا جاتا ہے، سب کے گوش گزار کیا جاتا ہے کہ احکام خداوندی پر کاربند ہیں اور اپنی ذات سے کسی بھی جنات قبیلہ یا پھر انسان کو تکلیف نہ پہنچائی جائے، ہمارا ایمان ہے کہ خدا نے دنیا میں جتنے بھی مخلوق پیدا کئے ہیں ان سب کے لئے ایک حدود متعین کر رکھی ہے دنیا میں کوئی بھی مخلوق بے مقصد نہیں پیدا کی گئی۔ ہر مخلوق کا خدا کی نظر میں کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے۔ حشرات الارض، چرند پرند اور درندے تک ان سب کی بھی ایک حدود مقرر ہے، درندے خون پی پیتے ہیں مگر وہ بھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتے اگر درندے جنگل چھوڑ کر جو شہر یا گاؤں ان کے رہائشی جنگل کے قریب ہیں اس جگہ آجائیں تو ایک ہی رات یادوں میں سیڑیوں بلکہ لاکھوں انسان یا چوپائے خون میں نہا جائیں مگر ایسا نہیں ہوتا، اس لئے کہ خدا نے حد بندی کر دی ہے۔

قرآن میں واضح طور پر ہماری نشاندہی کی گئی ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت ”سورہ جن“ ہے۔ جنات میں بھی کچھ نافرمان کچھ کافر اور شریعت کے پابند ہیں۔ جس طرح انسان موت سے ہمتا رہتا ہے اسی طرح جنات بھی اپنی عمر کو پہنچ کر یا آخری عمر سے پہلے کسی بیماری

یا حادثاتی موت سے ہمتا رہ جاتے ہیں۔

جس طرح انسان اپنی زندگی گزارتا ہے اسی طرح جنات بھی اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ جس طرح انسان میں کچھ لوگ نافرمان ہوتے ہیں، کچھ شرارتی، کچھ بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اپنی مفاد پرستی اور نفسانی خواہشات میں بہت آگے نکل جاتے ہیں، کسی کی عزت آبرو کا خیال نہیں رکھتے، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ اپنی پسند اور ناپسند کو مقدم سمجھتے ہیں، کچھ شریعت پر چلتے ہیں اور احکام خداوندی کو اپنی زندگی کا شعار بناتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو احکام خداوندی کا پرچار کرتے یعنی دور دراز کا سفر اختیار کر کے لوگوں کو شریعت پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس طرح جنات بھی اپنی زندگی گزارتے ہیں جس طرح انسان جزا اور سزا کا مستحق ہوتا ہے، اسی طرح جنات بھی ان تمام باتوں کے حقدار ہوتے ہیں جس طرح انسان مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح جنات بھی مذہبی تعلیم کو اپناتے ہیں۔

جس طرح انسان کسی جرم میں سزا پاتا ہے اور کوئی بہت بڑا جرم کرتا ہے تو اسے پھانسی پر چڑھایا جاتا ہے یا پھر کسی اور طریقے سے اسے سزائے موت دی جاتی ہے بالکل اسی طرح جنات بھی کسی بڑے جرم کے پاداش میں سزا پاتے ہیں یا پھر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جس طرح انسان با مشقت قید جھیلتا ہے اسی طرح جنات بھی سزائے سخت قرار دیئے جاتے ہیں اور انہیں قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔

معزز و محترم رولو کا صاحب! میں نے ساری باتیں تفصیل سے کر دی ہیں۔ اب ہماری خواہش ہے کہ آپ اپنا مدعا بیان کریں جس کے لئے آپ نے یہاں آنے کی رحمت اٹھائی۔ آپ کی باتیں سننے کے بعد، اس کے فیصلے پر پورا غل ہوگا، اگر کسی نے قبیلہ کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔“

یہ سب سن کر رولو کا بولا۔ ”معزز سردار اور محترم استاد صاحب! آپ کی تمام باتیں سو فیصد درست ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نافرمان خداوندی کے مطابق کسی کی ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچے اور ہر مخلوق کے لئے خدا نے ایک حد مقرر کر دی ہے۔

خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ قوم جنات بھی خدا کی مخلوق ہیں اور جنات کو خدا نے مخفی طاقتیں عطا کی ہیں۔ جو قومیں جنات میں ہیں وہ انسان میں نہیں۔ انسان کی نظر میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ مخفی چیزوں کو دیکھ سکے مگر جنات ہر مخفی چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں یعنی جنات انسان کو دیکھتے ہیں مگر انسان جنات کو نہیں دیکھ پاتے۔

کیا کسی جن کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ انسان کو اپنی ذات سے نقصان پہنچائے جب کہ وہ انسان معصوم ہو، اس انسان کی ذات سے تکلیف پہنچانے والے جن کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا ہو۔ وہ جن اپنی مخفی طاقتوں کے ذریعہ اثر اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیش نظر، انسان کو بے حد تکلیف کر کے اپنی من مانی کرے۔

کیا کسی جن کو یہ زیب دیتا ہے کہ شروع میں ایک انسان کو دھوکے دے کر، خود کی شکل تبدیل کر کے یعنی وہ شکل کسی خوب صورت جانور کا دھار لے اور کسی انسان کی توجہ حاصل کرے اور جب ایک انسان اس کی طرف بھرپور توجہ دیتا ہے اور انسان اپنی فطرت کے تحت اس جانور کا گرویدہ ہو جاتا ہے تو پھر وہی جن جس نے اپنی شکل بدل ڈالی ہے، انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے، یا پھر ایک انسان کو دھونس دھمکی سے زیر کرے یا پھر ایک انسان پر اپنی جتنی قوتوں سے سحر طاری کرے اور اس کے بعد اپنی خواہشات کی تکمیل کرے۔

چونکہ انسان جنات سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا لہذا ایک انسان جن سے خوفزدہ ہو کر ڈر جاتا ہے اور جن کے آگے اپنا سر خم کر دیتا ہے۔ ایک جن انسان کو اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے، بعض اوقات انسان کو

جن تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے یا پھر انسان کو موت سے ہرگز نکر دیتا ہے، اکثر سرکش جن انسان کی پوری زندگی کو اجڑان کر کے رکھ دیتے ہیں، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جن انسان کو صرف مادے ہی نہیں بلکہ انسان کے مال و متاع کھیت کھلیاں کھیتی باڑی و صحر و دگر یا پھر دیگر چیزوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

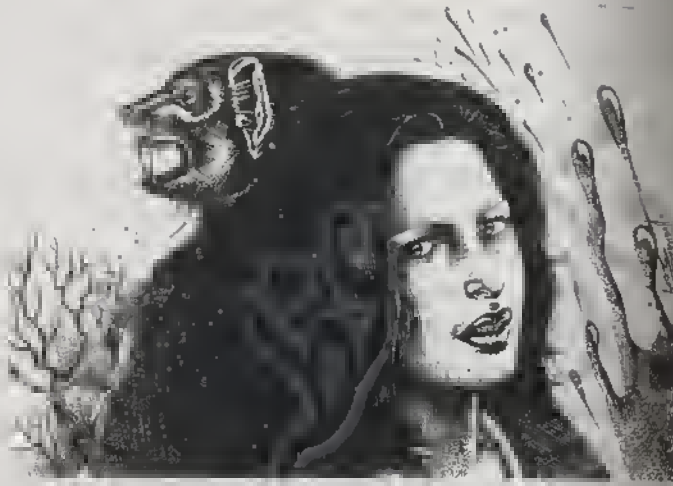
جبکہ جنات کا ایک انسان اتنا نقصان نہیں کرتا، جنات کو اذیت نہیں دیتا، جنات پر زور زبردستی قبضہ نہیں کرتا، جنات کو ڈر اور دھمکا کر یا پھر جنات پر اپنا کوئی سحر طاری کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں کرتا کیونکہ ایک عام انسان کے پاس اتنی دھار کی قوت نہیں ہوتی جس کے ذریعہ وہ جنات پر تسلط قائم کر سکے۔

ہاں! میں اس بات کا ضرور اقرار کرتا ہوں کہ کبھی کبھار کوئی بہت پہنچا ہوا انسان جو کہ عامل ہوتا ہے یا پھر اللہ کا بڑا عزیز ہوتا ہے جو کہ روحانی قوتوں پر دسترس رکھتا ہے ایسی صورت میں وہ با قوت انسان کی سرکش جن کو قابو کر کے اسے قید کر لیتا ہے یا پھر کسی ضدی یا نافرمان جن کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اور ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ سرکش جن اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے عامل باللہ والوں کی بات نہیں مانتا۔

اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایچھے اور بااخلاق جن اللہ والوں کے پاس آتے جاتے ہیں ان سے درس لیتے ہیں بلکہ قرآن مجید پڑھتے بھی ہیں۔

یہ بھی اکثر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ نوجوان جنات کسی خوب صورت دلکش اور من موعنی صورت کی مالک لڑکی جس کے لمبے بال ہوں، اس پر عاشق ہو جاتے ہیں اور اس کے لئے اس معصوم لڑکی پر اپنا سحر طاری کر دیتے ہیں اور اس پر تسلط جمانے لیتے ہیں اور اگر اس لڑکی کے گھر والے اس جن کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں تو ان گھر والوں پر معصیت کا پہاڑ توڑ دیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی پریشانیوں اور اذیتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور پھر آخر میں تمام گھر والوں کو جان





## دل کے رشتے

اسرارہ نوشین۔ فیمل آباد

اچانک بند دروازہ کھلا اور پھر خود بخود ایسے بند ہو گیا جیسے کوئی باہر نکلتے ہوئے ہلکے سے بند کر دیتا ہے اور پھر ساتھ ہی بوڑھا دل بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا منہ سے آخری لفظ نکلا۔ میرا بچہ.....

کیا ناپید تو تم بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں۔ حقیقت کا پتہ تو کہانی پڑھ کر ہی چلے گا۔

”آخر کیا ہے اس ویرانے میں آپ ہماری کیوں نہیں مان لیتیں۔“ اونچی اور تیز آواز اندر سے میں دور تک گونجی تھی۔ محن میں میری کے چوں میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ جیسے میری کے چوں کو بھی یہ لہجہ ناکار گزارا ہو۔ ”اس گھر میں تم لوگوں نے آنکھ کھولی تھی اسی گھر میں تم لوگوں نے چلنا سیکھا تھا۔“ بوڑھی آنکھیں جگنوؤں کی مانند چمک اٹھی تھیں جیسے ایک لمحہ ان آنکھوں کے سامنے آیا ہو۔ پھر آنکھوں میں وحند سی چھا گئی تھی۔

”اس گھر کے پاس ہی تمہارے اباؤں ہیں مستقیم۔ میں بوڑھی ہوں، زیادہ چلا نہیں جاتا اب تو آہستہ آہستہ روز تمہارے ابا سے چار باتیں کرنے چلی جاتی ہوں، تمہارے گھر چلی گئی تو روز یہاں تو نہیں آسکوں گی نا۔“

آپ کو باشریت احکام خداوندی کا پابند جانتے ہوئے یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں، اگر میں چاہتا تو اپنے مزاج کے مطابق کوئی اہم قدم اٹھا بیٹھتا مگر میں نے یہ مناسب نہ سمجھا بلکہ میں نے اپنے تئیں آپ کے قبیلہ کے آپ کے اصول اور آپ کی ذات کے متعلق پوری معلومات کرنی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میں خود کوئی حتمی قدم اٹھاؤں تو آپ طیش میں آجائیں اور غلط انداز میں سوچنے لگیں اور پھر غصے میں آ کر چند انسانوں کا نقصان کر بیٹھیں کیونکہ عموماً غصے میں کسی کو کچھ سوچتا نہیں۔“

رولوکا نے کہا۔

معزز مہمان! میں آپ کو مہمان یوں کہہ رہا ہوں کہ آپ ہمارے قبیلے میں تشریف لائے، تو میں اپنے مزاج اور قبیلے کے قانون کے مطابق آپ کو مہمان کا ہی درجہ دے رہا ہوں۔

یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ کسی شکایت کے پیش نظر آئے اور آپ کی آمد کے بعد آئندہ ہمارے قبیلے کا کوئی جن غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔“

سردار نے کہا۔

”معزز سردار! یہی سوچ کر میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ حقیقت سامنے آئے، پھر آپ اپنے قانون کے مطابق پورا پورا انصاف کریں اور اس کے بعد آپ کے قبیلہ کا کوئی اور جن اس غلطی کو آئندہ نہ ہرائے کیونکہ جو لوگ پورا پورا انصاف کرتے ہیں اور جو اپنوں اور غیروں میں فرق نہیں رکھتے ان سے خدا بہت خوش ہوتا ہے۔“

رولوکا بولا۔

”معزز مہمان! آپ اصل مدعا بیان کریں؟“

سردار نے کہا۔

”تو سردار محترم! آپ کے قبیلے کا وہ تافران جن ہے، آپ کا بیٹا روٹا ہوا۔“

یہ سنتے ہی سردار کے تیور بدل گئے اس کا چہرہ غصے سے تپتا اٹھا اور غصے و غضب کی حالت میں کرخت اور گرد آواز سنائی دی۔ ”روٹا..... شا..... ک.....“

(جاری ہے)

سے مار دینے کی دھمکی دی جاتی ہے یا پھر ایک آدھ کو مار بھی دیتے ہیں جس سے گھروالے خوف کھاتے ہیں اس جن سے ڈر جاتے ہیں اور اپنی جان بچانے کی غرض سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔“

رولوکا جب یہ باتیں کر رہا تھا تو اس نے اپنی توڑوں سے ایسا کر دیا تھا کہ اس جگہ موجود تمام جنات اس کی آواز سن سکیں۔

تمام جنات رولوکا کی باتیں سن رہے تھے اور چونکہ تمام باتیں صحیح تھیں لہذا تمام جنات سکتے کے عالم میں بیٹھے تھے اور بغیر کسی چوں چراں کے ایک تک رولوکا کی آواز کی طرف کان لگا رکھے تھے۔

”ہاں! تو سردار محترم اور استوار محترم! اگر کوئی جن اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کسی آدم زادی پر اپنا سحر طاری کر دیتا ہے اور اپنی من مانی کرتا ہے اس کے لئے آپ کے قبیلہ کا کیا قانون ہے آپ ایسے جن کے لئے کیا سزا تجویز کریں گے؟ اور اگر وہ جن قبیلہ کے کسی اہم فرد کا بیٹا ہو؟“

رولوکا نے پوچھا۔

یہ سن کر سردار فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔

”محترم رولوکا! اگر میرا بھی بیٹا ہو اور اس نے یہ قدم اٹھایا ہے اور قبیلے کے قانون کو توڑا ہے اور احکام خداوندی کے مقرر کردہ حدود سے آگے نکل گیا ہے یا پھر حدود شرعی کی خلاف ورزی کی ہے یا کسی آدم زادی پر اپنا جاتی سحر طاری کر کے اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کی ہے تو وہ قرار واقعی سزا کا مستحق ہے، ہمارے مقرر کردہ قانون سے وہ کسی صورت بھی بچ نہیں سکتا۔“

قابل احترام اور معزز رولوکا! آپ بتائیں کہ ہمارے قبیلہ کے کس جن نے ایسی خلاف ورزی کی؟ کیا اس نے کسی انسان کو ناقص ستایا ہے؟ کیا کسی کے ساتھ جبر کیا ہے؟ کیا کسی کو دھوکہ دیا ہے؟ کیا قانون قدرت سے انحراف کیا ہے؟ آپ بلا جھجک بتائیں، غلطی کرنے والے کو بخشا نہیں جائے گا اور پورا پورا انصاف ہوگا۔“

”معزز سردار! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور

”اماں ہم تینوں رات کو آپ سے ملے آتے ہیں۔ روز ہم میں سے ایک رات کو آپ کے پاس سو جاتا ہے مگر آپ دیکھیں، ہمارے بچوں کو بھی تو ہماری ضرورت ہے۔ آج کل بچوں کا خیال رکھنا ضروری اور مشکل ہے آپ جانتی ہیں۔ شام کو کام سے آ کر کھانا کھاتے ہی ہم آپ کی طرف بھاگتے ہیں۔ یہاں سے واپس جاتے ہیں تو بچے سوچ سکتے ہوتے ہیں۔ ان سے نہ ان کی پرہیزی کا پوچھ سکتے ہیں اور نہ ان کے مسائل وغیرہ کا کچھ پتہ ہوتا ہے۔“ عمیر نے قدرے دھیمی آواز میں اماں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”بیٹا معلوم نہیں میری زندگی کے کتنے دن باقی ہیں مگر جتنے بھی ہیں مجھے اسی گھر میں رہنے دو۔“ اماں نے محبت اور نرمی سے التجا کی۔

”تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔“ اماں کو سمجھانا بے ود ہے۔“ فیصل نے آنکھیں سے سرگوشی میں پاس بیٹھے دونوں بھائیوں سے کہا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلیں مستقیم بھائی ہم چلے ہیں۔ آج عمیر اماں کے پاس سوئے گا۔“

مستقیم بھی کھڑا ہوا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عمیر دونوں کو باہر تک چھوڑنے اور دروازہ بند کرنے دونوں کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

یوڑھی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھیں۔ ”یارب! میرے بیٹوں کو میری وجہ سے مشکل میں نہ ڈال۔“ دو آنسو آنکھوں سے گرے اور سفید آجکل میں جذب ہو گئے۔

”بی بی!.....!“ آج پھر اماں کو آواز سنائی دی تھی۔ کچھ دنوں سے انہیں یہ آواز روز سنائی دیتی تھی مگر جب وہ اس پاس دیکھیں تو کچھ نظر نہ آتا اور وہ اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تھیں۔ مگر دہم روز تو نہیں ہوتا۔ ”کون ہو تم؟“ کمزور اور نحیف آواز میں پوچھا۔ مگر آواز میں رعب تھا۔ ”ارے کیا کوئی جن ہو؟“ اماں نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں جن کا بچہ ہوں۔“ آواز دوبارہ آئی تو اماں گھبرا گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں چھٹاؤں اور جن بھوتوں کے بہت سے قصے سنے تھے مگر ان کے ساتھ تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ جلدی سے چارپائی سے نیچے اتریں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”مستقیم کے ابا گھر میں پتہ نہیں آج کیا آ گیا ہے۔ آج تو میرا گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔“ پچھلے تین گھنٹے سے اماں قبر کے پاس بیٹھی بولے جا رہی تھیں۔

”بی بی جان میں اتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں اور آپ یہاں بیٹھی ہیں۔“ اماں کا حوصلہ بحال ہوا۔ ”ارے میری بچی مجھے کیا پتہ تھا کہ تو جلدی آئے گی آج، ورنہ میں تھوڑا جلدی آ جاتی۔“

”میں جلدی نہیں آئی بی بی جان بلکہ آج آپ کو یہاں دیر ہوگئی ہے، میں تو روز اسی ٹائم پہ آتی ہوں۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں وادا ابو سے۔“ معصوم آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”ارے بہت میں نے کیا باتیں کرنی۔“ بوڑھے چہرے پر شرم دیا کی لانی چھا گئی تھی۔

”بی بی جان آپ تو ابھی بھی وادا ابو کا نام سن کر شرماتی ہیں، جب وہ زندہ تھے تب ان کو کدھ کے کیا حال ہوتا ہوگا آپ کا۔“ مہک نے پیار سے بی بی جان کو دیکھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں میں ان کی مدد کی پھر دونوں گھر کی طرف چل پڑی تھیں۔

اماں سوچ رہی تھیں کہ مہک کو آج والی بات.....! بتائیں یا نہ بتائیں۔ بچی ہے اگر ڈرگئی تو۔

با اگر اس نے کسی کو بتا دیا تو مستقیم مہک کو آنے نہیں دے گا پھر میں کیا کروں گی۔ ابھی تو یہ تین چار گھنٹے کے لئے میرے پاس آ جاتی ہے اس کے بہانے باقی بچوں کو بھی بی بی یاد آ جاتی ہیں اور وہ بھی آ جاتے ہیں اگر بچوں نے آنا چھوڑ دیا تو میں کیا کروں گی۔ سوچ کے بہت سے رنگ اماں کے چہرے سے عیاں ہو رہے تھے۔

”بی بی!“ آدمی دوپہر کا وقت تھا، مہک ابھی

اماں کو کھانا کھلانے کے خالی برتن اٹھا کے گھر سے باہر نکلی ہی تھی کہ آواز اماں کے کانوں میں پڑی۔ اماں نے آواز کو نظر انداز کر دیا۔ سفید دوپٹہ اپنے منہ پہ ڈالا اور سوتی بن گئیں۔

”بی بی جان کچھ خدا کا خوف کریں۔ اتنی جلدی کسی کو نہیں آتی ہے؟“ آواز میں کی تھی۔

”ارے تجھے کیا پتہ منحوس! تو کون سا انسان ہے۔ انسانوں کو اتنی جلدی نیند آ جاتی ہے۔“ اماں نے منہ پہ دوپٹہ ڈالے ہی اس کی بات کا جواب دیا تھا۔

آنکھیں کھول کے دیکھنے کا فائدہ بھی کیا تھا وہ کون سا نظر آتا تھا۔ بس کچھ مہینوں سے اماں کو منحوس ہوتا تھا کہ کوئی ہے جو ہر وقت ان کے پاس رہتا ہے، جب بھی ان کو پیاس محسوس ہوتی خالی پیالے کو دیکھتیں اور وہ اچانک پانی سے بھر جاتا تھا۔

صبح کھانا مہک لے کر آتی اور تین چار گھنٹے تک ان کے پاس رہتی۔ دوپہر کے بعد سب بچے اسکول سے واپس آتے اور شام تک گھر میں خوب رونق ہوتی تھی۔ دوپہر کو اماں بہت اداس اور خود کو اکیلا محسوس کرتی تھیں مگر کچھ مہینوں سے یہ ان دیکھا وجود ان کے ساتھ اس گھر میں تھا۔ اب وہ اس سے باتیں کرتی تھیں۔ گھبراہٹ ختم ہوگئی تھی۔

”بی بی سوگئی ہو۔“ اماں کے کانوں سے آواز نکلتی تھی۔

”ارے تو مجھے بی بی کیوں کہتا ہے۔ بی بی تو میں اپنے پوتے پوتوں کی ہوں۔“ اماں نے ناگواری سے کہا۔

”تو کیا کہوں بی بی، بلیس بیگم کہا کیا کروں؟“ کمال معصومیت سے پوچھا گیا تھا۔ ”ارے شرم کر ایسے میرا نام تو کبھی مستقیم کے ابا نے بھی نہیں لیا تھا۔ چل تو بی بی عی کہہ لیا کر۔“ اماں نے احسان عظیم کیا۔

”ایک بات ہے بی بی جان۔“ ”کیا؟“ اماں نے دیوار کو گھورا۔ کیونکہ آواز اسی طرف سے آتی تھی۔ ”جتنا پیار آپ اپنے مستقیم اور

باقی بچوں سے کرتی ہیں مجھ سے اتنا نہیں کرتیں۔“ ایک شکوہ تھا اور اماں کی پوری آنکھیں کھل گئی تھیں۔

”جن بھی حد کرتے ہیں؟ اور تو کیوں جلتا ہے میرے بچوں سے؟ وہ سالوں میرے ساتھ رہے، میرے بکر گوشے میرے دل کے ککڑے اور تجھے آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اور تو میرے بچوں سے مقابلہ کرنے لگا۔“ اماں جوش میں تھی اگر سامنے کوئی وجود ہوتا تو شاید ایک آدھ ہاتھ بھی لگ جاتا۔

”جا چلا جا۔“ دفع ہو جا یہاں سے۔“ ناراضگی کا بھرپور اظہار تھا۔ اندکھیا وجود بے چین ہوا تھا۔ ”غصہ کیوں کرتی ہو بی بی اپنا مستقیم اتنا کچھ سناتا ہے اور آواز نہیں نکلتی۔ میں نے ایک بات کی اور گھر سے نکلنے کا کہہ دیا۔“

”ارے تو نے چپ نہیں کرنا تو پھر مقابلے بازی پہ اتر آیا۔ خبردار اگر میرے مستقیم کو کچھ کہتا ہو“ غصے سے اماں نے پاس پڑی ٹکڑی اٹھائی اور دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔

اماں سے کوئی لڑ نہیں سکتا اور اگر لڑے تو جیت نہیں سکتا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“ اسے مہینوں بعد آج اماں کو اس کے نام کی فکر سنائی تھی۔

”عمیرا نام آپ کو مشکل لگے گا بی بی جان آپ خود ہی کوئی نام رکھ لو۔“ کمال ادب کا مظاہرہ ہوا تھا۔

”میںنا۔“ بی بی نے فوراً نام تجویز کیا تھا۔

”کس کا نام ہے یہ بی بی جان؟ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ اماں کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ ”ارے تمہارا نام ہے اور میں نے کا مطلب ہوتا ہے بہت زیادہ عقلمند۔“ اماں نے انتہائی سنجیدگی سے نام کا مطلب بتا دیا۔

”بی بی جان آپ نے رکھا تو ٹھیک ہی ہوگا مگر جھوٹ تو نہ بولو اس عرصے میں۔ اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گی اور سوچیں مستقیم کے ابا کا سامنا کیسے کرتا ہے۔ وہ بھی جھوٹ نہیں بولے تھے۔“

بوڑھے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار



بی بی جان؟“ کافی دیر بعد فضا میں ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔

”جھے برا لگے۔ مجھے پتہ ہے۔ یہیں بھرتا رہا ہے تو کون سا کوہ قاف سے سیدھا میرے گھر آیا ہے جو جھے اس لفظ کا مطلب نہ پتہ ہوتا۔ بس مذاق کر رہی تھی میں تو۔“ اماں نے اپنی شرمندگی پر قابو پایا۔

”تو میں بھی مذاق ہی کر رہا تھا بی بی جان۔“ ایک جاندار قہقہہ فضا میں گونجا۔

”بی بی آج مہک نہیں آئی ابھی تک۔“ اماں کے چہرے پر اس کی بات سنتے ہی ناگواری اور نفرت چھا گیا۔ آج وہ بھی مہک کا انتظار کر رہی تھیں مگر اس جن نے کیوں نام لیا ان کی مہک کا؟ اسے کیا لیتا دینا؟

دل میں عجیب سے دوسوں نے جنم لیا۔ انسان اور جنوں کی دشمنی کی کئی داستانیں ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں۔ کچھ دن عجیب کشش میں گزرے۔ چاہ کر بھی اماں خود کو مطمئن نہیں کر پا رہی تھیں۔

”بی بی کیا بات ہے کچھ دنوں سے آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ میں بولتا رہتا ہوں اور آپ جواب نہیں دیتیں۔ کیا ہوا ہے؟“ آواز میں بے چینی تھی۔ اسے تو یہی لگتا تھا کہ یہ بوڑھی عورت اس کی ماں ہے۔ وہ بہت چھوٹا تھا تب سے اس بیری پہ رہتا تھا۔ اس آنکھن میں بچے قرآن پاک کی تلاوت کرتے تو وہ غور سے سنتا تھا۔ یہ گھر تو اسے بہت پیارا تھا اور یہ کمزور اور ضعیف وجود تو اس کی دنیا تھی وہ اماں کی ناراضگی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

”ایک وعدہ کر میرے بچے۔“ آج اماں نے پہلی مرتبہ اسے میرے بچے کہا تھا۔

”جی بی بی جان۔“ آواز چمک اٹھی تھی۔

”تو پہلے وعدہ کر جو میں کہوں گی تو وہ کرے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں بی بی جان جو آپ کہیں گی

میں کروں گا تا کہیں نا۔“

”تو یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلا جا۔“ بوڑھی

آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔“ کیوں



جا چکی تھی۔

”میرا بچہ۔“ زندگی بوڑھے وجود کو چھوڑ کے

جیسے باہر نکلتے ہوئے کوئی دروازے کو ہلکے سے بند کر دیتا ہے اور ساتھ ہی بوڑھا دل بھی بند ہو گیا تھا۔

”میں نے آپ کو معاف کیا بی بی جان اور آپ کا تو کوئی قصور ہے بھی نہیں، یقیناً انجانے میں مجھ سے

بی بی جان۔“ آواز ابھری تھی۔ ”کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیں بی بی جان۔“

”جھے سے کوئی غلطی نہیں ہوئی میرے بچے، میری وجہ سے تیرا دل دکھا تو مجھے معاف کر دینا۔“ شیف

آواز اور کمزور ہو گئی تھی۔

”کئی گھنٹوں تک کوئی آواز نہیں آئی۔ سارے

گھر پر سکوت چھا گیا تھا۔ بیری کے بچے بھی اداس تھے ان کے ساتھی کو دور بددی کا حکم نامہ مل چکا تھا۔ بوڑھی

آنکھوں سے موتیوں کی برسات جاری تھی۔ یہ فیصلہ ان کے لئے کون سا آسان تھا۔ دل دور سے نڈھال تھا۔ یہ اندیکھا وجود بھی تو اب اس گھر کا حصہ تھا۔ اس کی باتیں، اس کی نا اہداری، اس کی شرارتیں، سب بوڑھے ذہن میں محفوظ ہو چکا تھا۔



## شیطانی کھوپڑی

ایس امتیاز احمد - کراچی

خواب گاہ میں بستر پر نظر پڑتے ہی نوجوان دھشت زدہ ہو گیا۔ ایک انسانی کھوپڑی مردہ وجود کے سینے پر براجمان تھی اور نوجوان کا تازہ تازہ خون بستر کی اجلی چادر کو داغدار بنادیا تھا اور پھر.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ مفاد پرستی انسان کیلئے اکثر باعث نقصان ثابت ہوتی ہے۔ دل گرفتہ کہانی

**کرسٹوفر فریٹ لینڈ**۔ آتش دان کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی اور وہ اس کی جلد کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا زرد چہرہ آتش دان کی آگ کی روشنی میں بھی زرد نظر آ رہا تھا اور اس پر تفکر کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی ساری توجہ اس پرانی کتاب پر تھی۔ وہ حیران تھا کہ اس کتاب کی جلد بنانے کے لئے انسانی

کھال استعمال کی گئی تھی اور وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کھال مرد عورت یا بچے میں سے کس کی ہو سکتی ہے جب کہ کتاب بیچنے والے نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کتاب کی جلد بنانے کے لئے عورت کی کھال استعمال کی گئی ہے لیکن میٹ لینڈ کو اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

کرسٹوفر کا مشغلہ تھا کہ وہ عجیب و غریب قسم کی

چیزیں جمع کرتا تھا اور اس سلسلے میں اس نے کئی لوگوں سے مدد لی تھی، جو برسوں سے اس کے لئے کام کر رہے تھے۔ وہ خوش تھا کہ اب اس کے ذخیرے میں ایک اور عجوبہ روزگار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس بہت سی تاریخی کھوپڑیاں تھیں اور قبرستان سے چرایا ہوا خوش قسمت ہاتھ بھی۔ اس کے پاس ایسی بہت سی چیزیں تھیں، وہ غیر معمولی چیزیں جمع کرنے کا شوقین تھا۔ میٹ لینڈ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب اٹھائی اور اسے آگ کی روشنی کے قریب کر کے دیکھنے لگا۔

”عورتوں کی کھال مردوں کے مقابلے میں زیادہ نازک ہوتی ہے نا؟“ اس نے کہا۔

”میں نہیں سمجھا جناب۔“ آواز پر میٹ لینڈ نے مرکز دیکھا۔ جیم اندر داخل ہو رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ میٹ لینڈ نے پوچھا۔

”وہ شخص بھر یہاں آیا ہے۔“

”کون شخص؟“

”مسٹر مارکو۔“

”اوہ! میٹ لینڈ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لا پرواہی سے جیم کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کا باورچی تھا اسے خوشی تھی کی جیم اور اس کے دوسرے دوستوں کی طرح جو اس کے لئے غیر معمولی چیزیں لاتے تھے بلکہ اسے تو میٹ لینڈ کے جمع کئے ہوئے اس خزانے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

”مارکو ہی نام بتایا ہے نا؟“ اس نے باروچی سے پوچھا۔ ”بھلا یہ کیوں آیا ہے؟ خیر اسے اندر لے آؤ۔“ اس نے کہا اور جیم فوراً ہی داخل ہو گیا۔ میٹ لینڈ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا مارکو اب یہاں بہت جلد ہی دوبارہ آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بہت اہم بات ہے۔ مارکو اس کے لئے ہمیشہ قیمتی چیزیں لے کر آتا تھا اور میٹ لینڈ کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی اچھی چیزیں کہاں سے حاصل کر لیتا ہے مگر وہ بے سوچے میں زیادہ وقت خراب نہیں کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مارکو کا مسئلہ تھا کہ وہ قیمتی چیزیں کہاں سے اور کیسے حاصل

کرے۔

ویسے مارکو میں یہ خاصیت تھی کہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ کرسنوفر کو کیا چیز پسند آ سکتی ہے؟

”مسٹر مارکو۔“ جیم نے آکر اطلاع دی اور واپس چلا گیا۔

مارکو کمرے میں داخل ہوا تو میٹ لینڈ نے اس سے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مارکو کا جسم موٹا اور بھرا تھا، وہ ایک پراسرار سکراہٹ لیوں پر لئے میٹ لینڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن میٹ لینڈ کو ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ مارکو کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہنڈل پر مرکوز تھی، جو وہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا، یہ ایک بڑا ہنڈل تھا جو ایک کانڈھ میں لپٹا ہوا تھا۔ مارکو نے بغیر کچھ کہے وہ ہنڈل میز پر رکھا پھر اپنا ادور کوٹ اتار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھنے کے لئے میٹ لینڈ کی اجازت کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

”وہ آگ کے قریب رکھی کریسوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا پھر اس نے میٹ لینڈ کے سگار کیس میں سے سگار نکالا اور اسے سگایا۔ میٹ لینڈ کی نظر اس کی ہنڈل پر لگی ہوئی تھیں۔ مارکو میٹ لینڈ کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“ میٹ لینڈ نے پہل کی اور مارکو کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میں بغیر اطلاع کے آنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ مسٹر میٹ لینڈ مجھے امید ہے کہ آپ کی تنہائی میں ناگواری کی حد تک خلل نہیں ہوا ہوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کی پروا مت کرو یہ بتاؤ پیکٹ میں کیا ہے؟“ میٹ لینڈ نے کہا۔

”بہت ہی منتخب چیز ہے۔“ مارکو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک عجیب و غریب کھوپڑی۔“

”آخر یہ کسی عورت کی کھوپڑی یا کسی کم عمر نوجوان کی کھوپڑی یہاں لانے سے تمہارا مطلب کیا ہے۔“

”یہی بات ایک کھوپڑیوں کے ماہر نے بھی کہی تھی۔“ مارکو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں کھوپڑیوں کے ماہر کی بات نہیں کر رہا۔ مجھے اس کھوپڑی کے بارے میں بتاؤ اس میں کیا خاص بات ہے؟“ لیکن مارکو نے میٹ لینڈ کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی توجہ پھر کھوپڑی پر مرکوز کر دی اور اسے اپنے موٹے اور بھدے ہاتھوں میں لے کر پھر گھما لگا۔

”اس کا شہیہ کتنا اچھا ہے۔“ مارکو نے کہا۔

”خدا کے لئے مارکو بھلا میں اس عام سی کھوپڑی کا کیا کروں گا؟“ میٹ لینڈ نے بے زاری سے کہا۔

”پلیز! مسٹر میٹ لینڈ! کیا آپ مجھ سے ایسی توقع رکھتے ہیں۔ کیا میں ایک عام سی چیز پیش کر کے آپ کے ذوق کا مذاق اڑاؤں گا؟ اور کیا میں ایک عام کھوپڑی کے لئے آپ سے ایک ہزار پاؤنڈ مانگوں گا؟“

”ایک ہزار پاؤنڈ؟“ میٹ لینڈ نے حیرت سے کہا۔

”ہاں اور اس کی یہ قیمت بھی بہت کم ہے۔“ مارکو نے اسے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ”جب تمہیں اس کی کہانی معلوم ہوگی تو تم بخوشی یہ قیمت ادا کر دو گے۔“

”میں پنولین کی کھوپڑی کے لئے بھی یہ قیمت دینے کو تیار نہیں ہوں۔“ میٹ لینڈ نے غصے سے کہا۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس کھوپڑی کا مالک تمہاری قسمت بدل سکتا ہے۔“ مارکو نے کہا۔

”بہت ہوگی اب مسئلہ کی طرف آؤ۔“

”تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ معلوم ہو سکتا ہے اور اپنے وجود میں آنے سے پہلے کے واقعات بھی پتا کر سکتے ہو۔ یہ کھوپڑی ایک فرامیسی شیطانی صفت آدمی کی ہے مارکو میں ڈی سیڈ کی۔“

میٹ لینڈ مارکو میں سیڈ کے بارے میں جانتا تھا۔ اس کے ذہن میں مارکو میں کی ساری تاریخ حکومت

گئی۔ وہ ایک کاؤنٹ تھا اور سترہ سو چالیس میں پیدا ہوا تھا۔ جوان ہونے پر اس نے فوج میں شرکت کر لی تھی اور سات سال تک جنگوں میں حصہ لیا تھا وہ زور و رنگت اور نبلی آنکھوں والا شخص تھا اور اس میں شیطانی صفات کوٹ کوٹ کھرہری ہوئی تھیں۔

تیس سال کی عمر میں اسے ایک جرم کے سلسلے میں ایک سال کی قید ہوئی تھی۔ اس کی بہت جاںبداد تھی جو آج تک کسی کو نہیں مل سکی تھی نہ کرنا اس کی کمزوری تھی اور اپنی خوب صورتی کی وجہ سے وہ عورتوں میں مقبول تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ اس نے قید کے دوران ایک کتاب لکھی تھی جس میں سیڈسک کے بارے میں لکھا تھا جس میں جتلا ہو کر لوگ نفسیاتی مریض ہو جاتے ہیں اور خود پر اور بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس نے اپنے نظریات ترتیب دیئے تھے اور ان میں مہارت حاصل تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی عورتوں سے محبت کرتا تھا اور اس کی تمام محبوبائیں ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتر گئی تھیں۔ اس نے فرانس میں ہونے والی خانہ جنگی میں لاتعداد لوگوں کا خون بہایا تھا اور عمر کے آخری حصے میں اسے لوگوں نے پاگل تسلیم کر لیا تھا۔ اٹھارہ سو چودہ میں وہ مر گیا تھا۔ اس نے جو کتابیں لکھی تھیں وہ حکومت نے ضبط کر لی تھیں۔ اس کی جائیداد اور وصیت پر بھی حکومت کا قبضہ تھا اور وہ کسی کو نہیں دی گئی تھی صرف اس کا نام باقی رہ گیا تھا اور وہ نام بھی شیطانییت کا پہل بن گیا تھا۔ ”میٹ لینڈ نے مارکو کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھوپڑی کی طرف دیکھا۔

”تم نے ایک ہزار پاؤنڈ ہی کہا ہے نا؟“

”ہاں۔“ مارکو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت مناسب قیمت ہے اور ان حالات میں۔“

”کن حالات میں؟“ میٹ لینڈ نے پوچھا۔

”تم میرے پاس ایک کھوپڑی لائے ہو لیکن تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ مارکو میں کی کھوپڑی ہے اور تم نے اسے کیسے حاصل کیا ہے؟“

”میری بات سنو مسٹر میٹ لینڈ۔ تم مجھے جانتے



ہو۔ تمہیں میرے ذرائع جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرے تحارقی اور دل میں سے ایک ہے اور میں اپنے ذرائع کسی کو نہیں بتایا۔" مارکو نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن میں بھی صرف تمہارے الفاظ پر اعتبار نہیں کر سکتا مارکو۔ میری معلومات کے مطابق اشارہ سو چودہ میں فوت ہونے کے بعد مارکوئیس کو چیزن میں دفن کر دیا گیا تھا۔"

"تمہارا یہ کہنا درست ہے۔" مارکو نے کہا۔ "لیکن تمہارے پاس ایلمو اسٹریٹ کی کوئی کاپی ہے اس میں "محبت اور درد" کے مضمون میں ایک چیز ہے جس سے تمہیں دلچسپی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔" مارکو کی بات پر میٹ لینڈ نے الماری سے اس کی بتائی ہوئی کتاب نکالی اور اسے دی۔ مارکو اس کے ورق لٹنے لگا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ایک صفحہ پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایلمو کے مطابق مارکوئیس کی کھوپڑی کا تجزیہ ایک ماہر نے کیا تھا اور وہ اپنے زمانے کا مشہور ماہر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے مارکوئیس کی کھوپڑی کو ایک عورت کی کھوپڑی کی طرح چھوٹا پایا تھا جیسا کہ ابھی تم نے بھی کہا تھا۔"

"لیکن یہ کھوپڑی تمہیں کیسے ملی؟"

"یہ کھوپڑی کافی عرصے سے ایک ڈاکٹر فونڈ کے پاس رہی۔ پھر اٹھارہ سو پچاس میں یہ چوری ہو گئی اور اسے ایک ماہر نفسیات ہی نے چرایا تھا جو اسے انگلیٹنڈ لے گیا تھا۔ ایلمو نے اپنی کتاب میں اتنا ہی لکھا تھا اور یہی کہانی میں تمہیں بتا سکتا تھا، اوہ مارکوئیس ڈی سیڈ کی کھوپڑی حاضر ہے۔" مارکو نے کہا۔ "کیا تمہیں میری بتائی ہوئی قیمت منظور ہے۔"

"ایک ہزار پاؤنڈ؟" میٹ لینڈ نے پوچھا۔ "ایسی چھوٹی اور وہا بیت کہانی کے لئے یہ بہت زیادہ قیمت ہے۔" میٹ لینڈ نے احتجاج کیا۔

"چلو آٹھ سو ہی سہی۔" مارکو نے کہا اور میٹ لینڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ میٹ لینڈ اسے دیکھ رہا تھا اور کھوپڑی ان دونوں کو۔ "پانچ سو؟" مارکو نے قیمت اور

کم کی۔

"تم ضرور جھوٹ بول رہے ہو۔" میٹ لینڈ نے کہا۔ "ورنہ تم کبھی بھی قیمت کم نہ کرتے۔"

"تم جانتے ہو میٹ لینڈ اگر میں چاہوں تو کسی بھی قیمت پر اڑ سکتا ہوں اور تم سے اپنی بات منوا سکتا ہوں۔" مارکو نے مسکراتے ہوئے کہا، "لیکن میں یہ کھوپڑی جلد از جلد خود سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" مارکو نے کھوپڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ میٹ لینڈ سے نظریں چرا رہا تھا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ میں ایسا جیتی آکٹم رکھنے کی ہمت نہیں رکھتا بس میرا ذہن اس کے لئے تیار نہیں ہے۔"

"تمہارا ذہن؟"

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرا تقاب کر رہا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میرا ذہن ہے لیکن۔۔۔۔۔"

"تم یہ محسوس کرتے ہو کہ پولیس تمہارا تقاب کر رہی ہو؟ تو یہ درست بھی ہو سکتا ہے کیونکہ تم نے یہ کھوپڑی چرائی ہوگی۔ ہے نا مارکو؟" میٹ لینڈ نے پوچھا۔

"نہیں۔" مارکو نے جواب دیا۔ "یہ بات نہیں ہے بلکہ میں کھوپڑیاں رکھنا پسند نہیں کرتا، جب کہ تم اس بڑے گھر میں رہتے ہو اور یہاں محفوظ ہو۔ میں ایک تنگ سی جگہ میں رہتا ہوں میں تمہیں یہ کھوپڑی بیچنا چاہتا ہوں، تم اسے اپنے انتخاب میں جمع کر سکتے ہو اور جب چاہو اسے دیکھ کر خوش ہو سکتے ہو اور نہ چاہو تو یہ تمہاری نظروں سے اوجھل بھی رہ سکتی ہے یہ تمہاری پریشانی کا سبب نہیں ہوگی اور تم جیہ قیمت ادا کرو گے اس سے میں اپنے رہنے کے لئے بہتر انتظام کروں گا اور اسی لئے میں اسے فروخت کر رہا ہوں۔ بس اب پانچ سو میں سودا ہو گیا۔"

"میں ابھی سوچنا چاہتا ہوں۔" میٹ لینڈ نے

جلدی سے کہا۔ "تم مجھے اپنا پتا دے دو۔ میں تم سے بات کروں گا اور کل رات تمہارے پاس آ جاؤں گا۔" میٹ لینڈ نے جان چھڑانا چاہی۔

"ٹھیک ہے۔" مارکو نے جواب دیا اور میٹ لینڈ کو اپنا پتا دے دیا پھر اس نے بڑی جگت میں اس کھوپڑی کو دوبارہ پیکٹ میں رکھا اور کاغذ لپیٹ دیا۔

"کل میں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں ایک بات یاد رکھنا جب میرے گھر کا دروازہ کھولو تو ایک کتا تمہارا منظر ہوگا اگر کوئی بھی اس کھوپڑی کو چرانے کی کوشش کرے گا تو وہ اس کی یونیاں نوچ لے گا۔۔۔۔۔" مارکو نے کہا اور واپس چلا گیا۔

"میٹ لینڈ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نقاب پوشوں نے اسے بہت سختی سے باندھ دیا تھا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے اس کے سینے پر اسٹیل کی زنجیریں کیوں لپیٹ دی تھیں پھر ان دونوں نقاب پوشوں نے جلتی ہوئی سلاخوں سے اسے داغنا شروع کر دیا تھا اور اس نے سختی سے پنے دانت بھینچے ہوئے تھے پھر چانک جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی تھی۔ نقاب پوش اسے محسوس رہے تھے پھر انہوں نے اسے ایک اسٹیل کے فرش پر لٹا دیا تھا اور اسے کانٹوں سے زخمی کر رہے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں تھا بلکہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا جو بڑبڑاتے ہوئے تھا اور نہ ہی وہ سانس لے رہا تھا پھر اچانک وہ میٹ لینڈ سے قریب آتا چلا گیا اور جب اس نے میٹ لینڈ کا جسم چھوا تو اسے موت کی سی ٹھنڈک محسوس ہوئی اب وہ جسم میٹ لینڈ سے اتنا قریب تھا کہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا جو بالکل سفید تھا۔ وہ ایک دھندلا سا آنکھ کا چہرہ تھا اس کے خدوخال نمایاں نہیں تھے اور پھر جیسے ہی اس جسم نے دوبارہ اس کے جسم کو چھوا اس سر نے میٹ لینڈ کے سر کو چھوا جیسے ہی اس کے ہونٹ اس انسانی جسم کے ہونٹوں سے ٹکرائے تو خوف اس کی

رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ وہ چیز ایک کھوپڑی تھی اور وہ کھوپڑی مارکوئیس ڈی سیڈ کی تھی۔

پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھلی تھی اس نے کسی کو بھی اس خواب کے بارے میں نہیں بتایا اور اسی روز سر فٹنگ سے ملا۔

"مجھے مارکو پر بھروسہ ہے لیکن میں حیران ہوں کہ وہ اس کھوپڑی کو خود سے جدا کیوں کرنا چاہتا ہے؟"

"میٹ لینڈ نے اسے کھوپڑی کی کہانی سنانے کے بعد کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم اس شے کے ماہر ہو چنانچہ جب میں مارکو کے پاس کھوپڑی لینے جاؤں تو تم میرے ساتھ چلنا اور اس کھوپڑی کی جانچ کر لینا۔"

"اس کی جانچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" فٹنگ نے کہا۔ "مجھے یقین ہے تم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی روشنی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ کھوپڑی مارکوئیس ڈی سیڈ ہی کی ہے۔"

"تمہیں اس بات پر کیسے یقین ہے؟"

"میرے دوست کیونکہ وہ کھوپڑی میرے ہی پاس سے چرائی گئی ہے۔" فٹنگ نے کہا۔ "کیا؟"

"ہاں! اور یہ کام دس دن پہلے ہی ہوا ہے۔ میرے گاڑن میں کھلنے والی کھڑکی سے ایک شخص میری لائبریری میں داخل ہوا میرے کسی ملازم کی آنکھ نہیں کھلی اور وہ رات کی تاریکی میں کھوپڑی لے کر فرار ہو گیا ہے۔"

"حیرت ہے۔" میٹ لینڈ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم میرے ساتھ تو چلو گے ناں ہم دونوں اس کو شناخت کریں گے اور مارکو حقیقت بتائیں گے اور کھوپڑی بھی واپس لے آئیں گے۔"

"نہیں۔" فٹنگ نے جواب دیا۔ "اس کھوپڑی کے چرائے جانے پر مجھے خوشی ہوئی ہے اور میرا مشورہ ہے کہ تم بھی اس سے دور رہی ہو۔ میں نے پولیس میں بھی اس کی چوری کی رپورٹ درج نہیں کرائی اور نہ ہی ایسا کرنے کا میرا کوئی ارادہ ہے کیونکہ وہ

”کھوپڑی..... منجوس ہے۔“

”منجوس؟“ میٹ لینڈ نے حیرت سے پوچھا۔  
”تمہارے پاس مصر کی میاں بھی ہیں اور بہت سی  
ذخیرہ ہے اور کم کیا کہہ رہے ہو کہ وہ کھوپڑی منجوس ہے؟  
تم نے پہلے تو کسی چیز کے لئے ایسی بات نہیں کی۔“

”تمہارا کہنا درست ہے۔ میں یہ بات تم سے  
تب ہی کہہ رہا ہوں جب میں نے یقین کر لیا ہے کہ یہ  
کھوپڑی واقعی خطرناک ہے اور تمہیں میرے الفاظ پر  
یقین کرنا چاہئے۔“

میٹ لینڈ حیرت سے اس کی بات سن رہا تھا اور  
سوچ رہا تھا کہ شاید اس نے بھی میٹ لینڈ کی طرح  
ڈراؤ نے خواب دیکھے ہوں گے اسی لئے ایسی بات کہہ  
رہا ہے۔

”میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی، میں تو  
سمجھا تھا کہ تم فوراً اس کھوپڑی کو واپس حاصل کرنا چاہو  
گے۔“ میٹ لینڈ نے کہا۔

”میٹ لینڈ تم اس کھوپڑی کے متعلق بھی جانتے  
ہو اور اس کے مالک کی شیطانی قوتوں کے متعلق بھی اور  
تم پھر بھی اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو جب کہ کوئی صحیح  
الہ مارغ آدمی اس کو خریدنے کے بارے میں سوچ بھی  
نہیں سکتا۔“ فٹنرگ نے کہا۔ ”میں تمہیں خوفزدہ کرنا  
نہیں چاہتا۔“ اس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

”لیکن میں بھی اس کھوپڑی کی تاریخ سے  
واقف ہوں یہ بہت سے لوگوں کے ہاتھ سے گزری ہے  
ان میں کچھ پرانی چیزیں جمع کرنے کے شوقین تھے اور  
کچھ جاوادی نظریوں سے متعلق تھے یہ جن جن لوگوں کے  
پاس گئی وہ موت سے ہلکا ہوتے چلے گئے۔“

لیکن یہ میرے پاس توا اتفاق سے آگئی۔

میرے پاس بھی چھ ماہ پہلے ایک شخص لے کر آیا  
تھا۔ ”فٹنرگ نے کہا۔“ اس نے یہ کھوپڑی مجھے قیمتا  
نہیں بلکہ تحفے میں دی تھی کیونکہ وہ اسے خوفزدہ تھا  
اور اس وقت میں اس کے بھائی پر ہنسنا تھا۔ باقی ایسے ہی  
جیسے اس وقت تم میرا مذاق اڑا رہے ہو لیکن ان چھ بیٹوں

میں جب تک یہ کھوپڑی میرے پاس رہی میں پریشان  
نہی رہا۔ میں خوفناک خواب دیکھا رہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ  
ڈی سیڈ پاگل نہیں تھا اور میں ان پر یقین کرتا ہوں وہ  
پاگل نہیں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا اس میں  
کوئی چیز غیر انسانی تھی جو دوسروں کو متاثر کرتی تھی اور  
وہی چیز اس کھوپڑی میں بھی ہے۔ جتنے عرصے یہ کھوپڑی  
میرے پاس رہی مجھے طرح طرح کی فون کا لڑ بھی آتی  
رہیں اور عجیب و غریب خط بھی اور میرے بعض ملازموں  
نے رات کو کچھ سائے بھی گھر میں چلنے دیکھے۔“

”ہو سکتا ہے وہ عام چور ہوں۔ مارکو کی طرح اور  
انہیں کسی چیز کی تلاش ہو۔“ میٹ لینڈ نے کہا۔

”نہیں۔“ فٹنرگ نے آہ بھری۔ ”ان ساروں  
نے اس کھوپڑی کو تلاش کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ  
کیا۔ وہ رات کو میرے گھر میں آتے تھے اور اسے  
استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کھوپڑی کو میں شیشے کے  
ایک کس میں رکھتا تھا تاہم ہر وقت وہ اپنی جگہ سے ہلکی  
ہوئی ہوتی تھی۔ بعض اوقات شیشے کا کس ٹوٹا ہوا تھا اور  
کھوپڑی میز پر رکھی ہوتی تھی۔“

ایک بار وہ فرش پر تھی۔ میں نے ملازموں سے  
بھی پتا کیا تھا لیکن ان میں سے یہ کسی کا کام نہیں تھا۔ یہ  
کسی باہر کے شخص کا ہی کام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس  
کھوپڑی کے چاہنے والے میرے گھر میں آکر اس کی  
عبادت کرتے تھے اور جب وہ چوری ہوئی تو مجھے بہت  
خوشی ہوئی تھی۔ میرا تو تمہیں یہی مشورہ ہے کہ تم اس  
سلسلے میں دور ہی رہو اور مارکو سے مت ملو۔“

”بہت بہتر۔“ میٹ لینڈ نے سر ہلاتے ہوئے  
کہا۔ ”میں اس تنبیہ پر تمہارا شکر گزار ہوں۔“ اس نے  
کہا اور فٹنرگ سے رخصت ہوا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ مارکو کے دروازے پر کھڑا  
تھا۔ مارکو کا دروازہ لاک تھا اور اندر سے طرح طرح کی  
آوازیں آرہی تھیں۔ فٹنرگ کی دانتک نے اسے  
ہوشیار کر دیا تھا اور وہ اپنے ساتھ اپنا رپوٹور لایا تھا جس  
سے اس نے دروازے کا لاک توڑ دیا اور دروازہ کھول کر

کمرے میں دیکھنے لگا۔

اچانک کوئی چیز اس کی طرف آئی اور اس سے  
ٹکرائی وہ بچے گر گیا۔ گرنے سے پہلے اس نے فائر بھی  
کیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو مارکو کا کتا اس  
کے پاس پڑا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ مارکو نے پہلے ہی  
اسے اس کتے سے خبردار کیا تھا کہ جو کوئی کھوپڑی لینا  
چاہے گا کتا اس پر حملہ کر دے گا لیکن اس کی وجہ میٹ کی  
سجھ سے باہر تھی۔ وہ اٹھا اور بیڈروم کی طرف بڑھ گیا  
جہاں مارکو کا بستر تھا اور اس پر بے شمار شکنیں تھیں اور  
قریب ہی مارکو کی لاش پڑی تھی۔

میٹ لینڈ حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر اس کی  
نظر کھوپڑی پر پڑی جو مارکو کے قریب ہی پڑی تھی جس  
پر جگہ جگہ خون لگا تھا۔ میٹ لینڈ کو پہلی بار کھوپڑی کی  
تاریخ پر یقین آیا اور اسے اس کی شیطانی قوت کا یقین  
ہو گیا۔ کھوپڑی میں عجیب سی چمک آگئی تھی اسے مارکو کی  
بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس نے کھوپڑی کو اٹھا لیا اور کافی  
دیر اسے دیکھا رہا اور پھر کمرے سے نکل آیا اس کے  
ہاتھ میں کھوپڑی اسی طرح موجود تھی۔ وہ بڑی عجلت میں  
تھا اور خوفزدہ تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے چلا جانا چاہتا  
تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس وہاں پہنچ جائے اور میٹ  
لینڈ کو مارکو کے قتل کے شبے میں گرفتار کر لے۔ اسی خوف  
کے زیر اثر وہ اپنے گھر میں سائیڈ ڈور سے داخل ہوا تھا  
اور کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ وہ کھوپڑی بھی  
لے آیا ہے جو مارکو اسے دینا چاہتا تھا۔

اس شام میٹ لینڈ پر خوف سوار رہا۔ میز پر  
کھوپڑی اس کے سامنے رکھی تھی اور وہ اسے گھور رہا تھا  
اور کسی اطمینان کے خوف سے کانپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا  
کہ فٹنرگ کچھ کہہ رہے تھے اس کھوپڑی کی قوتوں نے  
میٹ لینڈ کو بھی متاثر کیا تھا اور اس نے اپنے عزیز  
دوست کی تنبیہ پر بھی یقین نہیں کیا تھا اور اس کھوپڑی ہی  
کی قوتوں نے اسے ایک مردہ شخص کے پاس سے  
چرانے کی جرأت بخشی تھی اور اب اسے ایک کمرے میں  
تجاہد ہونے پر مجبور کر دیا تھا ایک لمحے کو اسے خیال آیا

کہ اسے پولیس کو فون کر دینا چاہئے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ  
اس کھوپڑی کو کہیں دور لے جا کر بھینک سکتا ہے لیکن کوئی  
چیز تھی جو اسے روک رہی تھی وہ تمام حقیقتیں جاننے کے  
باوجود بھی اس کھوپڑی کے سامنے بے بس بیٹھا تھا اور  
اسے گھور رہا تھا وہ اس سے ہارنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود  
میں اسے تباہ کرنے کی طاقت بھی نہیں پارہا تھا۔ اسے  
یقین تھا کہ وہ پاگل ہو جائے گا پھر اسے ایک خیال آیا  
جس نے اسے موت کے خوف سے آزاد کر دیا۔

اس نے دلی برداشت ہو کر شراب پی اور فرش پر  
لیٹ گیا۔ اسے غینہ آ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ صبح اس کا  
ذہن جھٹکنے سے آزاد ہو چکا ہوگا اور وہ اس مسئلے کا ضرور  
حل ڈھونڈ نکالے گا۔ اسے سرفٹرگ کی باتوں نے  
پریشان کر دیا تھا اور آج دوپہر کے واقعے نے اس کی  
ہمت توڑ دی تھی۔

وہ مارکو کی کھوپڑی کے بارے میں سوچ سوچ  
کراپنے ذہن کو پریشان کرنے کے بجائے سوچنا چاہئے  
تھا تاہم صبح تازہ دم ہو کر کوئی فیصلہ کر سکے مجرہ اٹھ کر اپنے  
بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد اس نے لائن بھی آف  
کردی۔ کھڑکی میں سے چاند کی کرنیں اس کے بستر پر پڑ  
رہی تھیں۔ ان کرنوں میں میز پر رکھی ہوئی کھوپڑی چمک  
رہی تھی اور میٹ لینڈ اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے آنکھیں  
بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے سوچا  
سرفٹرگ کو فون کرے گا اور یہ کھوپڑی ان کے مشورے  
سے ملک کے عجائب گھر میں رکھواوے گا۔

پھر سونے سے پہلے اس کی نظریں کسی پریشان  
کردینے والی چیز سے ٹکرائی تھیں اسے یوں لگ رہا تھا  
جیسے وہ مارکو کے کمرے میں ہے اور اس کا کتا اسے گھور رہا  
ہے۔ کتے پر خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا اور یہ حیرت کی  
بات تھی کیونکہ میٹ لینڈ کی گولی لگنے کے بعد وہ مر گیا تھا  
اور اس کے جسم سے خون بھی نکلا تھا پھر اس کتے نے  
میٹ لینڈ کے گلے پر کاٹا تھا لیکن خون نہیں نکلا تھا۔ یہ  
میٹ لینڈ کے لئے حیرت کی بات تھی۔

پھر اس نے یہ مسئلہ بھی صبح کے لئے اٹھا رکھا،





## ہیر وئن

الین حبیب خان - کراچی

ایک پڑیا میں موجود راکھ کو جب لڑکی کے قدموں میں ڈالا گیا اور پھر جیسے ہی وہ لڑکی اٹھ کر اس راکھ پر سے گزری کہ اچانک وہ چکر اکر زمین بوس ہو گئی اسے خون کی الٹیاس شروع ہو گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی ساکت ہو گئی۔

جادو کی کہانیاں پڑھنے والوں کیلئے ایک عجیب و غریب داغ پرستہ طاری کرتی خوفناک کہانی

کہ ایک بہت بڑے ڈائریکٹر کو اپنی فلم کے لئے نئے چہرے کی تلاش ہے۔ اس نے جانے کن کن لوگوں کی خوشامد کی تب کہیں جاکر ڈائریکٹر سے ملاقات طے ہوئی۔ اس رول کو حاصل کرنے کے لئے اسٹریٹ کی کئی اور لڑکیاں بھی ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔

”شیام مکرمی“ نے ملاقات کے لئے اپنے آفس میں سب کو بلایا تھا، کاشی جب وہاں پہنچی تو بہت

”مان“ مجھے آنے میں شاید تھوڑی دیر ہو جائے تم چقا مت کرنا اور بھوجن سے پر کر لینا۔“ کاشی نے ساڑی کا پلو شانے پر درست کرتے ہوئے کہا اور گھر سے نکل گئی۔ کاشی اسٹریٹنگ ایکٹریس تھی۔ فلموں میں چھوٹے موٹے رول کر کے وہ اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پال رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اسے ایک فلم میں ”لیڈ رول“ ملنے کی امید ہوئی تھی، اسے معلوم ہوا تھا

بچ کر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

جونہی کلاک ٹاور نے شب کے 10 بجے کا گھر بجایا وہ ریو لور اپنی جیب میں رکھ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدموں کا رخ سیٹ لینڈ کے گھر کی طرف تھا۔ وہ میٹ لینڈ کی فطرت سے بخوبی واقف تھا اس لئے اسے یقین تھا کہ اب تک میٹ لینڈ وہ کھوپڑی حاصل کر چکا ہوگا اور پھر چودھویں چاند کی یہ شب بھی اس کے ذہن میں کھٹک کر اس کو کسی انجانے خطرے کا احساس دلانا ہی تھی۔ اسے شیطانی کھوپڑی سے منسوب ہلسٹر اسٹڈیز کے بعض حوالے یاد آ رہے تھے۔

میٹ لینڈ کے گھر پہنچ کر فٹرگ کافی دیر تک دروازے پر دستک دیتا رہا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ فٹرگ نے ہینڈل کو گھمایا تو دروازہ کھلا چلا گیا دروازے اور کھڑکیوں سے درآئے دانی چاندنی نے کمرے کے تاریک ماحول پر ایک عجیب سا سحر طاری کر دیا تھا۔ فٹرگ نے جیب سے ریو لور نکالا اور اندھیرے ہی میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا میٹ لینڈ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

خواب گاہ کے اندرونی منظر پر نگاہ پڑتے ہی فٹرگ دہشت زدہ سا ہو گیا۔ اس نے فوراً لائٹ آن کر دی۔ کمرہ روشن ہوتے ہی میٹ لینڈ کا مردہ بدن نمایاں ہو گیا۔ اس کی گردن سے بہتے خون نے بیڈ کی اجلی چادر کو رنگ دیا تھا اور مارکوئیس سیڈ کی شیطانی کھوپڑی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ اس کے سینے پر براجمان تھی۔ زرد کھوپڑی پر پڑتی روشنی نے اس کی پراسراریت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

فٹرگ نے دیوانگی کے عالم میں شیطانی کھوپڑی کو میٹ لینڈ کے مردہ بدن سے اٹھا کر فرش پر پٹنا اور پھر ریو لور سے نشانہ لے کر پورے گولیاں چلا کر ریو لور خانی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں کھوپڑی ریزہ ریزہ ہو کر کھڑ گئی۔



اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ جیسے ہی سوئے گا اسے خواب نظر آتا شروع ہو جائے گا پھر ایسا ہی ہوا وہ چاندنی رات میں میز پر رکھی ہوئی کھوپڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ یہ چیز اس کے لئے حیران کن تھی کوئی بھی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی وہ خود اٹھا تھا۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے تو وہ یہ دیکھ کر ضرور اٹھ بیٹھتا کہ کمرے میں چاندنی کا ور یا ہیر رہا تھا اور اس میں کھوپڑی تیر رہی تھی، وہ بار بار گھوم رہی تھی اور اس کے بستر کے قریب آتی جا رہی تھی اور پھر جب وہ کھوپڑی بستر کے قریب فرش پر گر گئی تو اس کی آواز میٹ لینڈ کے سوتے ہوئے کانوں نے بہ خوبی سنی تھی پھر اور خوفناک خواب شروع ہو گیا تھا۔

کھوپڑی بستر پر چڑھ آئی تھی۔ اس کے دانتوں نے بستر کی چادر کو پکڑ لیا تھا اور پھر جھول کر بستر پر اس کے قدموں میں آگری تھی۔ اسے اس کھوپڑی کے گرنے کی دھمک محسوس ہوئی تھی پھر وہ بستر پر لڑھکنے لگی تھی اور اس کے سینے کے قریب آ گئی تھی۔ اسے چاندنی میں کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کی گردن سے چھانچ کے فاصلے پر تھی پھر اسے گلے پر تھوڑا سا دباؤ محسوس ہوا کھوپڑی اب حرکت کر رہی تھی پھر وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور خواب ٹوٹ گیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی لیکن باہر نہیں آ سکی۔ اس کی گردن پر کھوپڑی کے دانت پیوست ہو چکے تھے جو ایک انسانی قوت کے ساتھ اس کی گردن کو کاٹ رہے تھے۔ اس کے زخروں سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں جو جلد ہی معدوم ہو گئیں۔

اس کے بعد کھوپڑی میٹ لینڈ کے سینے پر چلی گئی تھی۔ اس کا سینہ اب سانس لینے سے مل نہیں رہا تھا۔ وہ ساکت ہو چکا تھا اور کھوپڑی اس پر موجود تھی۔ چاندنی کھوپڑی پر پڑ رہی تھی جس سے اس کے خدو خال نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کھوپڑی میں بے تماشاجک محسوس ہو رہی تھی جو آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔

میٹ لینڈ کے جانے کے کافی دیر تک فٹرگ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا رہا اور پھر شاید کسی خیال پر

ساری لڑکیاں پہلے سے ہی وہاں موجود تھیں۔ ان میں گیتا نام کی بھی ایک لڑکی تھی جو کہ بہت خوب صورت تھی۔ کاشی سے ایک دوسرے اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ کاشی کا دل گھبرا رہا تھا۔ اتنی ساری لڑکیاں اور رول ایک، اگر شام تک میری خوب صورت لڑکی درکار ہوئی تو میرا کیا ہوگا؟“ کاشی نے سوچا کیونکہ وہ معمولی شکل کی تھی ہاں مگر ٹینٹ کی اس میں کوئی کمی نہ تھی۔

لڑکیاں ایک کے بعد ایک آڈیشن دینے لگیں۔ پھر گیتا کی باری آئی، اسے واپس آنے میں کاشی دیر لگی، جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس نے کاشی اور دوسری لڑکیوں کی جانب دیکھ کر غور سے کہا۔ ”دیکھ لو جا کر تم لوگ، دیے مجھے نہیں لگتا کہ میرے آڈیشن دینے کے بعد تمہارے اندر جانے کا کوئی فائدہ ہوگا۔ یہ رول تو دیکھنا مجھے ہی لگے گا۔“ اور بال لہرائی ہوئی چلی گئی۔ کاشی کے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے یہ سب سن کر کہا۔ ”رام، رام کتنا غور ہے اسے، ابھی تو کچھ ہی بھی نہیں اگر بن گئی تو جانے کیا حال ہوگا۔“ اسے میں کاشی کی باری آگئی۔

کاشی نے آڈیشن دیا اور جب باہر آ کر گھڑی دیکھی تو دس بجنے والے تھے۔ وہ جلدی جلدی گھر پہنچنا چاہتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کہنے کے باوجود اس کی ماں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا تو ماں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ”ماں! میں تم بھی۔“ کاشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چل ہاتھ منہ دھو لے میں کھانا پڑھتی ہوں۔“ کاشی نے ہاتھ منہ دھو یا اور پانی مار کر نیچے پھینکی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ تھائی میں ابلے چاول اور کٹوری میں دال تھی۔ کاشی نے ہاتھ سے نوالہ بنا کر منہ میں رکھا۔ ”پتر ہوگئی تو فلم کے لئے یک۔“ ماں نے پوچھا تو کاشی ہنسنے لگی۔

”جادو ٹھوڑی ہے ماں، جانتی ہو کتنی لڑکیاں آئی تھیں وہاں مجھے تو بہت مشکل لگ رہا ہے کہ میں چن لی جاؤں گی۔“ کاشی کی ہنسی اس بات پر پھٹکی ہوئی۔

”نراش مت ہو پتر! دیکھ ناں بھگوان کی کرپا

سے تو ہی چنی جائے گی۔ میں تیرے لئے پراختہ کر رہی تھی جب تو ڈائریکٹر سے ملنے گئی تھی۔“ اور پھر دونوں ماں بیٹی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گئیں۔

اگلے روز شام سکرہ جی کے سکرٹری نے کاشی کو بلوایا اور اسے خوشخبری سنائی کہ اس رول کے لئے کاشی سلیکٹ ہو گئی ہے۔ کاشی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کتنی محنت کے بعد آج اسے کامیابی مل گئی۔ یہ سب میری ماں کی پراختہ کا پھل ہے۔“ اس نے سوچا تو اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی ماں کا منہ میٹھا کر لیا تو ماں نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

”بھگوان تجھے کامیابی دے!“ شونگ تین دن بعد تھی۔ کاشی سے یہ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا کہ کب شونگ شروع ہو اور وہ مین ہیرو بنے۔

ادھر گیتا ایک سادھو کے سامنے بیٹھی تھی۔ ”کچھ بھی کرو مہاراج مگر میرے راستے کے کاٹے کو نکال دو۔“ گیتا نے سر جھکائے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے سیاہ رنگت والے آدمی سے کہا جس کے بال اور ناخن میل سے لٹھڑے ہوئے تھے اور وہ آنکھیں بند کئے آگ میں کچھ ڈال رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور غصے سے کہا۔ ”کیا تجھے ہماری بھکتی پر بھروسہ نہیں رہا یہ جو سن تو لے کر بیٹھی ہے کس نے دیا ہے تجھے؟ بول تو ابھی چین لوں یہ خوبصورتی تجھ سے۔“

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی! مجھے شکر دیجئے۔“ گیتا نے فوراً ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل اتنا سبب کرنے کے بعد بھی رول کی اور کوئل گیا اس لئے میں جذبات میں آگئی ورنہ میں تو آپ کے چرنوں کی دھول، آپ کی داسی ہوں۔“ گیتا بولی۔

”ہوں! اس بار بھی تجھے کڑی محنت کرنا ہوگی۔ بول کر رہے گی؟“ وہ سیاہ آدمی بولا۔

”فلم میں کام کرنے کے لئے میں کچھ بھی کر گزروں گی۔“ گیتا بولی۔

”ٹھیک ہے تو پھر غور سے سن۔ آج سے دونوں

بعد پورن ماشی ہے، اس روز جو بھی مردہ مرگھٹ میں جلانے آئے۔ رات میں تجھے وہاں بیٹھ کر اور ایک دیا جلا کر تجھے چاہ کرنا ہوگا اور سن جاں مکمل ہونے کے بعد اس جگہ کی رکھ جگ کر کے میرے پاس لانا ہوگا۔ باقی میں خود کچل لوں گا۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں۔“ اور گیتا وہاں سے چلی گئی اور پھر اس نے وہ سب کر دکھایا جو اس سے کہا گیا تھا اور راکھ دینے میں جمع کر کے لے آئی۔ جب وہ آگئی تو وہ سیاہ آدمی آگ روشن کئے کچھ مکمل کر رہا تھا گیتا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کو گیتا کی آمد کا پتہ چل گیا۔

”بڑی بھگوانی ہے تو! جو کر گزری اس عمل کو۔“ اس نے اپنے پیلے میل گندے داخنوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ گیتا نے راکھ سے بھر دیا اس کے چنوں میں رکھ دیا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ ”عمل تو کروا لے گی مگر اس کے بدلے۔“ اس آدمی نے مکاری سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”آپ نکرمت کریں، جو آپ بولیں گے میں وہ کروں گی۔“ گیتا نے کہا تو آدمی خباثت سے مسکراتے لگا۔ پھر اس نے ایک تھالی میں ٹھوڑی سی رائی کی اور دینے میں موجود راکھ اس میں ڈال دیا۔ تھالی اس کے آگے تھی اور اس کے ہونٹ مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

پھر اس نے گیتا کا ہاتھ پکڑا اور اس کی انگلی پر کٹ لگا کر اس کے خون کے قطرے اس میں پکڑائے۔ اس کے ہونٹ مسلسل مل رہے تھے۔ پھر اس نے رک کر تھالی میں تھوک دیا اور پھر آنکھیں کھول کر گیتا کی جانب تھالی بڑھائی۔ گیتا نے تھالی میں جھانکا تو اس میں ننھے ننھے سانپ رینگتے ہوئے نظر آئے۔ ”یہ اس جگہ بکھیر دینا جہاں اس کے قدم پڑتے ہوں، تیرا کام ہو جائے گا۔“ اس سیاہ آدمی نے کہا۔

”مجھ کے وقت کاشی نے کہا۔“ ماں میں جاری ہوں۔“ اور شونگ کے لئے نکل گئی۔

آج کاشی کا ایک ایووشل سین تھا۔ کاشی نے

اس میں انتہائی شاندار ایکٹنگ کی تھی لگ نہیں رہا تھا کہ وہ ہی ہے اس نے بالکل نیچرل طریقے سے سین کیا اور پہلے ٹیک میں ہی سین اد کے ہو گیا۔

”ویڈن! کاشی کیپ اسٹ اپ۔“ شام سکر جی نے کاشی کے پاس آ کر اسے داد دی۔ آدھے گھنٹے کا بریک تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اس کا منہ دوسری طرف تھا کہ اسے کسی کے آنے کا احساس ہوا، اس نے پلٹ کر منہ اڑھ کر کیا تو دیکھا کہ سامنے وانی کرسی پر گیتا بیٹھی ہوئی مسکراتی تھی۔ ”کیسی ہو کاشی؟“ گیتا نے پوچھا۔

”سب رام کی کرپا ہے، میں اچھی ہوں۔“ کاشی نے آسان کی جانب منہ اڑھا کر کہا۔ کاشی دل میں حیران تھی کہ گیتا جیسی مغرور لڑکی کو کیا بڑی جو کاشی کا احوال پوچھ رہی تھی۔ ”میں تو نہیں بدھائی“ دینے آئی تھی ہیروئن بننے پر۔ گیتا نے کاشی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ”غیر محسوس انداز میں رائی کے دانے کاشی کے پیروں کے پاس بکھیر دیے۔

”دھن دوا گیتا!“ کاشی نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

”ویوی جی! آپ کو صاحب بلار ہے ہیں شات ریڈی ہے آجائیں۔“ ایک اسپاٹ بوائے نے آ کر کہا تو کاشی کھڑی ہو گئی۔

”اچھا گیتا میں جارہی ہوں۔“ کہتی ہوئی بکھری ہوئی رائے کے دانے پر پیر رکھ کر گزرتی چلی گئی اس کے پیچھے گیتا مکارانہ انداز میں ہنستی ہوئی اٹھ کر وہاں سے چل دی۔

کاشی نے میک اپ کی ٹیم کی اور کمرے کے سامنے آگئی کہ اچانک کاشی چٹخیں مارتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ ”اس کے پیروں کے کوؤں پر گہرے گہرے کٹ موجود تھے جن سے خون رسنے لگا تھا پھر کاشی کے کانوں سے خون بہنے لگا۔ گر کوئی حیران پریشان تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پھر کاشی کو زور دار ابکا پی آئی اور اس نے خون کی اٹلی کر دی یہ تو شروعات تھی۔ ایک کے بعد دوسری..... خون کی گلیاں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی



تھیں اور اسپتال جانے سے پہلے ہی کاغذی خون تھوکتے تھوکتے مر گئی۔ سب کو ساپ سوکھ گیا کہ پل میں کیا سے کیا ہو گیا۔ کاغذی کی ماں بھی اس کی موت کی خبر سننے ہی بھگوان کو پیاری ہو گئی۔

تین دن بعد گیتا ڈائریکٹر شام جی کے گھر گئی اور ان کی فلم کے رکنے اور کاغذی کی موت پر انھوں نے گئی۔ پھر اس نے آکھ بچا کر ایک پڑیا میں موجود سفوف شام مکر جی کی چائے میں ملا دیا اور اس کے وہاں سے اٹھنے سے پہلے ہی اس کے عمل نے اثر کر دیا اور شام مکر جی نے گیتا کو کاغذی کی جگہ فلم کی ہیروئن چن لیا۔ گیتا ڈھٹائی سے کاغذی کی جگہ لے کر خوش تھی اور اسے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

دوسرے دن گیا کنوئیں کی منڈیر پر چڑھی کہہ رہی تھی۔ ”تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا کیلاش! میں اپنے پرانے تیاگ کر تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گی نہیں رہنا مجھے اس سنا رہی۔“

”کٹ! ڈائریکٹر نے شاٹ اوکے کر دیا۔“

گیتا مسکراتی ہوئی کنوئیں کی منڈیر سے اترنے لگی اور بے دھبیان میں اس کا تیر بھلا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ پہلے اس کا سر کنوئیں کی منڈیر سے ٹکرایا اور وہ کنوئیں میں جا پڑی۔

جب گیتا کو باہر نکالا گیا تو وہ سر پکٹی تھی۔ فلم پھر رک گئی۔ ڈائریکٹر نے پھر ہی ہیروئن تلاش کی مگر شوٹنگ کے پہلے ہی روز شیٹ پر آگ لگ گئی، ہیروئن کی سازی نے بھی آگ پکڑ لی وہ جان بچانے کے چکر میں ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور پھر منہ کے بل گری اور راضی ہوئی سیر جیوں سے نیچے آ گئی۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئی۔

شام مکر جی اپنا سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور پھر فون پر خوش خبری سن کر کئی لڑکی مل گئی ہے۔ ان کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا ابھی انہوں نے ریسپورر رکھا ہی تھا کہ ان کے بال پیچھے سے اڑے، ہوا کا ایک تیز جھونکا گزرا تھا، ان کی پشت پر، وہ سمجھے کہ کھڑکی

کھلی ہے، انہوں نے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی بند تھی، وہ سر جھٹک کر سگار جلانے لگے، پھر انہیں انی گردن کے گوشت پر گرم ہوا محسوس ہوئی، ساتھ ہی کسی کے سانس لینے کی آواز بھی آئی، انہوں نے پھر پلٹ کر دیکھا اس بار ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، ایک دم انہیں اپنے سینے میں شدید تکلیف کی ایک لہر محسوس ہوئی انہوں نے بے اختیار اپنے دل کے مقام کو اپنے ہاتھ سے قلم لیا۔ تکلیف شدید سے شدید تر ہو گئی اور وہ زمین پر گر پڑے اور ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور یوں وہ پر لوک سدا ہار گئے۔

شام مکر جی نہ رہے تو فلم بند ہو گئی اور اس کا اسکرپٹ شام مکر جی کے گھر والوں نے ان کے سامان میں رکھ دیا۔ ان کے گھر والوں کو فلم سے کوئی دلچسپی نہ تھی، شام مکر جی کی بچی غیر ملکی تھی اور اپنے بچوں کے ساتھ باہر ہی رہتی تھی۔ یوں شام مکر جی کے ساتھ ان کی فلم بھی چلی گئی۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ شام مکر جی کا بنگلہ بننے لگا۔ ”آپ بنگلہ دیکھئے پھر فیصلہ کیجئے گا۔“ ایجنٹ نے گاڑی سے اترتے ہوئے رومی سے کہا۔ ”سر جی! آپ سے پہلے جو مالک تھے انہوں نے بڑے شوق سے خریدا تھا اس بنگلے کو، یہ ہے ہی اتنا خوب صورت پارسی دور کی طرز تعمیر ہے اس بنگلے کی مگر مالک کی زندگی نے وفات کی جو وہ زیادہ عرصے اس بنگلے میں رہتے آپ کو چاہی ہے وہ کون تھے؟“ ایجنٹ نے رومی کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں معروف ڈائریکٹر شام مکر جی۔“ رومی نے لا پرواہی سے لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ ایجنٹ چند لمبے خاموش ہوا پھر بولا۔ ”شام مکر جی نے اپنی زندگی کا آخری وقت اسی بنگلے میں گزارا تھا۔“

”تم شام مکر جی کو چھوڑو، میری بات سنو۔“ رومی نے روکھے انداز میں کہا جو اس کی شہرت کے باعث اس کے الفاظ میں رجسٹر ہو گیا تھا۔ ”جی! ایجنٹ تسلیل کر بولا۔

”بنگلہ مجھے پسند آ گیا ہے! پیپر ریڈی کر کے

لے آؤ، بے منت ہاتھ کے ہاتھ ہو جائے گی۔“ رومی نے کہا۔

”پیپر ریڈی ہیں، آپ کہیں تو آج شام کو ہی لے آؤں۔“ ایجنٹ نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

”نہیں آج میں بہت مصروف ہوں! تم میرے سیکریٹری کو فون کر کے وقت طے کر لیتا۔“ اور یہ کہہ کر رومی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ رومی چوڑا جانا مانا ڈائریکٹر تھا۔ اس کے کریڈٹ پر بے شمار سپر سٹار فلمیں تھیں۔ پرسکون ماحول میں چھٹیاں گزارنے کے لئے اس نے اس سچ والے بنگلے کو خرید لیا تھا۔ ویسے تو وہ اپنی چھٹیاں ملک سے باہر گزارتا تھا مگر انڈسٹری کے بکھیروں سے بچنے کے لئے اس نے کچھ دن سکون سے گزارنے کے لئے اس بنگلے کو چنا تھا۔ رومی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اس کے پہلے واسلے بچنے میں اس کی ٹیلی رہتی تھی۔ کام کے لئے یہ جگہ موزوں تھی۔ معاملات طے ہو جانے کے بعد شنگ کا کام ہو رہا تھا۔

”سر! نیچے سے کچھ سامان ملا ہے۔“

”اچھا میں دیکھتا ہوں۔“ رومی نے ایجنٹ کو فون ملا یا تو اس نے کہا۔ ”سر جی دراصل یہ سامان شام مکر جی کا ہے۔ ان کی مریو کے بعد سے یہ بنگلہ کسی کے استعمال میں نہیں رہا۔ ان کی پوری فیملی باہر ہے۔ اب انہیں پیسے کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے اس کو بیچنے کا ارادہ کر لیا اور میں کل آ کر لے جاؤں گا سامان۔“

فون بند کر کے رومی بولا۔ ”کتنا بولتا ہے یہ شخص۔“ رومی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اپنے اسکرپٹ میں مصروف ہو گیا تو ٹھوڑی دیر بعد ملازم آ کر بولا۔ ”صاحب کھانا لگا دوں۔“

”ہاں لگا دو۔“ رومی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور کاغذات سمیٹنے لگا۔ جب وہ نیچے آیا تو کھانا ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ رومی نے پوری توڑی اور منہ چلانے لگا۔ ابھی وہ کھانا کھا ہی رہا تھا کہ سامنے سے دو بندے ایک گرین کمر کا باکس لے جا رہے تھے۔ رومی نے ہاتھ روک کر کہا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”صاحب نیچے سے نکالا ہے پرانے مالک کا ہے۔“

”اسے میرے کمرے میں رکھ دو، میں دیکھتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر رومی دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانا ختم کر کے رومی اپنے روم میں آیا اور سگریٹ سلگنے لگا پھر اس کی نظر گرین باکس پر پڑی تو باکس کے پاس اکڑو بیٹھ کر اسے کھولنے لگا۔ باکس میں کاغذات بھرے ہوئے تھے، کانٹریکٹ، بلز اور جانے کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ پرانی اداکاروں کی تصویریں بھی تھیں۔ رومی نکالتے نکالتے ٹھک گیا اور سر ہلانے لگا۔

”مجھے بھی کیا سوچھی جو اس کماؤ کو دیکھنے کی کوشش کی۔“ اور کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر باکس میں نیچے سے جھانکتی ہوئی ایک میروئن مگر کی فائل پر پڑی۔ رومی نے جبکہ کر اسے کھینچا اور باہر نکال لیا۔ اس نے فائل کو کھولا وہ کسی فلم کا اسکرپٹ تھا۔ اس نے اسے پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ آج ہی رات بیت چکی ہے۔ اسکرپٹ ختم کر کے رومی نے مسکرا کر کہا۔ ”مان مجھے آپ کو شام مکر جی! اتنا بہترین اسکرپٹ صرف آپ کے کیکر کا ہی ہے۔“

اگلے روز رومی نے ایجنٹ سے شام مکر جی کی فیملی کا نمبر لیا اور ان سے اسکرپٹ کو خرید لیا۔ اب وہ رومی چوڑا کا اسکرپٹ تھا۔ پھر اس نے اس فلم سے بڑے لوگوں سے بھی بات کی تاکہ بعد میں کوئی آکر اسے پریشان نہ کرے، رومی فلم کی تیاریوں میں لگ گیا، اسپانسرز، لوکیشن، کاسٹ سب فائل ہو گیا۔ ہیروئن کے لئے رومی نے ایک نئے چہرے کا انتخاب کیا، اس نے ایک دوکرشلز میں اسے دیکھا تھا۔ لڑکی کا نام ”سارہ“

تھا۔ اس سے بھی رومی نے معاملات طے کر لئے۔ شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے رومی نے ایک بے حد شاندار لائچنگ پارٹی رکھی جس میں شوہر کی دنیا کی بڑی چھوٹی سب ہی شخصیات شریک تھیں۔ پارٹی پورے عروج پر تھی۔ رومی اپنی ہیروئن سے سب کو متعارف کروا رہا تھا۔

اچانک ہال کے بیچ میں لگا فانوس ایک دھماکے سے نیچے گر پڑا۔ اس کے نیچے روی اور سارہ کھڑے تھے جو کہ بال بال بیچ گئے۔ پارٹی میں سناٹا چھا گیا۔ ”کم آن گاؤز!“ میں اپنے حریفوں کے لئے اتنی آسانی سے جگہ خالی نہیں کروں گا۔“ روی نے ماحول کو ہلکا کرنے کی کوشش کی تو سب مکرانے لگے۔ مگر سارہ اب بھی خوفزدہ تھی۔ ”سارہ اب تم قلم انڈسٹری کا حصہ ہو اور فلم میں تو اکثر حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ کم آن۔ یہ لو۔“ روی نے ساتھ کھڑے دیٹر کی ٹرے سے ایک گلاس اٹھا کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا اور پارٹی دوبارہ شروع ہو گئی۔

جنوں نے پورے یونٹ کو جمع کر لیا۔ پولیس کو انفارم کیا  
میا مگر سارہ کی موت کا ذمہ دار کوئی سانسے نہ آ سکا  
کیونکہ سارہ کے جسم سے کسی کے فنگر پرنٹس نہ ملے کافی  
دن تک معاملہ چلتا رہا مگر کوئی ثبوت نہ ملا۔

ہاتھ مگر ہمت نہیں جو رہی تھی کہ آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے مگر اب میں مزید خاموش نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ میری خاموشی ناقابلِ خلافی نقصان کا باعث بن جائے۔“



ہو گیا وہ ویسے ہی بہت پریشان تھا آئے دن کے نقصانات سے مودی اور رجٹ ہو گئی تھی۔

”تو رومی بابو پھر سوال یہ ہے کہ آخر یہ حادثات، جانی نقصانات ہو کیوں رہے ہیں؟ اتفاق ایک یا دو دفعہ ہو سکتا ہے بار بار نہیں، اور اس سوال کا جواب کسی عام منٹ کے پاس نہیں ملے گا آپ کو اس کے لئے کوئی گمان والا چاہئے، جو اپنے گمان سے آپ کو آپ کے سوال کا جواب معلوم کر کے بتائے گا۔“ آند بابو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”آپ کے کہنے کا مطلب ہے۔“ جنرل منتر کرنے والا۔ ”رومی بننے لگا۔“ آئی ایم سوری آند بابو، بتائیں دبی ٹی۔“ رومی نے کہا اور دوبارہ بننے لگا۔ ”ابھی آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں مگر مجھے ڈر ہے کہ نہیں آپ کا مذاق نہ بن جائے، آپ میری بات کا دشو اس نہ کریں، نقصانات یوں ہی ہوتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ گنہ گار کی طرح آپ.....“ آند بابو ادھوری بات چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور رومی سے اجازت لے کر چلے گئے۔ رومی نے لائٹر نکال کر سرکریٹ سلگائی اور دھواں نکال کر بڑبڑانے لگا۔ ”دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہماری جاہلانہ سوچ کے لوگ جاوٹو نے میں پڑے ہیں۔“ اور سر ہلانے لگا۔

رومی نے اپنے اسسٹنٹ کو ہدایت دی کہ ”پہلے جتنے بھی سین ہیروؤں کے بغیر ہیں وہ شوٹ ہوں گے ان کی انجمنٹ کرو، آخر فلم آگے بڑھے تو سہی۔“ اسسٹنٹ۔ ”جی سر“ کہہ کر تیاریاں کرنے لگا۔

سیٹ لگ گیا، رومی اوپر سے نیچے ہر چیز کا جائزہ لے کر نیچے آ گیا سب ٹھیک تھا اس بار رومی کافی احتیاط کر رہا تھا۔ سین یہ تھا کہ ہیرو میٹر حیاں اتر کر نیچے آتا اور پھر صوفے پر بیٹھی اپنی ماں کے برابر بیٹھ کر بائیں کرتا۔ سین شروع ہوا۔ ہیرو داؤ پر کی منزل پر کھڑا تھا۔ پھر وہ چل کر میٹر حیاں تک آیا اور آہستہ آہستہ میٹر حیاں اترنے لگا، پہلا اسٹیپ، پھر دوسرا، کیمرہ ہیرو کے

قدموں کو نوکس کر رہا تھا۔ پھر تیسرا اور چوتھا قدم اٹھانے پر ہیرو اچھل کر نیچے آ کر اتر پڑا۔ گرا کر پھر نہ اٹھ سکا۔ اس کی گردن پوری پیچھے مڑ کر ٹوٹ گئی تھی۔ ”سب تیار رہ گئے۔ آخر یہ ہوا تو کیا ہوا؟ مگر رومی تو پتھر کا ہو گیا تھا کیونکہ جو اسے نظر آیا تھا وہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔

دو ہاتھ، برف کی طرح بالکل سفید جنہوں نے ہیرو کی پٹلی پکڑ کر جھٹکا دیا تھا، اور ہلکے جھٹکے میں غائب ہو گئے۔ رومی نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا مگر وہاں کچھ نہ تھا، رومی دوڑ کر گیا اور ریکارڈ ہونے والا سین دیکھا، بار بار دیکھا کیمرہ میں ان ہاتھوں کا وجود نہ تھا۔

رومی نے کیمرہ مین سے پوچھا۔ ”تم نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی تھی سین شوٹ ہوتے وقت۔“ ”نوسرا! ایسا کچھ نہیں تھا جو ٹارل سے ہٹ کر ہو۔“ کیمرہ مین نے کہا۔

یہ سین آند بابو نہیں بلکہ کوئی اور شوٹ کر رہا تھا رومی کی فلم ایک بار پھر رک گئی۔ رومی نے بہت سوچا بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک وہم تھا، آئے روز کے حادثات اور آند بابو کی باتوں نے مل کر اس وہم کی شکل اختیار کر لی، ویسے بھی رومی بہت زیادہ مشغول تھا رومی نے خود ہی اپنے دل کو بہلا کر مطمئن کر دیا مگر یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔

رات کا جانے کون سا پھر تھا سوتے سوتے رومی کو اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہوا، اس نے کسمسا کر ادھر ادھر ہونا چاہا مگر وہ مل نہ سکا۔ پھر بوجھ حد سے بڑھ گیا اور رومی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا ایک لڑکی سفید رنگت والی اس کے کھٹکے پر بال کھلے ہوئے تھے جو کہ اس کی کمر سے بھی نیچے جا رہے تھے اور سر سے بہا ہوا خون اس کے چہرے پر سے گزر کر اس کی سفید ساڑی کو بھگور رہا تھا لڑکی بستر پر کھڑی تھی اور اس نے اپنا ایک پاؤں رومی کے سینے پر رکھا ہوا تھا لڑکی کی آنکھوں کی پتلیاں غائب تھیں، وہ قہر آلود نگاہوں سے رومی کو گھور رہی تھی، اس کے ہیر کا داؤڈا بڑھتا جا رہا تھا۔ رومی کو

اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔ ”جھٹک! جھٹک! جھٹک! کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس لڑکی نے چونک کر بند دروازے کی طرف دیکھا اور لمبے لمبے غائب ہو گئی۔

رومی کا خوف سے برا حال تھا وہ اپنی جگہ پر ابھی سنبھل رہا تھا۔ ”جھٹک! جھٹک! اوروازہ ایک بار پھر کھٹکھٹایا گیا جس کی آواز پر رومی چونکا اس کا دل جھٹکے لے لے کر دھڑک رہا تھا اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تو سامنے آند بابو تھے ان کے ساتھ ایک عجیب طبع کا آدمی کھڑا تھا۔

کیمرہ رنگ کے کپڑے، ہاتھ پر بڑا سا تلک کھینچا ہوا، کچھ جھکداسر کے بیچ میں چوٹی اور گلے میں جانے کون کون سی مالا میں پڑی تھیں۔ دوسری طرف رومی کا نوکر سہا ہوا کھڑا تھا اس نے رومی کو دیکھ کر کہا۔ ”آئی ایم سوری سر!“ میں نے انہیں روکا مگر یہ لوگ کہنے لگے۔ ”یہ آپ سے خود بات کر لیں گے۔“

رومی نے نوکر کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا اور دونوں کو کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ وہ عجیب سے طبع والا آدمی کمرے میں داخل ہوتے ہوتے رک گیا پھر کر اپنا دایاں پاؤں کمرے میں رکھ کر اندر آیا اس کا انداز عجیب سا تھا۔

”رومی سر مجھے شائیکے گا! میں نے بغیر اجازت اس سے آپ کو کشت دیا اور انہیں لے آیا، آپ پیشک میرا یقین مت کریں۔“

مگر ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رومی بول پڑا۔ ”آند بابو کشت کیسا؟ میں تو آپ کا بھاری ہوں، آج اگر آپ نہ آتے تو میں مر چکا ہوتا۔“ پھر رومی نے ساری بات بتادی۔

”اودا! جب ہی میں کہوں کہ جیسے ہی میں نے مہاراج سے بات کی تو مہاراج نے اسی سے یہاں آنے کا کہا، میں نے بہت کہا کہ کل مل لیں گے آپ مگر مہاراج کی ضد پر ابھی ہم آ گئے۔“

رومی نے مہاراج کے کھٹکے پکڑ لئے۔ ”دھن دھن

مہاراج آپ کے کارن میں آج زندہ ہوں۔“ ”اس فلم کو بنانے کا خیال اپنے دل سے نکال دو بالک۔“ مہاراج نے آنکھیں بند کئے ہوئے رومی سے کہا۔

”مگر کیوں مہاراج میرے فلم بنانے سے کسی کا کیا تعلق؟“ رومی نے سوال کیا۔

”اس نے جانے کیا کچھ نہیں کیا کامیابی کے لئے اور جب کامیابی ملی تو اس کی مرتبہ نے اسے آن دیو چاہہ مر تو گئی مگر نہ نہ ہوئی، اور اس کی یہ اچھا ہی تم لوگوں کے راہ کی دیوار ہے، وہ بھی ایسی کہ تم لوگ اسے گرائیں سکتے، کڑی تپسی کی ہے اس نے۔“ مہاراج نے بتایا۔

”آپ کس کی بات کر رہے ہیں مہاراج؟“ رومی نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا نام گیتا تھا، گیتا نہایت معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی اوپر سے اسے فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا، بہت نہیں جنون کی حد تک پہلے اس نے ایسے ہی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ملی، پھر اس نے گندے عمل کا سہارا لیا اور سب سے پہلے خوب صورتی پانے کے لئے شیر خوار بچوں کے خون پر عمل کر کے اس سے پورن مافی کو آدمی رات کو اشتان کیا۔ خوب صورتی مل تو گئی مگر اسے برقرار رکھنے کے لئے اسے یہ عمل ہر پورن مافی کو کرنا پڑتا تھا اور وہ بڑی خوشی سے منہ بچوں کے خون سے اشتان کرتی تھی مگر اس کی خوب صورتی بھی اس کی کامیابی کی ضمانت نہیں بنی تو ایک بار پھر اس نے گندے عمل کا سہارا لیا اور ایسا خطرناک عمل کیا جس کو کرنے سے پرش بھی گھبرا جائے، آدمی رات کو کمر گھٹ میں جا کر اس روز چٹا میں جلنے والی جگہ پر بیٹھ کر ایک دیا جلا کر عمل کیا اور وہاں کی راکھ دیا میں بھر کر لائی پھر عمل کرنے والے نے اس راکھ پر عمل کیا اور وہ راکھ اس نے کاسنی کے راستے میں ڈال دی اور پھر کاسنی کی مرتبہ ہو گئی۔“ اس نے جھرجھری لے کر کہا۔ ”اتنا مشکل کام۔“



## زندگی

### اقصیٰ رباب - فیصل آباد

اچانک نوجوان کے سامنے گاڑھا گاڑھا دھواں نمودار ہوا جسے دیکھ کر نوجوان کی گھگھی بندھ گئی مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے منہ منہ میں سورہ جن پڑھ کر سامنے پھونک ماری تو ایک خوفناک۔۔۔

### دل دو ماخ پر سست طاری کرتی ایک ناقابل یقین عجیب و غریب حیرت انگیز ڈراؤنی کہانی

**زندگی** کا ہر رنگ انوکھا ہے، اس کے آج میں کہیں ناامیدی کے سگریزے ہیں تو کہیں خوشیوں کے دسکتے ہیرے، کبھی سامنے موجود یقین کے منزل کو یہ وہم و گمان میں اور نارسائی میں بدل دیتی ہے اور کہیں راستے کو ہی منزل میں بدل دیتی ہے۔ شاید زندگی کو انسان کی آنکھوں میں چپکتے حیرتوں کے دیئے بہت پسند ہیں۔ اسی لئے یہ بھی یقینی

کامیابی کو ناکامی میں بدل دیتی ہے اور کبھی انہونی کو "ہونی" کر کے۔ جب انسان حیران ہوتا ہے اور خود سے سوال کرتا ہے۔ "کیسے؟ یہ کیسے ہو گیا؟" تب زندگی دور کھڑی مسکراتی ہے اور اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلاتی ہے کہ "میں ہوں۔" یہی تو اے انسان تو حیران ہے۔ میں ہوں ہی اس لئے کہ کہیں حیرت میں ڈالتی رہوں کہ میرے ہونے سے ہی تم ہو۔ اور میں کبھی تم نہیں

"یہ ہٹ دھرمی ہے تیری ہے کیونکہ تو نے جو پایا تاج تو ذریعے سے پایا، پایا کے اوپر پایا کر کے تو نے دوسروں کا حق چھینا ہے اور آج بھی اسے اپنا ہی حق سمجھ رہا ہے، جا چلی جا اور پھوڑ دے نروڈ لوگوں کی جان۔" مہاراج نے کہا۔

"جو کوئی میری جگہ لینے کی کوشش کرے گا دوڑ اپنی جان سے اڑ جائے گا۔" آتما نے غرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے یہی ہے ناں جڑ، یہی چاہئے میں تجھے، لے لے لے۔" آتما کہہ کر مہاراج نے فلم کا اسکرپٹ اپنے سامنے اچھال کر پھینک دیا گیتا کی آتما اپنی جگہ سے غائب ہوئی اور صحت سے اسکرپٹ کے پاس حاضر ہو گئی۔ مہاراج نے آنکھیں بند کیں اور ہونٹوں کو حرکت دی تو اسکرپٹ میں آگ بھڑک اٹھی۔

"یہ تو نے کیا کر دیا؟" گیتا کی آتما چٹکھڑائی ہوئی مہاراج کی جانب لپکی مگر کنڈل کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ بہت خوفناک اور ہر ہی گئی۔

"اب تیری باری ہے۔" مہاراج نے آتما کو کہہ کر آنکھیں بند کیں۔ لمحہ بھر میں گیتا کی آتما آگ میں گر گئی۔ اور چھین مار دی ہوئی جلنے لگی اور پھر غائب ہو گئی۔ اسکرپٹ کے تمام کاغذات جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

روٹی اور آند بایو دونوں ہی فلم کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ روٹی نے فلم کو شروع کرنے سے پہلے مہاراج کو بلا کر ایک ہون کر دیا۔

رات کو روٹی اپنی ٹیبل پر بیٹھا اپنے سے اسکرپٹ کو پڑھ رہا تھا۔ پچھلے جو دن اس نے گزارے تھے وہ سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے اور روٹی نے اپنے سب کو اپنے اسکرپٹ میں قید کر لیا تھا اور اس نے اپنے اوپر جیتے ہوئے حالات پر ایک ہار فلم بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ اپنی ہی فلم "ہیر وڈن" کی شوٹنگ اسٹارٹ کر کے بہت خوش تھا۔ اس نے فائل بند کی اور اپنے منظر پر لیٹ گیا۔

"ہاں بڑے جگر سہوائی تھی۔" مہاراج نے کہا۔ "تو کاشی ان کی وجہ سے مری تھی؟" آند بایو نے افسرہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کاشی کے مرنے سے اس نے فلم تو حاصل کر لی، مگر اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کی محنت بے کار جائے گی اور ایک حادثے کے نتیجے میں اس کی موت ہو جائے گی۔ وہ مروتو گئی مگر اس کا جنون، اس کی اچھا پوری نہ ہونے کے کارن اس کی آتما تکت نہ ہو سکی، اور وہ اپنی جگہ کسی کو نہیں لینے دے گی، اسی کارن وہ اس فلم کو بننے نہیں دے رہی اس کا ماننا ہے کہ اس میں کام کرنا صرف اس کا حق ہے اور کوئی نہ تو اس کی جگہ لے سکتا ہے اور نہ اسے شامل کئے بغیر اس فلم کو مکمل کر سکتا ہے۔ اور جس نے بھی ایسا کرنے کی کوشش کی وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے گی اور وہ انیسا ہی کر رہی ہے اور آگے بھی ایسا ہی کرے گی۔" آتما کہہ کر مہاراج خاموش ہو گئے۔

"مہاراج! اس کا کوئی تو پاپے ہوگا؟" روٹی نے پوچھا۔

"ہاں صرف ایک ہی پاپے ہے۔" اور مہاراج نے روٹی کو بتادیا۔ روٹی سوچ میں پڑ گیا تو مہاراج بولے۔ "بالک جس کام میں اتنی رکاوٹیں آ جائیں اس کو نہ کرو تو ہی اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے مہاراج! جیسے آپ کی اچھا۔" روٹی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

اگلے روز سب اس کنوئیں کے پاس آ گئے جہاں گیتا کی مرتی ہوئی تھی۔ مہاراج نے اپنے گرد کنڈل کھینچا اور آگ روشن کر کے سنتروں کا جاب کرنے لگے ٹھوڑی ہی دیر بعد گیتا کی آتما حاضر ہو گئی۔

"کیوں رکی ہوئی ہے یہاں؟" چلی جا، اس سنسار میں تیری جگہ نہیں۔" مہاراج نے گرج کر کہا۔

"مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے پنڈت! جو میری چیز ہے مجھے اس سے مطلب ہے اور اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" گیتا کی آتما بولی۔





Price : 300/-

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک یونیٹن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تک و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت، ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مند رہنے کے لئے بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دار لکتب

قدانی مارکیٹ اردو بازار لاہور

ہیں آدمی نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اندازہ نہیں کر پایا کہ وہ میری بات پر سوچ رہا ہے یا اسے میری مداخلت ناگوار گزر رہی ہے۔

بہر حال وہ خاموش تھا یا شاید خالہ کی مروت میں چپ تھا۔ میں نے اس عورت سے کہا۔ ”مجھے بچہ پڑا نہیں۔ اس عورت نے بغیر کچھ کہے بچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں بچے کو لے کر وہاں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا اور سورہ جن، آیت الکرسی اور سورتین پڑھ کر بچے پر پھونکنے لگا۔ حیرت انگیز طور پر بچے کی حالت سدھرتا شروع ہو گئی اور بچے کا لرزنا ختم ہو گیا۔

بہر حال میں کافی دیر تک بچے پر پڑھ کر پھونکتا رہا اب بچہ مصوبیت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بچے کا منہ چوما اور اس کی ماں کی طرف بڑھا دیا۔

بچے کی درست حالت دیکھ کر شاید ایک دم میں اور میری بات ان لوگوں کے لئے معتبر حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس آدمی نے دونوں آدمیوں کو واپس بھیج دیا اور مصوبیت سے پوچھنے لگا۔ ”اب پھر کیا کرنا چاہئے ہمیں آپ بتاویں؟“

اس کا سوال سن کر میں سوچنے لگا کیونکہ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے بھی کچھ کرنے کا ہو سکتا ہے۔ اچانک ایک بات میرے ذہن میں آگئی اور میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”آپ ایک آسان کام کریں۔ بلند آواز سے کہیں۔“ ”آپ لوگ بھی یہاں رہتے ہیں اور ہم بھی۔“

ایک چمڑی سے ایک کوئے سے کچھ حصہ چھوڑ کر نشان لگا دیں اور بلند آواز سے کہیں۔ ”یہ جگہ آپ کی ہوئی اور بانی ہماری نہ ہم آپ کو تنگ کریں گے نہ آپ لوگ ہمیں تنگ کریں۔“

”ایسا کرنے سے کیا وہ لوگ مان جائیں گے؟“ اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

”ہاں بالکل۔“ میں نے اسے یقین سے جواب دیا۔ مگر اندر سے مجھے خود پورا یقین نہیں تھا۔ بس ایک درخواست تھی۔ ہو سکتا ہے کام کر جائے۔ اس آدمی نے

کے پیر صاحب کو بلایا۔ پیر صاحب کا کہنا ہے کہ گھر میں آسب کا سایہ ہے۔“

آسب کا نام سننے ہی میرے اندر کی صلاحیتیں اور موجود سارا جوش ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا۔

”پھر خالہ! اس پیر صاحب نے کیا حل نکالا؟“ ”حل کیا نکالنا، پیر صاحب نے یہ برآمدہ گرانے کا حکم دیا ہے کہ اس کو گرا دو بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ خالہ نے جواب دیا۔

میں اس حل پر ششدر رہ گیا۔ جنت کو بھگانے کا یہ طریقہ تو میں نے نہیں نہیں پڑھا تھا۔ جن اور آسب سے متعلق ہر پڑھی کتاب میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اتنے میں ان کے گھر دو لوگ داخل ہوئے۔

چوہے کے پاس بیٹھا آدمی انہیں داخل ہوتے دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور برآمدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اسے گراتا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے۔“

مجھ سے رہا نہ گیا اور تیزی سے میں بولا۔ ”رکھو زور۔۔۔۔۔“

خالہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں تیزی سے چھت سے نیچے کی طرف اترا تا کہ ان کے گھر جا سکوں۔ خالہ بھی میرے پیچھے نکلیں۔ ”ارے بھال الدین رکھو۔۔۔۔۔ بات تو سنو میری۔۔۔۔۔ ارے رکھو۔“ مگر میں خالہ کی بات ان سنی کرتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہو گیا۔

وہ سب لوگ سچ جن میں کھڑے تھے۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر عورت بھی بچہ کو دھیں لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”آپ کے گھر میں بس ایک کمرہ اور ایک یہ برآمدہ ہے جسے آپ ہو سکتا ہے جانوروں کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ وقت بے وقت خود بھی یہاں بیٹھتے ہوں گے۔ اس کو گرا دیں تو پھر؟ کیا آسب بس انتظار میں ہے کہ اسے آپ گرائیں تو وہ یہاں سے فوراً نکل جائے؟“

اپنا آپ بھلائے نہیں دوں گی۔“ ہاں ایسا ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی موقع پر۔۔۔۔۔ ہم سب کے ساتھ۔ اگر شبت انداز میں ہو تو ہمیں لگتا ہے۔ ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔ اور اگر برسے انداز میں اور مٹی رنگ میں ہو تو ہم قسمت کو ہی ”برا“ کہتے نکلتے ہیں۔

میری زندگی کا یہ واقعہ بھی ایسا ہی ہے جس نے مجھے حیران کر دیا۔ میں شاید کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا میری زندگی میں بھی ہو سکتا ہے۔ جو آپ کو سنانے جا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے سب پڑھنے والے اس واقعہ پر حیران ضرور ہوں گے۔ یہ واقعہ بہت خوفناک نہیں مگر حیران کن ضرور ہے۔

میرا نام جلال الدین ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ا فوق الفطرت باتوں میں دلچسپ رہی ہے۔ امتحانات سے فارغ ہوا تو اپنی خالہ کے گھر چلا گیا۔ میری خالہ فیصل آباد کے پاس ہی ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔ میں اپنی خالہ کے ساتھ چھت پر گھومتے ہوئے خلاف عادت ساتھ والوں کے گھر میں جھانکنے لگا۔ اس گاؤں میں ابھی گیس نہیں پہنچی۔ اینٹوں کے بنے چوہے میں آگ جلا کر اس کے گرد ایک خاتون بیٹھی تھیں جن کی گود میں ایک بچہ تھا۔ ایک بوڑھی عورت پاس بیٹھی تھیں اور اس بوڑھی عورت کے ساتھ ایک درمیانی عمر کا آدمی بھی تھا، پورا گھر ایک کمرہ، ایک برآمدہ، پر مشتمل تھا اور کافی کھانا تھا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے بچہ ہر تھوڑی دیر بعد جھٹکے کے انداز میں اپنی ٹانگیں زور سے ہلاتا ہے۔ کیونکہ عورت کی گود میں ہونے کی وجہ سے اور عورت کی میری طرف پڑھنے ہونے کی وجہ سے بچے کی بس ٹانگیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے خالہ سے کہا۔ ”خالہ! بچے کو کیا ہوا؟ بچہ ٹھیک تو ہے نا؟“

خالہ نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”نہیں! پہلے تو ڈاکٹر ز سے چیک اپ کرواتے رہے۔ کسی نمٹ نہیں کسی بیماری کا پتہ نہیں چلا۔ جب آرام نہیں آیا تو یہاں

ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد میں خالہ کے ساتھ گھر آ گیا۔  
خالہ بالکل خاموش تھیں۔

”خالہ۔۔۔ کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہیں؟“  
”جمال الدین تمہیں اس چکر میں نہیں پڑنا

چاہئے تھا۔“ خالہ نے افسردگی سے جواب دیا۔  
”خالہ اگر بچے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں کبھی اتنا

جذباتی نہ ہوتا۔ آپ نے دیکھا ناں کہ بچہ ٹھیک ہے۔“  
میں نے جوش سے جواب دیا۔

”ہاں! اس پر مجھے بھی خوشی ہے۔ مگر۔۔۔ اگر  
فائدے کی جگہ نقصان ہو جاتا تب کیا ہوتا؟ یہ بھی سوچا تم

نے؟ تم نے بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔“ خالہ  
نے خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔

”خالہ! سوچا تو مج میں نہیں میں نے۔۔۔ مگر برا  
نہیں ہوا کچھ۔۔۔ تو کیا غمی سوچتا؟“

میں نے خوش ہو کر کہا۔ خالہ نے ”پگلا“ کہہ کر  
پیار سے میرے سر پر چیت لگا دی اور ہم دونوں ہنسنے

لگے۔ مگر میری ہنسی میں حیرت بھی شامل تھی۔ خوشگوار  
حیرت۔ میں ایک ہفتہ خالہ کے گھر رہا۔ مسائے بھی

خوش تھے۔ انہیں اب کوئی مسئلہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں  
سکون سے داپس لوٹ آیا۔

☆.....☆.....☆

میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اچانک مجھے  
اپنے سر پہ دھواں سا محسوس ہوا میں نے جلدی سے سورہ

جن پڑھ کر خود پر پھونک ماری اگرچہ پھونک مارنے میں  
مجھے کافی دقت ہوئی۔ خوف کی وجہ سے پھونک خود پر

ماری نہیں جا رہی تھی۔ بہر حال میں نے کافی مشکل کے  
بعد پھونک ماری لی خود پر۔ پھر میں نے ایک بار سورہ

جن پڑھ کر دھوئیں پر پھونک ماری تو وہ دھواں ایک  
انسانی شکل میں نمودار ہو گیا اور ڈرتے ہوئے بولا۔

”نہیں نہیں۔۔۔ اور نہ پڑھنا۔ میں نقصان کرنے کے  
ارادے سے نہیں آیا۔ میں تو اطلاع دینے آیا تھا۔“

”کیسی اطلاع؟“ میں حیران رہ گیا۔  
”میری کہ جو آپ نے گاؤں میں حفاظتی حد

کر دانی تھی۔ وہ دائرہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ جنتاں وہاں  
سے نکل آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ سایہ غائب ہو گیا۔ اور

میں نئی آفت میں پھنس گیا۔ اسے کہتے ہیں آئینل نیچے  
مار۔ ان کو منج بھی کیا تھا کہ ادھر نہ جائیں۔

میں خود سے الجھتا ہوا گھر والوں سے کہہ کر خار  
کے پاس چلا گیا۔ مگر خالہ میرے آنے کے متعقد سے

قطعی بے خبر تھیں۔ میں نے گھر پہنچ کر ذرا سا آرام کیا  
اور پھر ساتھ والوں کے گھر میں چلا گیا۔ ان لوگوں نے

کافی خوب صورت گھر بنالیا تھا۔ مجھے کافی حیرت ہوئی۔  
پوچھنے پر بتا چلا کہ پہلے جنتاں ان کا بہت نقصان کرنے

تھے۔ فصل تباہ کر دیے اس لئے گھر میں غربت کا رانی  
تھا۔ مگر اب خوشحالی ہے۔ اس وقت سے۔

میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”انگل میں نے  
آپ لوگوں کو منج کیا تھا کہ انہیں اس کوٹے میں رہنے

دیں۔ اس طرف آپ لوگ پاؤں بھی نہ رکھیں۔ مگر پھر  
بھی آپ لوگوں نے وہ حصار تو دیا۔ وہ لوگ پھر نکل

آئے وہاں سے۔“  
وہ آدمی حیران رہ گیا اور مجھے لے کر اس دیوار

کے پاس گیا۔ ”یہ دیکھیں! ہم نے یہ دیوار بھی ترجمہ  
بنائی کہ کہیں بچہ کسی دقت غلطی سے ادھر نہ چلا جائے۔“

حصہ ہی دیوار سے باہر کر دیا اور دیوار کے باہر باؤ لگا دی  
کہ کوئی غلطی سے اس طرف نہ جائے۔“ جب ہم

دونوں باہر نکلے تو وہ باؤ ٹوٹی ہوئی تھی۔  
نجانے کون انجانے میں باؤ توڑ گیا تھا۔

ہم دونوں پریشان اندر کی طرف بڑھ گئے۔  
سب پریشان ہو گئے یہ سن کر کہ ”جنتاں اب پھر نکل

کر سکتے ہیں۔“  
میں نے ان لوگوں پر سورہ جن پڑھ کر حصہ

باندھا تا کہ وہ سب محفوظ رہیں۔ خود پر سورہ جن پڑھ کر  
پھونک ماری اور ایک بار پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک

کر چہرہ پر پھیر لیا اور سورہ جن پڑھ کر سامنے پھونک  
ماری تو ایک جن انسانی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ وہ کاہل

صحت مند تھا اور اس کے پیچھے ایک کمزور اور ضعیف

انسانی وجود لئے جن کھڑا تھا۔

میں نے ایک دائرہ بنایا اور ان دونوں کو کہا۔  
”اس دائرے میں آ جاؤ۔“ مگر جن نے فوراً بات مان

لی حرکت مند جن نے انکار کر دیا۔ میں نے اس پر سورہ  
جن پڑھ کر پھونک ماری تو جیسے اس کے جسم پر لرز طاری

ہو گیا۔ فوراً دائرے کے اندر آ گیا۔  
اتنے میں مجھے پھر سفید دھواں دکھائی دیا۔ میں

نے اس پر سورہ جن پڑھ کر پھونک ماری تو وہ بھی ایک  
نوجوان کی صورت میں میرے سامنے آ گیا۔ اتنے میں

دائرے میں موجود جن نے اشارے سے بیڈ شیٹ  
دائرے کے اوپر پھیلادی اور اس پر چلتا ہوا باہر آ گیا۔

میں حیران رہ گیا۔  
دھوئیں والا جن بولا۔ ”اس نے بیڈ شیٹ پھیلانے

کا ذرا لہ کیا ہے۔ ایک بار حصار ٹوٹ جائے تو پھر ہمیں قید  
نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس کے بغیر بھی باہر آ سکتا تھا۔“

میں حیران رہ گیا۔ وہ جن تو انسانوں کی طرح  
مذاق کر رہے تھے میرے ساتھ۔ میں نے اس بیڈ شیٹ

کے ذریعے نکلے ہوئے جن پر سورہ جن پڑھ کر پھونک  
ماری اور اسے دائرے میں جانے کو کہا۔ اس کے

دائرے میں جاتے ہی میں نے دائرے کے ارد گرد سورہ  
جن پڑھ کر پھونک شروع کر دی۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا

تو میں نے اس دھوئیں کے بنے جن سے کہا۔ ”چلو تم  
بھی دائرے کے اندر۔“

وہ جن بولا۔ ”تم کون ہو؟ جو لوگ ہمارے نام  
پر اس لوگوں سے پیسہ کھاتے ہیں ان میں تو تمہیں کبھی

نہیں دیکھا۔“  
”کیا تمہیں ان سب کا معلوم ہے؟“ میں نے

حیرت سے کہا۔  
”ہمارے نام پر لوگوں کو لوٹتے ہیں تو کیا ہمیں

ان کا معلوم نہیں ہوگا؟ سب کا علم ہے۔“ اس جن نے  
گردن اگڑا تے ہوئے کہا۔

میں نے سورہ جن پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو  
میں حیران رہ گیا کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ الٹا وہ زور

زور سے ہنسنے لگا۔ اور یہ دیکھ کر میرا تو رنگ فق ہو گیا۔

”میں مسلمان جن ہوں۔ وہ مسلمان نہیں تھے  
اس لئے ان کے ساتھ ایسا ہوا۔۔۔ اب کیا کرو گے؟

جس سورہ کو ہتھیار بنا کر استعمال کر رہے تھے مجھ پر  
پھونک کر اسے خود قتل کرنے میرے لئے ڈھال بنادیا۔“

جن نے غر سے کہا۔ مجھے اس دن اندازہ ہوا کہ  
ہاتھوں کے طوطے اڑنا کسے کہتے ہیں۔

میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں سورہ جن کا  
عامل ہوں۔ اچانک بلا سوچے سمجھے میں نے سورہ جن

اور سو قین پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک ماری  
اور اللہ کے نام کا ورد کرتے ہوئے اس جن کی گردن کو

جا پکڑا۔ وہ جن حیرت سے بولا۔ ”ایسی ہمت تو آج  
تک کسی انسان نے نہیں کی۔“ میں بات کا جواب دینے

بغیر اللہ کے نام کا ورد کرتے ہوئے اس کی گردن پر دباؤ  
پڑھا تا گیا۔

اب وہ لا چاری سے بولا۔ ”مجھے اللہ کے واسطے  
معاف کر دو، میں تو ان جنتاں کے ہاں مہمان آیا ہوں۔“

واپس جا رہا ہوں، پھر کبھی نہیں آؤں گا۔“  
اس کی بات سن کر میں مطمئن ہو گیا۔ اور حیرت سے

پوچھا۔ ”مہمان؟“ تم لوگ بھی مہمان آتے جاتے ہو؟“  
”کیوں تم انسان ہی مہمان آ، جاسکتے ہو؟“

اس نے ہنس کر جواب دیا۔  
”کیسے یقین کروں کہ اب دوبارہ ادھر نہیں

آؤں گے؟“  
اس نے قسم کھائی حضرت سلیمان بن داؤد کی تو

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میرے چھوڑنے ہی اس نے  
وہاں سے بھاگنے میں غافیت جانی۔

میری زندگی نے مجھے وہ دکھایا اور مجھ سے کروا  
ڈالا جس کا میں نے گمان تک نہیں کیا تھا۔ اب یقیناً

زندگی میری اور آپ سب پڑھنے والوں کی آنکھوں  
میں حیرت کے ٹٹماتے جگنو دیکھ کر مسکرا رہی ہوگی۔





خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کوئی ناقابل فراموش کھانی۔

شاہکار کہانیوں کے ستارشی لوگوں کے لئے اچھے میں ذاتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

## وسکن ڈیزل کے جانے کے بعد میں

اور صوفیہ دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ صوفیہ نے کہا۔

”بے حد ذہین انسان ہے۔ میں ایک بات جانتی ہوں۔ قدرت نے ہر انسان کے لئے انتظام کیا ہے ہم لوگ ان حالات کا سامنا کیسے کر سکتے تھے۔

”ایک بات بڑی دلچسپ ہے سٹر۔ وہ یہ کہ آپ بڑی مشکل کا شکار ہو گئیں میری وجہ سے۔“

”ایسے نہ کہو..... میرے سر پرست، میرے استاد نے تمہارے لئے زندگی کی بازی لگا دی۔ اور پھر

میں تو اب تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔“

”میں بس کر خاموش ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے لگا۔ دل پر ایک خوف طاری تھا۔ اس لئے ہوٹل سے کیا

کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے۔ البتہ وسکن ڈیزل جب ہمارے پاس آئے تو انہوں نے کہا۔

”تم لوگوں نے اپنے آپ کو قیدی کیوں بنالیا ہے بے بی۔“

”بس احتیاطاً انکل۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے تم آرام سے میڈرو کی سیر کر سکتی ہو، اس سے مجھے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ میں

اندازہ لگا سکوں گا کہ کوئی تمہاری نگرانی تو نہیں کر رہا۔“

”آپ کا قیام کہاں ہے انکل۔“

”تم سے دور نہیں ہوں۔ تمہاری نگرانی بھی کر رہا ہوں، مطمئن رہو۔“

ہم نے وسکن ڈیزل کی ہدایت پر عمل کیا اور دوسرے دن سے آوارہ گردی شروع کر دی۔ حسین موسم، حسین مناظر میں خوب دل لگ گیا تھا۔ پھر کئی دن کے بعد سٹر ڈیزل کا فون موصول ہوا۔

”کہو ناٹھیک ہو۔“

”جی انکل۔“

”کل شام سات بجے مارشل روانہ ہو رہا ہے۔ کل ٹھیک چار بجے تم ہوٹل چھوڑ دو گی۔ میں نے سارے انتظامات کر لئے ہیں۔“

سمندری سفر کا تصویری انوکھا تھا۔ میں اور صوفیہ دیر تک اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن چار بجے ہم تیار تھے اور ڈیزل کی طرف سے ک

اطلاع کا انتظار کر رہے تھے کہ انکل ڈیزل خود تو آگئے۔ ضروری کارروائیوں سے گزر کر آؤ کار ہم نے

سمندر کے سینے پر چھکولے کھاتی عمارت میں قدم رکھا۔ سمندر کے سینے پر آباد اس چھوٹے سے شہر کا میں نے

کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ہر چیز حیران کن تھی۔ ہمیں برابر برابر کے دو کیمین دئے گئے تھے صوفیہ بھی اس جہاز کی خوبصورتی سے بے حد متاثر تھی۔

ہمارے کیمین بھی نائیو اسٹار ہوٹل کے پر آسائش کردوں جیسے تھے۔ صوفیہ میرے ہی کیمین میں تھی۔ سات بجے جہاز نے نلگر اٹھادیے۔ شروع شروع میں طبیعت متلائے لگی۔ ایک سروئنٹ نے ہمیں خوب صورت ریپر میں گولیاں پیش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ یہ گولیاں چوس لیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیسے میرا نام جم بارلو ہے۔ آپ صرف مجھے جم کہہ سکتی ہیں۔ میں آپ کو سفر کے دوران سرو کروں گا۔ گولیوں نے واقعی بہت سکون دیا تھا۔ ہم پھر اس سفر کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ سسر صوفیہ نے کہا۔

”ایک بات بتاؤ نشا۔ تمہیں پامسٹری سے کوئی دلچسپی رہی ہے۔“

”اتفاق سے نہیں۔ کیوں۔۔۔۔۔؟“

”ایک بار ایسے میں ایک سرک پاسٹ نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ میں زندگی میں سمندری سفر ضرور کروں گی۔“ میں ہنس کر خاموش ہو گئی۔

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟“ میں نے اٹھے ہوئے لیجے میں کہا۔ پتہ نہیں کیا بجا تھا جب انکل دسکن ہمارے کیمین میں آ گئے۔

”کیا ہے بھئی۔ تم لوگ آخر اتنی خوفزدہ کیوں ہو۔ وہاں عرشے پر دن اٹکا ہوا ہے۔ جہاز کے سارے مسافر سفر کی پہلی رات کا جشن منارے ہیں اور تم دونوں خوفزدہ چہو ہوں کی طرح چپبی بیٹھی ہو۔“

”ہم کیا کریں انکل۔“ میں نے پوچھا۔

”چلو۔۔۔۔۔ میرے ساتھ آؤ۔“ ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے۔ واقعی زبردست ماحول تھا۔ اتنی تیز روشنی چل رہی تھی کہ واقعی دن لٹکا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر طرف لوگ نکھرے نظر آ رہے تھے۔ عرشہ کی ریٹنگ کے ساتھ بہت سے لوگ لٹکے ہوئے

سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ جگہ جگہ اوپن ریسٹوران بنے ہوئے تھے جن میں رنگین کرسیاں اور میزیں بھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں انکل ڈیزل کے ساتھ بہت دور نکل آئے۔ وہ ہمیں جہاز کے مختلف حصے دکھا رہے تھے اور ان کے بارے میں بتا رہے تھے، یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا، سسر صوفیہ کے چہرے سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ مارشل کا یہ سفر انہیں بہت پسند آیا ہے۔ ریٹنگ کے پاس آ کر سمندر دیکھا، تاحہ نگاہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جو آخر کار تاریک آسمان سے جا ملتا تھا، میں نے متاثر لیجے میں کہا۔

”ہم زمین سے بہت دور نکل آئے ہیں انکل۔“

”ہاں بہت دور۔۔۔۔۔“ دسکن ڈیزل نے پرخیاں لیجے میں کہا۔ پھر ہم ان رنگین کرسیوں پر آ بیٹھے اور وہ نے میو سامنے رکھ دیا، اس میں حلال گوشت کی ڈشز الگ تھیں جن کے سامنے مسلمان باورچیوں کے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ وہی کھانے منگوائے گئے رات بار بجے عرشہ خالی ہونے لگا۔ کلب میں روشنی ہو رہی تھی۔

”نہیں بے بی، کلب ٹھیک جگہ نہیں ہے، میرے خیال میں اب تم لوگ آرام کرم چلو واپس چلے جی۔“ اور ہم اپنے کیمین میں واپس آ گئے، اپنے بستر پر لیٹ کر میں نے سسر صوفیہ سے کہا۔

”کیا آپ کو یقین آتا ہے کہ ہم زمین اور فضا کے دور پانی کے سینے پر ہیں اور ہمارے ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔“

”سمندر اس کائنات کی ایک انوکھی روایت۔“ ہم دو بہت کم سمندر کے بارے میں باتیں کرنے رہے، پھر سو گئے، اور صبح ہی آنکھ کھلی، چند لمحوں کے بعد ہمارے اینڈنٹ نے کیمین کے دروازے پر دستک دیا اور اندر آ کر ہمیں صبح کا سلام کیا۔

”ہیلو جم۔“

”ہیلو میڈم، میں آپ کو یہ اطلاع دینے کے لئے آیا تھا کہ عظیم ریسر مشروٹسکن ڈیزل کیپٹن روڈرمر

کے ساتھ ربح پر موجود ہیں اور آپ کے لئے ہدایت دے گئے ہیں کہ آپ چاہیں تو باہر نکل آئیں۔“

ہم لوگ ضروری تیاریوں کے بعد باہر آ گئے، رشتے پر پہنچے، مسٹر ڈیزل کا کوئی پتہ نہیں تھا، ٹانے کے بعد ہم ریٹنگ کے پاس کھڑے سمندر پر گہرائی کو دیکھتے رہے، اب سمندر سے دشت نہیں ہو رہی تھی، چنانچہ ہم جہاز کا جائزہ لینے لگے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ سمندر نے ایک پورے شہر کو اپنے سر پر اٹھایا ہوا ہے۔ ایک دواں دواں شہر کون اچھا ہی گزرا تھا، کائی لوگ سمندر سے لطف لے رہے تھے، خود جہاز پر اتنی تقریبات موجود تھیں کہ کچی بات یہ ہے کہ خوب دل لگ رہا تھا۔ شام ہوئی سورج ڈوبنے کا منظر بھی بے مثال تھا۔ رات کو پھر دیک بیک عرشے پر چہل قدمی ہوئی رہی، انکل ڈیزل بھی کئی بار ہمارے پاس آئے تھے اور ہماری خبر پتہ پوچھی تھی۔

ادھر ہمارا اینڈنٹ جم بھی دلچسپ آدی تھا اور ہم اس سے جہاز کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے تھے۔ وہ ہمیں ملکوں ملکوں کی کہانیاں سناتا رہا تھا، آج کا دن کائی پر سکون گزرا تھا۔ لیکن رات پر سکون نہیں تھی، کوئی دو بجے کا وقت تھا میں سوئی ہوئی تھی کہ ایک انوکھی کھڑ بڑا ہٹ سنائی دی تھی اور بے مقصد ہی آنکھ کھل گئی، لیکن آنکھ بے مقصد ہی نہیں کھلی تھی، کیمین کے ایک روشن دان میں دو چراغ جل رہے تھے۔ ہلکی نیلی روشنی لئے، انتہائی بھیاکنہ چراغ جو حرکت کرتے اور ادھر ادھر بل رہے تھے۔ میں نے آنکھیں میچ کر غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ دو آنکھیں ہیں جو میں دیکھ رہی ہیں، پھر چراغوں میں تحریک ہوئی اور وہ تھوڑے سے آگے آئے، ابھی میرے بدن میں شدید کچکبی دوڑ گئی۔

وہ ہلکی سی، وہی ننھوس ہلکی جو ایک طویل عرصے سے میرا تعاقب کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ہی روشنائی کا خیال آیا اور میرے بدن نے ٹھنڈا پسینہ چھوڑ دیا، یہ وہم نہیں تھا، وہم یہ پتہ نہیں کیوں اسی

وقت سسر صوفیہ بھی جاگ گئی۔ میرے دہشت زدہ چہرے کو دیکھ کر اس نے میری نگاہوں کا تعاقب کیا، ہلکی روشن دان سے اندر آ گئی تھی اور کیمین کی دیوار پر پہنچے جہاں کچھ نیچے اتر رہی تھی، اسے دیکھ کر سسر صوفیہ کے حلق سے ایک دہشت بھری چیخ نکل گئی اور ایک حیرت انگیز منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا، دیوار پر پہنچے جہاں نیچے اترتی ہوئی ہلکی دیوار ہی پر داپس چلی اور ایک دم سے روشن دان میں داخل ہو کر غزاپ سے باہر نکل گئی۔ سسر صوفیہ اپنی جگہ لیٹی کانپ رہی تھی اور میں اپنی جگہ۔۔۔۔۔ ہلکی عائب ہو گئی تھی، صوفیہ نے پہنچی پہنچی آواز میں مجھے پکارا۔

”نن۔۔۔۔۔ نن۔۔۔۔۔ ننا۔۔۔۔۔ ننا۔۔۔۔۔“

”ہاں میں جاگ رہی ہوں سسر۔“

”بب۔۔۔۔۔ بب۔۔۔۔۔ ہلی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہلی۔۔۔۔۔“

”تم نے اسے دیکھا؟“ سسر صوفیہ بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ میں بھی اٹھ گئی تھی، پورا دن جیسے اٹھ رہا تھا، ایک عجیب سا خوف دل میں جا گزیرا تھا، میں نے کھٹی آواز میں کہا۔

”اس کا مقصد ہے کہ روشنائی بھی جہاز پر موجود ہے، روشنائی کی شکل میں یا اس بھیاکنہ عورت کی شکل میں۔“

بہت بری حالت ہو گئی تھی ہماری، صوفیہ بھی بری طرح متاثر تھی۔ اس نے لڑتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اب کیا ہو گا نشا؟“

”پتہ نہیں کیا ہو گا، پتہ نہیں۔“ میں نے زچ لیجے میں کہا۔ صوفیہ بھی نروس تھی، عقل و ہوش ساتھ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہلکی یہاں موجودگی بہت برے خیالات کو جنم دیتی تھی۔ پھر بھلا باقی رات نیند کہاں سے آتی، طبیعت بری طرح گری گری تھی، کیمین سے نکل بھاگنے کو دل چاہ رہا تھا، روشنی خوب ہو گئی اور دھننے کا وقت ہو گیا تو ہم دونوں تیاریوں کے بعد باہر نکل آئے۔ عرشے پر پہنچے ہی تھے کہ دسکن ڈیزل ہمارے



پاس آتے ہوئے نظر آئے۔  
 ”ہیلو بے بی کیا بات ہے، کل جیسی تازگی تمہارے چہرے پر نہیں ہے، آؤ ناشہ کرتے ہیں۔“  
 ”جی انگل۔“  
 ”اوپن ایئر رستوران جگہ جگہ موجود تھے جہاں جہاز کے مسافروں کے لئے ہر طرح کے اختلاقیات موجود تھے۔ ناشہ ہمارے سامنے آگیا اور ڈیزل نے کہا۔  
 ”ہاں بھئی، کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے تم لوگوں کی، غالباً جہاز پر کچھ طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“  
 ”نہیں انگل! ایک بہت بھیا تک بات ہوئی ہے۔“  
 ”انگل ڈیزل کا ہاتھ ناشہ کرتے کرتے رک گیا، وہ بولے۔  
 ”کیا مطلب؟“  
 ”انگل رات کو وہ خوفناک بلی جو روشتاق کا ٹریڈ مارک ہے اور اس کے پاس ہی نظر آتی رہی ہے، میں نے آپ کو تفصیل بتائی تھی، وہ رات کو ہمارے کیمپ میں جھانک رہی تھی، پھر وہ روشن دان سے نیچے اتر آئی۔“ میں نے پوری تفصیل انگل کو بتائی اور انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے صوفیہ کی طرف دیکھا، صوفیہ نے فوراً ہی تائید میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں۔۔۔ میں نے بھی اپنی آنکھوں سے یہ پورا منظر دیکھا ہے۔“  
 ”اوہ اس کا مقصد ہے کہ یہ وہ نہیں ہے، میں نے تو یہ سوچا تھا کہ شاید نشاء کے ذہن پر بلی اور روشتاق کا خوف سوار ہے تو اسے دامن ہو لیکن تم بھی اس کی تصدیق کر رہی ہو۔“  
 ”صوفیہ، صوفیہ، میں نے بلی کو اچھی طرح دیکھا تھا۔“  
 ”انگل ڈیزل سوچ میں ڈوب گئے پھر انہوں نے کہا۔“ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میری ساری کوششیں حماقت ثابت ہوئیں، روشتاق ہمارے فریب میں نہیں آیا، وہ کامیابی سے ہمارا تعاقب کر رہا ہے، لیکن مجھے ایک بات بتاؤ، کیا وہ بلی اس کی نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں انگل، اس کا میری زندگی سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، میں اچھی طرح پہچانتی ہوں اسے۔“  
 ”بڑی تشویش کی بات ہے لیکن تم لوگ گرو کرو، میں نے تمہاری تمام فکریں اپنے ذمے لے لی ہیں، میں اسے تلاش کرتا ہوں۔“  
 ”فرض کیجئے انگل، وہ جہاز پر ایک مسافر کی حیثیت سے موجود ملتا ہے تو آپ اس کا کیا بگاڑ لیں گے؟“  
 ”بالکل ٹھیک سوال کیا تم نے، بالکل ٹھیک سوال کیا، اس سلسلے میں مجھے روڈرگس کا سہارا لینا پڑے گا، میں اسے بتاؤں گا کہ وہ ایک پراسرار آدمی ہے، ایک ہولناک مجرم جو مارشل پر ہم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“  
 ”ہم لوگوں کے ذہنوں پر تو ایک اور خوف بنا ہوا ہے انگل۔“ میں نے کہا۔  
 ”کیا؟“  
 ”میں نے آپ کو اسے ہمدانی صاحب کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ خدا نخواستہ کہیں وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔“  
 ”دسکن ڈیزل نے پوری سنجیدگی سے یہ بات سنی اور بولے۔  
 ”ہاں اس بات کے امکانات ہیں، لیکن بہر حال میں کوشش کروں گا اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ روڈرگس کو کس طرح روشتاق کے خلاف آمادہ کیا جائے گا اگر وہ جہاز پر موجود ہے تو روڈرگس صرف اتنا جانتا ہے کہ ہم اس کے جہاز میں الجھناڑ جا رہے ہیں، اس نے ہمیں ہر طرح کی مراعات کی پیشکش کر دی ہے، بس اسے کسی طرح کی جھوٹی جی کہانیاں سنانی ہوں گی، یہ ایک بہت بڑا پوائنٹ ہے کہ روڈرگس اگر قانونی طور پر اس جہاز کا مسافر ہے تو ہم اسے کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں جب تک کہ وہ کوئی جرم نہ کر ڈالے۔“  
 ”انگل میں بہت نروس ہو گئی ہوں۔“  
 ”نہیں بے بی نہیں، میں نے بار بار تم سے

بات کہی ہے کہ جو ذمے داری بارون دانش نے میرے سر دی ہے۔ اب وہ تمہاری نہیں میری ذمے داری ہے اور میں اسے پورا کروں گا، ہاں اگر تم بہت زیادہ پریشان رہیں تو یہ بات میرے لئے پریشانی کا باعث ہو جائے گی۔ میں ایک بار پھر تم سے کہتا ہوں کہ بے فکر رہو، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“  
 ”انگل! ہم خود سے زیادہ آپ کے لئے پریشان ہیں۔“  
 ”نہیں بے بی تمہاری سوچ غلط ہے، اگر تمہارے ذہن میں ہمدانی کا خیال ہے تو ان کا معاملہ دوسرا تھا، تمہاری کہانی یہ ہے کہ روشتاق کو بارون دانش کی تلاش ہے اور اسے کے ہمدانی ان کے بارے میں جانتے تھے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لئے اسے ان پر انتہائی تشدد کر ڈالا تھا، میری طرف سے بے فکر رہو، بے شمار پراسرار طاقتیں میرا تحفظ کرتی ہیں، اوکے۔۔۔ دسکن ڈیزل نے ناشہ سے فراغت حاصل کی اور کھڑے ہو کر بولے۔  
 ”مجھے اگر کوئی چیز پریشان کرے گی تو وہ ہے صرف تمہارا خوف، تمہارے بے سکونی بس یہ اضطراب ہے مجھے۔“  
 ”نہیں انگل ہم آپ پر بھروسہ کرتے ہیں۔“  
 ”اوکے ڈیزل، اب میں روشتاق کی تلاش کے لئے کیوین روڈرگس کو شیشے میں اتارتا ہوں، البتہ تم بھی جہاز کے مسافروں پر نگاہ رکھنا ہو سکتا ہے وہ تمہیں نظر آجائے۔“ یہ کہنے کے بعد انگل دسکن ڈیزل وہاں سے چلے گئے، ہم دیر تک کچھ نہیں بول سکے تھے، بمشکل تمام ہمارے حواس درست ہوئے تو صوفیہ نے کہا۔  
 ”ایک بات بتاؤ نشاء، اگر روشتاق ہمارے تمام پروگرام سے واقف رہا ہے اور اس جہاز تک آ گیا ہے تو کیا اس بات کے امکانات ہیں کہ عسکری جو اس کے لئے کام کر رہا تھا اس کے ساتھ ہو۔“  
 ”میں نے حیرت زدہ نگاہوں سے سسز صوفیہ کو دیکھا، ابھی تک مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا، لیکن صوفیہ

نے ایک عجیب بات کی طرف نشاندہی کی تھی میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔  
 ”ممکن ہے۔“  
 ”خیر، میں دسکن ڈیزل کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ہمیں ہمت سے کام لینا ہے، تم جانتی ہو کہ کوئی لالچ مجھے یہاں تک نہیں لایا میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں، چنانچہ جو کچھ میں کہوں اسے مان لینا۔“  
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“  
 ”میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر عسکری مل جائے تو تھوڑی سی اداکاری کر کے اس کا ساتھ قبول کر لینا۔“  
 ”کیا؟“ میں نے تعجب سے کہا۔  
 ”ہاں جانی، مصلحت۔“ اب تک وہ تمہیں بیوقوف بناتا رہا ہے، اب تم اسے بیوقوف بناؤ گی۔“  
 ”لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا؟“  
 ”بعض اوقات حالات کا رخ اس طرح بدلتا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا، ممکن ہے ہم اسے روشتاق کے خلاف ہی استعمال کر ڈالیں ممکن ہے وہی ہمارے لئے روشتاق کے خلاف جاسوس بن جائے۔“  
 ”صوفیہ نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گئی، مجھے اس شخص سے بے پناہ نفرت ہو گئی تھی، یہ نفرت محبت میں نہیں بدل سکتی تھی، مشکل کا چہرہ میری نگاہوں میں آ جاتا تھا وہ اسے چاہتی تھی اس کیسے دھوکے باز کو، لیکن لیکن لیکن۔۔۔۔۔۔  
 ”کیا سوچنے لگیں؟“ صوفیہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔  
 ”کوئی خاص بات نہیں۔۔۔۔۔۔“  
 ”یہ صرف ایک مفروضہ ہے، ہو سکتا ہے وہ جہاز پر نہ ہو، لیکن اگر وہ نظر آجائے تو اس کے ذریعے ہم روشتاق کو بہت سے دھوکے دے سکتے ہیں۔“  
 ”میں سمجھ رہی ہوں، اگر وہ یہاں ہوا تو میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گی۔“  
 ”مسٹر ڈیزل بھی یہی چاہتے ہیں، ہمیں ہمت

سے کام لیتا ہوگا۔“

بہر طور میری زندگی تو اب یہی رہ گئی تھی، کیا کروں اور کیا نہ کروں، تھوڑی دیر کے بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے، اس کے بعد پورا دن کوئی واقعہ نہیں پیش آیا تھا۔ دوپہر کے بعد موسم بھی ابر آلود ہو گیا، آسمان پر گھٹائیں چھانے لگیں اور جہاز کے خلاصی بارش سے بچاؤ کے انتظامات میں مصروف ہو گئے، لیکن رات تک بارش نہیں ہوئی البتہ آسمان بدستور گہرے بادلوں سے ڈھکا رہا تھا، جم ہمارے پاس آیا اور اس نے انکل کا پیغام دیا۔ رات کے کھانے کے لئے انہوں نے ہمیں ایک شیلک میں بلوایا تھا، وہ مطمئن نظر آ رہے تھے۔

”ہیلو انکل۔ کوئی خاص بات۔“ صوفی نے فوراً پوچھا۔

”بے حد خاص۔“ مسٹر ولسن ڈیزل نے کہا اور ہم دونوں چونکے ہوئے، مسٹر صوفی نے سوالیہ انداز میں ولسن ڈیزل کو دیکھا تو اس نے ایک ملازم کی طرف اشارہ کر دیا اور اسے کھانے کا آرڈر دیے گئے، کھانے کے دوران خاموش طاری رہی تھی، پھر کافی پیتے ہوئے مسٹر ڈیزل نے کہا۔

”روشنی جہاز پر موجود نہیں ہے۔“

”اوہو، کیسے اندازہ ہوا؟“

”روڈرگس ایک دلچسپ آدمی ہے، بہت ہی دہمی اور توہم پرست، میں نے اسے اس بلی کی کہانی سنائی جو ایک پراسرار روح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے پس منظر میں ایک شخص ہے جو روحوں کا رکھوالا اور روڈرگس اب اس شدید خوف کا شکار ہو گیا ہے کہ کہیں کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے۔“ ولسن ڈیزل مسکرا دیے۔

”روشنی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔“

”نہیں مسافروں میں اس نام کا کوئی مسافر نہیں ہے۔“

”مجھے ایک بات یاد آئی ہے انکل۔“

اچانک ہی میں نے کہا اور ولسن ڈیزل میری جانب متوجہ ہو گئے، ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے انکل عدنان ثانی کے بارے میں بتایا اور ان کی تحقیق تکرار کیا، ولسن ڈیزل گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر انہوں نے کہا۔

”واقعہ واقعی منفی خیز ہے، کیا کہا جاسکتا ہے۔ آگے کے حالات کیا ہوں، بصورت حال شدید پراسرار ہو گئی ہے، خیر و شاق کا تو کوئی سراغ نہیں ملا، لیکن میں نے جب پراسرار روح اور بلی کی کہانی سنا تو اس کے جواب میں بیوقوف کپتان نے مجھے ایک اور کہانی سنا دی اور یہ کہانی واقعی قابل ذکر ہے، جہاز میں البرونوس نامی ایک شخص سفر کر رہا ہے جو برطانیہ تک جا رہا ہے، اس کے ساتھ دو تابوت ہیں جنہیں وہ ریتانیہ لے جا رہا ہے۔“

”تابوت“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں مصری طرز کے تابوت جن میں میاں ہیں۔“

”اوہ مائی گاؤ، کیا کیپٹن روڈرگس نے وہ تابوت کھول کر دیکھے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ہاں پوری چھان بین کی گئی ہے ان کی منشیات اور ہتھیار وغیرہ کے سلسلے میں ان کی پوری تلاش کی گئی ہے کیونکہ اس کے بغیر انہیں جہاز میں جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اسپین گورنمنٹ نے اپنی اڈی جاری کیا ہے، خیر یہ بات اپنی جگہ ہے لیکن میں۔ روڈرگس کو تیار کر لیا ہے کہ کسی بھی مناسب وقت وہ گئے ان تابوتوں کی میاں دکھائے، میں جنہیں بھی سنا رکھوں گا۔“

”آپ نے میرے ذہن میں شدید خرابی

کر دیا ہے انکل، آپ نے البرونوس کو دیکھا ہے۔“

”ہاں ایک پتہ قاتم سکی سا آدمی ہے۔“

”بھی دکھاؤں گا، ویسے روشن کا پورا حلیہ مجھے بتاؤ۔“

”تو اسے اچھی طرح دیکھا ہے نا۔“

”بہت اچھی طرح، وہ تینوں میں ہمارے ساتھ

تھا بلکہ ہمارے ساتھ ہی تینوں تک گیا تھا۔“

”مجھے اس کا حلیہ بتاؤ۔“ ولسن ڈیزل نے کہا اور میں نے اسے روشناس کا سارا حلیہ بتا دیا ولسن ڈیزل سوچے رہے پھر انہوں نے کہا۔

”نہیں وہ کسی بھی طرح البرونوس نہیں ہو سکتا، ویسے اس کا نقل الٹی سے ہے، وہ ایک پست قاتم انگلیں آدی ہے، ایسے ہی میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ ممکن ہے روشناس بدلے ہوئے نام سے سفر کر رہا ہو۔“

”میں نے بھی یہ سوچا تھا انکل ڈیزل، آپ کو اس کا اندازہ کیسے ہوا؟“

”انکل ولسن ڈیزل کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے پھر انہوں نے کہا۔

”تم نے فوراً سوال کیا تھا کہ کیا میں نے

البرونوس کو دیکھا ہے۔“

”جی انکل۔“

”اس بات کے امکانات ہیں کہ روشناس نام بدل کر سفر کر رہا ہو۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے انکل۔“

”میں جہاز کے ہر مسافر پر نگاہ رکھتی ہوگی۔ لیکن یہ ایک ناگہانی بات ہے۔ ہم کسی بھی طرح ہر مسافر کا جائزہ نہیں لے سکتے۔“

بات ٹھیک تھی۔ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ ولسن ڈیزل چلے گئے۔ آسمان پر بدستور گہرے بادلوں کا راج تھا۔ بلی بوندا باندی ہونے لگی تو موسم بے حد خوب صورت ہو گیا۔ اس موسم سے متاثر نہ ہونا ایک غیر انسانی عمل ہوتا۔ ہم عرشے کے ایک پرسکون گوشے کی طرف چل پڑے۔ لوگ اس موسم سے پوری طرح

لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہمارے سامنے پیکراں سمندر تھا۔ جہاز کے غلے کو شاید بارش کی توقع تھی یہ لوگ موسموں کے باہر ہوتے ہیں چنانچہ وہ کلی ہوئی روشنیوں کو شبی گور سے ڈھکنے میں مصروف تھے۔ ہم سے کچھ

فاصلے پر ایک شخص آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سیاہ لباس میں

لباس تھا اور اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اچانک اس نے رخ بدلاتو میری نظر اتفاقاً طور پر اس کی طرف اٹھ گئی۔ دوسرے لمحے میرا بدن قہراً گیا۔ سارے بدن میں شدید سنسنی دوڑ گئی۔ وہ عسکری تھا۔ اب وہ براہ راست میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”غضب کا موسم ہے، نشاء۔ سمندری سفر کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ لوگ تو ہنسی مون کے لئے یہ سفر کرتے ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو صوفی نے چونک کر مجھے دیکھا اور آواز دی۔ ”نشاء۔ کہاں ہو تم۔“

”ہسٹر۔۔۔۔۔۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”کیا ہوا جان۔“

”عسکری۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”اس۔“ صوفی نے بے اختیار کہا۔ اور پھر

عسکری کو دیکھا۔ پھر بولیں۔ ”یہ عسکری ہے۔“

”ہاں۔“

”پورے وثوق سے کہہ رہی ہو۔“

”صوفی صدی۔“

”میری ہدایت یاد ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

ابھی میں نے یہ جملے پورے ہی کئے تھے کہ دفعتاً عسکری نے اپنی جگہ چھوڑ دی وہ سیدھا ہماری طرف آ رہا تھا۔

”قرب پہنچ کر اس نے بغیر کسی تہذیب کے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ جہاز پر میری موجودگی سے واقف ہیں اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ آپ مجھ سے کبھی مخاطب نہیں ہوں گی۔“

”آپ واقعی چٹکس ہیں مسٹر عسکری۔“

”آپ مجھے چند منٹ دے سکیں گی۔“

”جی فرمائیے۔“

”تھوڑی دیر کے لئے تمہاری چاہتا ہوں۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”اس طرف۔“



”جاؤ نشاء بن لو۔ صوفیہ نے کہا اور میں عسکری کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ چند گز کے فاصلے پر جا کر ہم رک گئے۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

”میں نے تم سے کہا تھا نشاء کہ میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں زندگی کی بازی لگا کر تمہاری حفاظت کروں گا۔“

”شکر یہ، شکر یہ، مسز عسکری۔ ہاں یہ تو بتائیں آپ کا آقا و رشتا بھی جہاز پر موجود ہے یا نہیں۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے؟“

”ہاں وہ جہاز پر ہی ہے۔“

”ویری گڈ، ویری گڈ۔ آپ اس کی پناہ میں رہ کر میری حفاظت کر رہے ہیں۔“

”اب میں تم سے کوئی التجا نہیں کروں گا نشاء۔ اگر تم پسند کرو تو تمہاری سنجیدگی سے میری بات سن لو۔“

”کیا تمہارے آقا کی طرف سے میرے لئے کوئی پیغام ہے۔“

”وہ میرا آقا نہیں ہے۔ تم کیوں مجھے ذلیل کر رہی ہو۔۔۔“ وہ جھلا کر بولا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا۔

”غلطی کسی انسان سے ہو سکتی ہے۔ میں مانی پریشانوں کا ڈھکڑا ہو کر اس کا ساتھی بن گیا تھا۔ مگر مجھے بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ خیر مجھے اندازہ ہے کہ میں تمہارا اعتماد کھو چکا ہوں۔ لیکن اب میں تمہارے التفات کے لئے نہیں بلکہ اپنا کفارہ ادا کرنے کے لئے سب کچھ کر رہا ہوں۔ میں تم سے مخاطب نہ ہوتا۔“

عسکری کے لئے میرے دل میں زہری زہر تھا لیکن صوفیہ نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس کا بھی خیال رکھنا تھا۔ چنانچہ میں خاموش رہی۔ وہ کہنے لگا۔ ”روشتاق تمہیں کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔“

”خوشخبری ہے میرے لئے۔ پھر وہ کیا چاہتا ہے؟“

”یقین کرو۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس تمام کارروائی کا پس منظر بے حد پراسرار

”نہیں۔ وہ کہیں اور ہے لیکن جہاز پر ہی ہے۔ میں نے اسے دوبارہ اس کے پاس دیکھا ہے۔ پھر وہ نظر نہیں آئی۔“

”ایک بات اور بتا دو عسکری۔ کیا وہ تمہیں کبھی عورت کے ردوپ میں نظر آیا۔“

”کبھی نہیں۔ اب میں تم سے ایک بات پوچھوں۔“

”ہاں پوچھو۔“

”ابروٹوس کون ہے۔“

میرا چونکا فطری تھا۔ میں نے عسکری کو دیکھا تو اس نے کہا۔ ”روشتاق کی پوری توجہ ابروٹوس پر ہے جو دو تابوت کے لرزہ کر رہا ہے۔ روشتاق کا خیال ہے کہ وہ وِسکن ڈیزل کا آؤی ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ ممکن ہے وہ روشتاق کا شکار ہو جائے۔“

میں تشویش سے ہونٹ سکڑ کر خاموش ہو گئی۔

”روشتاق ان تابوتوں میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ خیر۔ میں تو ہر طرف نگاہ رکھ رہا ہوں۔ صرف تمہارے لئے نشاء۔ میں اپنی کوتاہی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں تم سے کچی محبت کرتا ہوں اور اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتا۔“

”تم نے مثل کے بارے میں نہیں سوچا عسکری۔“

”ہاں نشاء۔ انسان محبت میں بے حد خود غرض ہو جاتا ہے۔“

”وہ تم سے محبت کرتی ہے۔“

”میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں۔ چلو چھوڑو۔ میں چلتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو گی تو تم سے ملتا ہوں گا کیونکہ روشتاق بھی یہی چاہتا ہے۔ لیکن میں صرف تمہارے لئے اس سے رابطہ رکھتا ہوں۔ خدا حافظ۔“ وہ دایکس پلٹ گیا۔ تب مسز صوفیہ میرے پاس آ گئیں۔

”آؤ چلیں۔“ انہوں نے کہا اور ہم اپنے کمبین جانے کے لئے چل پڑے۔

دوسری صبح جاگے تو شدید بارش ہو رہی تھی۔

عرشے پر پہنچے تو سارا ماحول جل قفل ہو رہا تھا۔ انگل ڈیزل جیسے پہلے سے منتظر تھے۔ کیڑوں کی چھش کھل گئی تھیں۔ ایک رستوران میں بہترین کافی کے سب لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ”انگل آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”ہاں ضرور۔“

میں نے انہیں روشتاق اور عسکری کی پوری کہانی سنادی۔ ان کے چہرے پر فکر کے آثار ابھر آئے۔ وہ کافی دیر خاموش رہ کر بولے۔

”ہمیں کسی بھی طرح البرٹوس کو دست بنانا ہوگا۔“

”وہ خطرے میں ہے۔“

”اس سے تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔“

”بتائیے کیا کیا جائے۔“

کچھ لمحے سوچنے کے بعد ڈیزل نے کہا۔ ”آؤ برج پر چلتے ہیں۔ ہم برج پر پہنچے تو روڈز کس بہت پریشان نظر آ یا۔ اس نے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ پھر بولا۔

”میں بہت پریشان ہوں۔“

”کیا ہوا؟“

”بادلوں کا رنگ دیکھ رہے ہو۔ وہ آسمان پر ساکت ہیں۔ جیسے ہواؤں کا انتظار کر رہے ہوں۔ سمندر پر چھائے ہوئے ایسے بادل طوفان کا پیش خیمہ ہوتے ہیں، اور ان بادلوں کے نیچے سمندری سفر پر سکون نہیں رہتا۔“

”کیا تم نے کوئی خواب دیکھ لیا ہے؟“

”شاید جاگتی آنکھوں کا خواب، میں نے دیکھا کہ میں جہاز پر سفر کر رہا ہوں اور برج پر کھڑا دو درمیان سے سمندر میں دیکھ رہا ہوں کہ اچانک سمندر کے پانی کا ایک حصہ کھو لگا اور پھر اس سے ایک آتش فشاں نے منکال کر جھانکا اور بلند ہوتا چلا گیا، پس اس خواب نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

”یار کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔ سچ بتاؤ۔“

دسکن ڈیزل نے پریشان لہجے میں کہا۔

”ویسے ایک بات کی پیشگوئی میں کرتا ہوں مائی ڈیئر کپتان، اس جہاز پر کم از کم ایک شخصیت ایسی ضرور ہے جو انتہائی پراسرار اور خوفناک کہی جاسکتی ہے۔“

روڈرگس نے براسمانہ بنایا اور بولا۔  
”تمہاری انہی دل دہلا دینے والی باتوں نے میرے ذہن کو خراب کیا ہے میں نے تو ابھی تک پورے جہاز پر کوئی بلی نہیں دیکھی اور نہ ہی دالا۔“  
”مگر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس پراسرار بلی کا مالک روشتاق ہے ایک انوکھا انسان اور وہ تمہارے جہاز پر موجود ہے، معذرت منجوس بلی کے۔“

”کیوں اس۔۔۔۔۔ میرا ایشاف مستعد ہے اور کسی نے پورے جہاز پر نہ کوئی بلی دیکھی اور اس نام کا کوئی شخص بھی نہیں۔“ روڈرگس نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ واقعی کافی پریشان نظر آ رہا تھا، دسکن ڈیزل کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے پھر انہوں نے کہا۔

”تو پھر سنو مائی ڈیئر، میں تمہیں اپنی تحقیق بتاتا ہوں۔ جس شخص کا نام میں نے روشتاق لیا ہے وہ فرضی نام سے سفر کر رہا ہے، اور کینمبر سرات میں مقیم ہے، اس کا نام حادث سلامہ ہے۔“  
”کینمبر روڈرگس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور دسکن ڈیزل سے مختصر الفاظ میں روشتاق کے بارے میں بتانے لگا، کپتان روڈرگس ٹھوڑی دیر تک تو کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔

”اگر اس نے حادث سلامہ کے نام سے پاسپورٹ حاصل کر لیا ہے اور اسی پاسپورٹ پر یہ سفر کر رہا ہے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ الجزائر میں ایئر لکیشن کے حکام کو اس کی نشاندہی کر دیں۔ اسے جہاز پر کوئی نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔“

”اور اگر وہ البرونوس کو کوئی نقصان پہنچا دے تو۔“

”جہاز پر اگر اس نے معمولی سا جرم بھی کیا تو

میں اسے گرفتار کر سکتا ہوں، ہمارے پاس باقاعدہ قید خانہ ہے، بلکہ قیدی بھی ہیں۔“

”قیدی۔“  
”ہمارے نہیں، بلکہ اسپین حکومت کے قیدی جن کی تعداد آٹھ ہے، اور اسپیش افسرانہیں گرفتار کر کے الجزائر لے جا رہے ہیں۔ جہاں شاید انہیں موت کی سزا دے دی جائے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر وہ البرونوس کو نقصان پہنچائے گا تو میں اسے گرفتار کر لوں گا یہ تو بہتر ہوا کہ اس کی نشاندہی ہوگی، ہمیں مجرم نہیں تلاش کرنا پڑے گا۔“

”اور اگر البرونوس کو نقصان پہنچ گیا تو؟“  
”بھلا اس کی پیش بندی کیسے کی جاسکتی ہے تم اگر چاہو تو میں البرونوس کے تحفظ کا بندوبست کر دوں۔“  
”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ دسکن ڈیزل نے پریشان لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔

”اور ان باتوں کو دکھانے کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟“

”تابوت جہاز کی چلی تہہ میں مال خانے میں محفوظ ہیں، آج رات کو ان کا جائزہ لے لیا جائے گا، ویسے ایک بار البرونوس اجازت لے کر میرے دو آدمیوں کے ساتھ وہاں جا چکا ہے۔“  
”رات کو کس وقت چلو گے؟“  
”گیارہ بجے کا وقت مناسب رہے گا، گیارہ بجے کے بعد مال خانے پر پہرہ لگ جاتا ہے اور کوئی وہاں نہیں جاسکتا۔“

آخر کار میں صوفیہ اور دسکن ڈیزل کی پیشین گوئیوں سے واپس آ گئے، آسمان کی دہی کیفیت تھی، صوفیہ نے کہا۔

”کالے بادل پہلے بھی دیکھے ہیں مگر اتنے گہرے سیاہ بادل کبھی نہیں دیکھے، ممکن ہے سمندر پر ان کی سیاحت زیادہ محسوس ہوتی ہو۔“

”ہاں ممکن ہے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔  
مجھے ان کالے بادلوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا،

البتہ شام کو میں نے صوفیہ سے کہا۔

”کیا خیال ہے سسٹر، کیا کینمبر سرات سو کو تلاش کیا جائے؟“

”کیوں؟“ صوفیہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔  
”ہم خود روشتاق سے ملیں، میں تمہیں مختصر تفصیل بتا چکی ہوں، تپنس ہم ساتھ ہی گئے تھے، دو کروڑ اور تھے جن کا اب نام و نشان نہیں ہے۔“  
”مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“

”ہو سکتا ہے وہ ہمارے اس طرح سامنے آ جائے خوفزدہ ہو جائے۔“  
”نہیں نشا نہیں۔ اپنے آپ کو خطرے کے منہ تک لے جانا مناسب نہیں ہے۔“

”یونیٹل میں خیال آیا تھا۔“  
”اس کے برعکس میں ایک اور تجویز پیش کروں، اگر اس طرح ملنا ہے تو پھر البرونوس سے کیوں نہ ملا جائے۔“

عجیب سی بات تھی، میں چونک کر سسٹر صوفیہ کو دیکھنے لگی، پھر میں نے کہا۔

”لیکن تو ہم اسے پہنچانے ہیں اور نہ اس کے کینمبر معلوم ہے، پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس قسم کا انسان ہے، نہیں سسٹر ایسا کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں ہے جس سے خطرہ پیدا ہو، ہمیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا۔“

”اوکے اوکے، میں کب منع کرتی ہوں؟“  
”باتوں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا، کوئی نیا موضوع بھی نہیں تھا، دل پر ہیٹ ایک بوجھ بنا حاری رہتا تھا، انوکھے حالات میں وقت گزر رہا تھا۔“  
”کینمبر میں تمہیں گھمے گھمے کیا کریں، چلو عرشے پر

ی چلتے ہیں۔“

سسٹر صوفیہ کو عرشے سے واقعی کافی دلچسپی ہو گئی تھی۔ دلچسپی تو مجھے بھی تھی، بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا، ہر طرف ٹیکر اس سمندر اور کھلا آسمان، بس یوں لگتا تھا جیسے ایک انوکھی دنیا ہو، کسی سیارے پر اُنٹکے ہوں، ہم

بہر حال عرشے پر آ گئے، آسمان کا دہی عالم تھا، کالی گھٹائیں تلی کھڑی تھیں، ماحول بے حد بوجھل ہو رہا تھا، رات کی بارش کے بعد پورا دن بارش نہیں ہوئی تھی، لیکن اس وقت سماں کچھ ادر تھا، ابھی ہم عرشے پر ہی تھے کہ اچانک آسمان سے پانی کی دھاریں پھوٹ پڑیں، عرشے پر موجود مسافروں میں الجھل مچ گئی، لوگ بری طرح نیچے بھاگنے لگے، ہم دونوں نے ایک محفوظ جگہ پناہ لے لی، دیے بھی مارشل انتہائی خوب صورت جہاز تھا، راہداریوں اور برآمدوں میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ دوسرے درجے کے کینمبر کے ساتھ لاجبیری تھی جس میں لاتعداد کتا میں بھی ہوئی تھیں۔

بار دم اور کھیلوں کے لئے وسیع کمرے تھے، عرشے پر حسین صوبے ہوئے تھے جن کی کیفیت بڑی خوشنما تھی، تمام فرسٹ کلاس کینمبر ایئر کنڈیشنڈ تھے، ایک طرف جہاز کے اعلیٰ افراد کے اور انجینئروں کے کینمبر تھے، انہی کینمبروں کے اوپری حصے میں روڈرگس کا وہ کینمبر تھا جسے ہم اندر سے دیکھ چکے تھے، بارش کی وجہ سے علیٰ کے افراد نے ایسی چیزوں پر خوشنما پھول دار ترپال ڈھک دیئے تھے، جن کو پانی سے نقصان پہنچ سکتا تھا جگہ جگہ مسافروں کے لئے خصوصی ہدایات درج تھیں، کھلے سمندر میں یہ اہتمام بھی بہت عجیب لگتا تھا۔ خاص طور سے اس وقت جب سمندر دیکھا جائے تو پھر تو یہ سارا اہتمام ناقابل یقین محسوس ہوتا تھا، بارش طوفانی جھگڑوں کے ساتھ شرع ہوئی تھی اس لئے شاید زیادہ خطرناک تصور کی گئی تھی۔ جہاز کا لاؤڈ اسپیکر بج چکا تھا۔

”براہ کرم عرشے پر کوئی مسافر موجود نہ رہے، سب لوگ نیچے چلے جائیں۔“

”چلو، واقعی ادھ میرے خدا، ذرا سمندر دیکھو۔“  
صوفیہ نے کیکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، دھواں دھار بارش کے ساتھ چاروں طرف سمندر ابلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، دیوبند کی لہریں جہاز کی طرف لپکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی خوفناک عفریت جہاز کو نگل لینا چاہتا



ہو، میں بھی سہم گئی اور مسٹر صوفیہ کے ساتھ اپنے کیمین میں واپس آ گئی۔

”خدا کی پناہ کیسا ہولناک منظر ہے، دل لرز رہا ہے۔“ میں نے کہا اور ایک دم خاموش ہو گئی، جہاز کو کئی زوردار جھٹکے لگے تھے، وہ ان ہیبت لہروں کے نرغے میں جھکولنے لگا تھا، پھر بڑی عجیب سی آوازیں سنائی دینے لگیں، ایسا لگا جیسے گولیاں چل رہی ہوں، ہمارے کیمین میں شیشے لگے ہوئے تھے لیکن ان کے دوسری طرف گھپ اندھیرا تھا، الیٹ بارش کا ہولناک شور اور بادلوں کی گرج صاف سنائی دے رہی تھی، میں نے خوفزدہ لہجے میں مسٹر صوفیہ کو پکارا۔

”نہیں ڈیئر ڈرنہیں، ہم تباہ نہیں ہیں بے شمار لوگ ہیں، اگر تم کہو تو میں مسٹر وکسن ڈیزل کو بلا لاؤں؟“

”کیا وہ اپنے کیمین میں ہیں؟“

”جیسے نہیں۔“

”ارے دیکھو ذرا کیمین کس بری طرح مل رہا ہے۔ کیا آپ کھڑی ہو سکتی ہیں صوفیہ۔“

”کوشش کرتی ہوں۔“ صوفیہ نے کہا اور پھر وہ کسی نہ کسی طرح باہر نکل گئی۔ میں بستر سے چبلی ہوئی انتظار کرتی رہی، کچھ دیر کے بعد مسٹر صوفیہ گرتی پڑتی اندر آ گئی۔ ”وکسن ڈیزل اپنے کیمین میں نہیں ہے۔“

صوفیہ نے کہا میں نے کوئی جواب نہیں دیا، رفتہ رفتہ جھکولوں میں کمی آنے لگی، شور بھی کم ہو گیا تھا، پھر طوفان ٹل گیا، ایک کیمین کا دروازہ کھلا اور وکسن ڈیزل کیمین میں داخل ہو گئے، وہ مسکرا رہے تھے۔

”نیلو بہادر لڑکیو! کیا ایڈوینچر ہے یہ؟“

”آپ اسے ایڈوینچر کہہ رہے ہیں انکل، ہم نیم مردہ ہو گئے ہیں۔“

”اوہ نہیں بے بی، سمندری سفر میں ایسے معمولی طوفان آتے رہتے ہیں۔“ وکسن ڈیزل نے لا پرواہی سے کہا۔

”یہ معمولی طوفان تھا۔“

”بالکل معمولی، روڈرکس کہتا ہے کہ ایسے طوفان بالکل بے ضرر ہوتے ہیں۔“

”خدا کی پناہ ہمیں کیا معلوم، ہماری تو جان ہی نکل گئی تھی۔“

”تم نے کھانا کھا لیا۔“

”خاک، اندر کا نظام تو الٹ پلٹ ہو گیا ہے، ایسے میں کھانے کا ہوش کسے ہو سکتا ہے۔“

”میں کھانا منگوا رہا ہوں۔“

”نہیں انکل اس وقت کچھ نہیں کھا سکو گی، کم از کم میں کچھ نہیں کھا سکو گی، سیٹر اگر آپ کھانا چاہیں۔“

”نہیں بھئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

لیکن وکسن ڈیزل نے ہمارے ہی کیمین میں کھانا منگوا لیا اور خوب ڈنٹ کر کھلایا، ان کے اس اطمینان سے ہمیں بھی دھارس ہوئی تھی، وکسن ڈیزل کافی دیر تک ہمارے پاس بیٹھ رہے، پھر ہمیں تسلی دیتے ہوئے اٹھ گئے۔

”اب تم لوگ آرام سے سو جاؤ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اوکے مسٹر ڈیزل۔“ صوفیہ نے کہا اور کیمین کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ہم دونوں بستروں پر جا لیٹے، وکسن ڈیزل کی ان تسلیوں کے بعد طبیعت کافی پرسکون ہو گئی تھی اور کچھ دیر خاموشی طاری رہی تو نیند آ گئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک ہی جہاز کو ایک زوردار جھکا لگا اور میں جاگ گئی، کانوں میں زبردست گڑگڑاہٹ ابھر رہی تھی۔ کیمین میں نجانے کیوں اندھیرا پھیل گیا۔ پھر یوں لگا جیسے باہر لوگ چیخ چلا رہے ہوں۔ ذہن صحیح طور سے کام نہیں کر رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹی ذہن کو نیند کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگی، اچانک یوں محسوس ہوا جیسے بستر فضا میں معلق ہو رہا ہو۔ پھر وہ اسی تیزی سے نیچے آیا اور میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں بستر سے نیچے آ گئی، اسی وقت صوفیہ کی

گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔

”نہیں..... نہیں میری جان نشاء ڈر نہیں، یہ طوفان لگ رہا ہے۔“

ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک اور خوفناک جھکا لگا اور میں وہاں سے بھی اچھل کر نجانے کہاں جا گری۔ کیمین زیادہ بڑا نہیں تھا اس لئے میرا بدن صوفیہ کے بدن کو چھونے لگا اور میں اس سے چٹ گئی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے کس..... کس.....؟“

”حوصلہ رکھنا، حوصلہ رکھو۔“

”کیا جہاز تباہ ہو جائے گا؟“ میری دہشت بھری آواز ابھری۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو، بس معمولی سا طوفان ہے، مسٹر ڈیزل بتا نہیں رہے تھے کہ معمولی سا طوفان ہے۔“

”نہیں مسٹر مجھے تو یوں لگا تھا جیسے وہ ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہے ہوں۔ یہ طوفان یہ طوفان ضرور جہاز کو تباہ کر دے گا، یہ دوبارہ کیوں آ گیا۔“

”نشاء ایسی باتیں مت کرو بلکہ۔“ صوفیہ کا چہرہ بھی خوف میں ڈوبا ہوا تھا، کیمین کے بند دروازے کے دوسری طرف انسانی چیخیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں، میں نے مسٹر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”میرا دم گھٹ رہا ہے کس، میری سانس بند ہوتی جا رہی ہے، باہر چلے خدا کے لئے باہر چلے۔“

وہ ایک لمحے تک تو کچھ نہ بولیں پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”جہاز کو جھٹک لگ رہے ہیں اور پھر یہ اندھیرا، کہیں ہم دشمن نہ ہو جائیں، اچھا ٹھہرو، مسٹر ڈیزل کے کیمین میں چلتے ہیں، لیکن ذرا مشیوٹی سے قدم جما کر چلنا، اوہ میرے خدا، یہ جھٹکے کس قدر خوفناک ہیں آؤ ذرا مشیوٹی سے میرا ہاتھ پکڑ لو۔“

ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کیمین کے دروازے سے باہر نکل آئے۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی انسانی شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ مسافر

شدید افراتفری کا شکار تھے اور اندھیرے میں ایک دوسرے سے الجھتے پھر رہے تھے، ٹکرائے کر گر رہے تھے۔ اوپر نیچے بھاگتے پھر رہے تھے، ہم لوگ کیمین کی دیوار سے ٹک گئے۔ وکسن ڈیزل کے کیمین کا فاصلہ ہی کتنا تھا، کھٹکے کھٹکے دروازے تک پہنچے، لیکن ان کے کیمین کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صوفیہ نے انہیں کئی آوازیں دیں، لیکن ان کی آواز سنائی نہ دی، اس کا مطلب تھا کہ وہ کیمین میں نہیں تھے، انسانوں کی بھاگ دوڑ سے بچنے کے لئے ہم نے انہی کے کیمین میں پناہ لی اور اس کے بعد ہماری وہاں سے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ رات کا بقیہ حصہ ہم نے انکل ڈیزل کے کیمین میں ہی انتظار کرتے ہوئے گزارا، یہ طوفان تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا پھر رفتہ رفتہ سکون چھا تا چلا گیا، لیکن جہاز کے مسافر نجانے کیوں دیوانوں کی طرح بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے اور اس کان پڑے شور میں دل مسلسل الٹا رہا تھا، یہاں تک صبح کی روشنی نمودار ہوئی کہ انہوں نے ہولناک سیاہ رات کے ٹل جانے کا احساس جاگ اٹھا۔ اب بھاگ دوڑ بھی ختم گئی تھی لیکن انسانی شور اور چیزوں کے گرنے پڑنے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں، میں نے ایک بار پھر صوفیہ کو باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے مجبور کیا اور وہ تیار ہو گئیں۔

ہمارے اعصاب کشیدہ تھے، نجانے کس طرح ہم عرشے پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک قیامت برپا تھی۔ مرد عورتیں نوجوان سب یہاں موجود تھے، بعض عورتیں بچوں کو سینے سے لپٹائے رو رہی تھیں۔ مرد جو اس باختہ کھڑے ہوئے تھے ان سب کے چہروں پر موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ خلاصی ادھر سے ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ عرشے پر ہر چیز ٹوٹی پھوٹی پڑی تھی، کچھ لوگ ریلنگ سے جھانک رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ رات کو اپنے کیمینوں سے باہر نکل کر عرشے سے صورت حال کا جائزہ لینے والے بہت سے افراد سمندر میں گر گئے ہیں۔ دیگر پر لگی ہوئی سوز بوش بھی سمندر کے اندر جا پڑی ہیں۔ نجانے کس طرح بچتے

بچاتے ہم دونوں بھی اتنی کٹھڑے کے پاس پہنچ گئے وہاں سے سمندر کو دیکھا تو چکر آ گیا، انسانی لباس پانی پر تیر رہے تھے، جگہ جگہ پانی کے گولوں میں انسانی لبو کی سرخ لکیریں نظر آرہی تھیں، چھوٹی بڑی آدم خور مچھلیاں انسانی گوشت کھانے میں مصروف تھیں، ان میں شارک مچھلیاں بھی تھیں، میں نے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رخ تبدیل کر لیا سسٹر صوفیہ نے دہشت زدہ سچے میں کہا۔

”آؤ نشاء چلو، آؤ چلو کیمین میں واپس چلیں۔“  
نجانے سسٹر ڈیزل کہاں غائب ہو گئے ہیں اور پھر ٹھیک ہی تو ہے وہ کہاں تک ہمارا تحفظ کریں گے۔“  
”آہ..... کتنے لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے۔“  
میرے خدا وہ خونخوار مچھلیاں ان کے جڑے کتنے بھیا تک تھے۔ میرے خدا تا تو ان انسانی جسم۔“ میرے بدن پر شدید کچکی طاری تھی، اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔

”نشاء تم خیریت سے تو ہو۔“  
اس شناسا آواز کو سن کر میں چوکی، میں نے گرد گھما کر دیکھا۔ عسکری تھا اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی جس میں خون کا دھبہ نمایاں تھا۔ وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ میرے بجائے سسٹر صوفیہ نے کہا۔  
”انہیں سنبھالنے سسٹر عسکری، براہ کرم انہیں سنبھالنے، یہ بہت خوفزدہ ہیں۔“

”نہیں نشاء ہولناک طوفان گزر گیا ہے اس نے جو تباہ کاریاں کرتی تھیں وہ کرچکا ہے، اب سمندر پرسکون ہے۔“ عسکری نے کہا۔

”آپ زخمی ہو گئے ہیں سسٹر عسکری۔“ صوفیہ بولی۔

”ہاں افسوس، میں پچھلی شام جب پہلا طوفانی جھٹکا آیا تھا ایک چھوٹے سے حادثے کا شکار ہو گیا، مجھے بے ہوشی کے عالم میں جہاز کے اسپتال میں رکھا گیا تھا۔ ورنہ طوفان کے دوران میں نشاء کی خبر لینے ضرور آتا۔“

”اب تو طوفان نہیں آئے گا۔“ میں نے سہے

ہوئے لیجے میں پوچھا۔

”سمندر کے ماہر یہی کہتے ہیں، ویسے بھی دیکھئے آسمان پر نیلا نہیں نمایاں ہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ صوفیہ نے کہا۔

”لیکن طوفان نے جہاز کو بے حد نقصان پہنچایا ہے، ٹھیک طور پر معلومات نہیں حاصل ہو سکیں، پتہ چلا ہے کہ جہاز کے انجنوں کو نقصان پہنچا ہے۔“

”اوہو..... کیا جہاز رک گیا ہے؟“ صوفیہ نے چونک کر پوچھا۔

”رات ہی کو اس کے انجن بند ہو گئے تھے، آپ نے محسوس نہیں کیا؟“

”غور نہیں کیا تھا۔“

”جہاز کھلے سمندر میں لنگر انداز کر دیا گیا ہے۔“

”اب کیا ہوگا؟“ میری رندھی ہوئی آواز ابھری۔

”نشاء خود کو سنبھالے رکھئے، آپ دیکھ رہی ہیں کتنے مسافر ہیں جہاز پر، ویسے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے کیمین میں آرام کریں، میں کچھ دیر کے بعد دیں آپ کے پاس آؤں گا، میڈم آپ انہیں لے جائیں، یہاں بڑے دلدوز مناظر بکھرے پڑے ہیں، مس نشاء ان کی تاب نہ لائیں گی، پلزز جاییے۔“ مس نشاء میں کچھ دیر کے بعد آپ کے کیمین میں آؤں گا۔“ وہ آگے بڑھ گیا، میں اسے دیکھتی رہی، صوفیہ نے کہا۔

”اس کا دم غیبت ہے ہمیں اس کی ضرورت ہے، آؤ کیمین میں چلیں۔“

”نہیں سسٹر وہاں جا کر کیا کریں گے، نجانے انکل ڈیزل کہاں گئے؟ کہیں وہ بھی لوگ اپنے اپنے ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے، آہستہ آہستہ دل کو قرار آنے لگا۔ خوف کا مرحلہ گزر چکا تھا۔ ٹھکن ہو گئی وہ داغ بریشان تھے، کیمین ہی کی طرف چل پڑے، وہاں پہنچے تو عسکری موجود تھا بسکٹ، پیڑ، خشک خوراک کے بہت سے ڈبے ڈرائی فروس کافی تعداد میں لے آیا تھا اور وہاں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

”ارے یہ کیا ہے؟“ سسٹر صوفیہ نے اس انبار کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

”ضرورت کی چیزیں ہیں۔“

”کہاں سے لائے؟“

”اسٹور میں گھس گیا تھا خاموشی سے، مجھے اندازہ ہے کہ اب بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی، یہ کولڈ ڈرنک کے ڈبے ہیں، آپ دونوں ان میں سے اشیاء منتخب کر کے ناشتہ کر لیجئے۔“

”کیا مشکلات پیدا ہو جائیں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”جس قدر ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سنبھالنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے جہاز کا عملہ مسافروں کو صحیح طور پر خوراک نہ مہیا کر سکے، آپ لوگ یہ اشیاء محفوظ کر لیجئے۔“

”شکر ہے عسکری، تم نے جس طرح اپنا سبب کا ثبوت دیا ہے، ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے، نشاء چلو کچھ کھا لو یہ ضروری ہے۔“

میں خاموش رہی، حالانکہ جو مناظر دیکھ کر آئی تھی اس کے بعد کھانے پینے کا ہوش کسے رہتا ہے، لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ بھوک نہ رہ سکوں گی، البتہ اس وقت میں نے نری سے کام لیا اور اس نری میں کوئی قریب نہیں تھا، میں نے عسکری کو بھی اپنے ساتھ شریک ہونے کی دوت دی، بسکٹوں کے چند ڈبے کھولے اور انہیں کولڈ ڈرنک کے ساتھ معدے میں اتار لیا۔ صوفیہ نے عسکری کی ہدایت پر مل کر کیا تھا اور پتی ہوئی اشیاء کو احتیاط سے کیمین کے ایک محفوظ حصے میں اسٹور کر دیا۔ عسکری کچھ دیر کے بعد باہر چلا گیا۔ صوفیہ اپنے بستر پر پاؤں لٹا کر بیٹھ گئی اور مجھے دیکھتی رہی۔ میرے ہونٹوں پر پھسکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی، وہ بھی مسکرا دی۔

”کیا سوچ رہی ہیں سسٹر؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“

”پھر بھی۔“

”بس انہی حالات کے بارے میں.....“ صوفیہ نے جواب دیا۔

”بس کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، آپ یقین کریں کہ میں آپ سے بھی شرمندہ ہوں، اچھی خاصی زندگی گزار رہی تھیں آپ، میرے لئے زندگی کو مصیبت میں ڈال دیا۔“ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور سسٹر صوفیہ جلدی سے اٹھ کر میرے پاس آ گئیں۔

”میری محبت کی تو جہن مت کرو۔“

”نہیں سسٹر، یہ سچ ہے میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”پاگل ہو فضول باتیں کر رہی ہو، چلو آؤ باہر چلتے ہیں۔“

”ہمت نہیں پڑ رہی سسٹر، پتہ نہیں کتنے مسافر موت کا شکار ہو گئے۔“

”چلو پھر لیٹ جاؤ تھوڑی دیر سونے کی کوشش کرو وقت بھی کٹ جائے گا اور پھر اس کے بعد دیکھیں گے کہ آگے کیا ہوتا ہے، جب انسان کے بس میں حالات نہ رہیں تو پھر غرور اور فکرمند ہونے سے کیا حاصل، بے شمار مسافر ہیں جو سب کا حال سوہارا۔“

انہوں نے زبردستی مجھے لٹا دیا، لیکن بھلا نیند کسے آ سکتی تھی، نجانے کیا کیا سوچتی رہی، پھر غنودگی طاری تھی کہ کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی اور میں اٹھ کر بیٹھ گئی، سسٹر صوفیہ جو سر پکڑے ہوئے بیٹھی تھیں میرے اٹھنے پر چونکیں اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں، تب میں نے دیکھا کہ کچھ اور اشیاء سامنے میز پر رکھی ہوئی ہیں۔

”عسکری لے کر آیا تھا، ویسے میں تم سے ایک بات کہوں، اس سے نرم رویہ ہی رکھو، بعض اوقات دشمن بھی کام آ جاتا ہے۔“

”سمندر کے سینے پر کتنا وقت گزار سکتے ہیں ہم، اس کے بعد تو مرنا ہی ہوگا۔“

”خدا نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہو نشاء، کیا تمہارے خیال میں انسان نہیں ہوں، مجھ سے ایسی



“مارشل ایک عظیم الشان مسافر بردار جہاز تھا جس پر لاتعداد انسان سفر کر رہے تھے طوفان کا شکار ہو کر کھلے سمندر میں لاوارث ہو گیا تھا، اس کا پتہ تان مرچک تھا، انجن خراب ہو گئے تھے۔ انجینئر بھی زندہ نہیں تھے

“میں بہت زیادہ مذہبی انسان نہیں ہوں، لیکن

7 February 2013

”نہیں، یہ ایک کتا ہے۔“

Dar Digest

وہیں کھڑے رہے، ہمارے سامنے ہی لوگوں کو کھانا پیش کیا گیا۔

بھوک زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے، لوگ پریشان تھے لیکن بھوک بھی تھی، کافی حد تک امن قائم ہو گیا، مارشل پرسکون سمندر میں اپنا وقار برقرار رکھنے میں مصروف تھا، شام ہو گئی اور سمندر پر اندھیرے اترنے لگے۔ رات کے کھانے کے بعد مسافروں سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی آرام گاہوں میں چلے جائیں، عملے کے لوگ مارشل کو قابل سفر بنانے میں مصروف ہیں۔ خستہ حال مسافروں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ہم لوگ بھی اپنے کیمپ میں آ گئے، کوئی دس بجے وسکن ویزل نے کیمپ کے دروازے پر دستک دی اور اندر آ گئے، انہوں نے ہمیں دیکھ کر کہا۔

”تم لوگ پہلے کی نسبت پرسکون ہو۔“  
”کر بھی کیا سکتے ہیں مسٹر ویزل۔“ صوفیہ بولی۔

”حوصلہ قائم رکھو، تماشائی بن جاؤ، یوں سمجھ لو کہ تم ایک سنسنی خیز فلم دیکھ رہی ہو۔“  
”اور پھر خود بھی اس فلم کا ایک کردار بن جائیں۔“

”ہاں..... جب موت تمہارے قریب آئے تو اسے بھی دلچسپی سے دیکھو اور مر جاؤ۔“ وسکن ویزل نے کسی قدر بے رحمی سے کہا ان کے لہجے میں کسی قدر ناخوشگوار سی تھی جسے ہم دونوں نے محسوس کیا۔ پھر میں نے کہا۔

”یہ لوگ کپتان کی موت کو چھپا رہے ہیں۔“  
”ضروری ہے ورنہ لوگ دہشت زدہ ہو جائیں گے۔ ابھی کچھ اور وقت اس کی موت کو چھپائے رکھنا مناسب ہوگا۔“

”لیکن قائدہ انکل؟“  
”کسی قدر سکون سے اس مشکل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔“ وسکن ویزل نے کہا پھر مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

”میں عموماً تمہارے سامنے دل دہلا دیتے والے انکشافات کرتا ہوں، ایک اور انکشاف ہے تمہارے لئے، سننا پسند کرو گی۔“

”کیا؟“ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی، صوفیہ بھی تھکی نظر آ رہی تھیں اور ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے۔

”میں جہاز کے مال خانے میں اترتا ہوں جہاں کپتان کے کہنے کے مطابق وہ تابوت تھے جنہیں البرونوس نے بک کرایا تھا، تابوت وہیں تھے لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا؟“  
”تابوتوں کے پاس البرونوس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ نئی لاش، اتنی نئی جیسے نئی روشتائی ہوئی ہے، ہاتھ پاؤں چہرہ سب ایک جیسا، وہ کہیں سے زخمی نہیں تھا لیکن مر چکا تھا اور اس سے دھنک کے فاصلے پر کپڑے کی موی ٹیڈوں کے دو ڈھیر پڑے ہوئے تھے، الگ الگ پیٹوں کے انبار۔“

صوفیہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں انہوں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اور وہ تابوت۔“  
”تابوت اپنی جگہ پر ہیں۔“  
”کیا وہ کھلے ہوئے تھے؟“

”ہاں دونوں کے ڈھکن کھلے ہوئے تھے، ان میں تالے بھی پڑے ہوئے تھے کیونکہ ان کے نزدیک کھلے ہوئے تالے نظر آ رہے تھے۔“

”انکل، ہم آپ کو آپ کو بتا چکے ہیں کہ۔۔۔۔۔“  
”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”کیا آپ کے خیال میں؟“  
”نہیں، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“  
”انکل میں ان تابوتوں کو پہچانتی ہوں میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بے بی سواری اس وقت ممکن نہیں۔“  
”کیوں انکل؟“  
”مسافروں کو ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے اس وقت کوئی، میں راہداری سے باہر نہیں جانے

دے گا۔“

”لیکن انکل۔“

”سنا سنیں مسافروں کی لاشیں ٹھکانے لگانی ہیں جہاز کے عملے کو، اس کے علاوہ روڈرگس کی لاش بھی، ظاہر ہے ان جسموں کو چھپایا گیا نہیں گی اور یہ منظر ہر لحاظ سے ہولناک ہوگا، مگر اس کے سوا اور کچھ ممکن بھی تو نہیں ہے۔“

”سسر صوفیہ نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے، اس کا بدن ہولے ہوئے کپکپا رہا تھا۔ میں نے کہا۔“  
”کیا البرونوس کی لاش بھی عملے کے علم میں آ گئی ہے؟“

”ہاں سیکنڈ آفیسر کو پتہ چل چکا ہے۔“  
”لیکن اس کی موت کا کچھ پتہ چلائیے ہوئی؟“  
”اس وقت کوئی اس کے بارے میں سوچنے کو تیار نہیں ہے۔“ میں خاموش ہو گئی۔

”کچھ دیر کے بعد وسکن ویزل چلے گئے، میں نے کہا۔“

”کیا یہ وہی تابوت ہو سکتے ہیں سسر صوفیہ، وہ بھی دو تھے اور ان میں تالے پڑے ہوئے تھے اور ٹیڈوں کے ڈھیر، میرا بڑا دل چاہ رہا ہے میں دیکھنا چاہوں۔“

صوفیہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی تھی، لیکن میرے ذہن میں نجائے کیا کیا چل رہا تھا۔ کارچوک کی پہاڑیوں کے اندر عمارتوں میں وہ تابوت بھی یاد آ رہا تھا جس میں خود میری اپنی لاش پڑی ہوئی تھی اور پھر وہ دو تابوت جنہیں دیکھنے کے لئے میں، میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری صبح بھی جہاز کے مسافروں کے شور سے ہی آنکھ کھلی تھی، صوفیہ بھی جاگ گئی تھی، شور کافی بلند تھا۔

”شاید کوئی نئی بات ہو گئی۔“  
”شاید۔“  
”کیا ہو سکتا ہے جہاز تو پرسکون ہے۔“  
”باہر چلیں۔“ سسر صوفیہ نے پوچھا۔

”چلئے یہاں بھی کیا کریں گے اور اگر موقع ملتا تو ہم وہ تابوت بھی دیکھ لیں گے۔“

”منہ ہاتھ دھو لو، میری رائے ہے کہ تھوڑا سا کھانا پی بھی لیا جائے، زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔“ میں نے گردن ہلا دی۔ ہاتھ روم سے باہر نکلی تو عسکری پر نگاہ پڑی سامنے ہی کافی کے برتن بچے ہوئے تھے، صوفیہ نے ناشتہ لگا لیا۔

”ہیلو نشاء۔“ وہ بولا۔  
”ہیلو کیسے ہو؟“  
”آؤ ناشتہ کرلو۔“ اس نے کہا اور میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”کانی کہاں سے ہاتھ لگ گئی؟“  
”خود بنا کر لایا ہوں جانے کیسی بنی ہے۔“ وہ پیکٹی سی مسکراہٹ سے بولا۔

”سوری عسکری تمہیں ہماری وجہ سے۔ آؤ ناشتہ کرو یہ باہر شور کیوں ہو رہا ہے کوئی خاص وجہ ہے، کیا کپٹن روڈرگس کی موت کا اعلان کر دیا گیا ہے؟“

”اس سے بھی زیادہ سنگین صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔“ عسکری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”کیا؟“ ہم دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔  
”رات کو جہاز پر مسافروں کے لئے کرفیو لگا دیا گیا تھا، مسافروں کو کیمپوں میں بند کر کے جہاز کا سیکنڈ آفیسر پورے عملے کے ساتھ کئی لائف بوٹس لے کر فرار ہو گیا۔“

”اوہ مائی گاؤ۔“ صوفیہ کے منہ سے نکلا۔ ”گویا اب جہاز سمندر کے نیچوں نیچے یا درمد دگا رہے۔“  
”چند خلاصی جو کسی خاص وجہ سے فرار نہیں ہو سکے لوگوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں انہوں نے انہیں مار مار کر ادھر مار کر دیا ہے۔“ عسکری نے بتایا اور ہم پر مدنی چھا گئی۔ صوفیہ بولی۔ ”ظاہر ہے وہ لوگ مارشل سے مایوس ہو گئے تھے، مسافروں کا وادہ بھی انہیں ہی برداشت کرنا پڑ رہا تھا اس لئے وہ جہاز چھوڑ کر فرار ہو گئے۔“ عسکری نے جواب نہیں دیا اور خاموشی سے



کھیرا ہٹ ہونے لگی تو میں نے کہا۔

”جلے سسر صوفیہ باہر چلے ہیں۔“

عسکری بھی ہمارے عرشے پر آگیا تھا۔ اس وقت عرشے پر قیامت برپا تھی، عورتیں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا ہم سبے ہوئے ایک گوشے کھڑے ہو گئے، اچانک ہی جہاز کے اسپیکر پر گھر آواز ابھری۔

”براہ کرم خاموش ہو جائیے، خاموشی اختیار کیجئے براہ کرم خاموش ہو جائیے، میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، براہ کرم خاموش ہو کر میری بات سن لیجئے۔“

”بہت بار یہ درخواست سن گئی اس کے بعد لوگ خاموش ہو گئے۔ بولنے والے نے کہا۔“

”میں بھی آپ ہی کی طرح ایک عمر رسیدہ مسافر ہوں، برٹش فوج کا ریٹائرڈ میجر ہوں، میرا نام پیٹرک واسکوڈی ہے، آپ مجھے واسکوڈی کے نام سے مخاطب کر سکتے ہیں زندگی میں لاتعداد حادثات سے گزر چکا ہوں۔ خدا کے لئے جو کچھ میں کہوں غور سے سنئے۔ مارشل انوکھے حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کا کیپٹن روڈرکس مر چکا ہے اس کی لاش اس کے کیمین میں موجود ہے جہاز کے وہ انجینئر بھی مر چکے ہیں جو اس کے تباہ شدہ انجنوں کو درست کر سکتے تھے اور اس کے بعد جہاز کے دوسرے افسر یہ محسوس کر کے کہ جہاز کو سنبھالنا اب ان کے بس کی بات نہیں ہے بحرمانہ طور پر اپنی ذمہ داریوں سے درگزر کرتے ہوئے لائف بوئیں لے کر فرار ہو گئے ہیں، گویا اب اس وقت اس جہاز کا سر پرست کوئی نہیں ہے، جو بچارے خلاصی باقی رہ گئے ہیں ان کے دل میں ایک ہی جذبہ تھا کہ وہ مسافروں کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ ان کے ساتھ ہی قاتل ہو جائیں گے، لیکن آپ لوگوں نے جوش جذبات میں ان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ مارشل کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، ہمیں ان لحاظ میں ان کی اشد ضرورت تھی ہم نے انہیں ان کے نیک جذباتوں کے صلے میں دُخم دیئے ہیں، دوستو! بعض

اوقات زندگی اس طرح موت کے چنگل میں پھنسنے جاتی ہے، اب اگر ہم جی چھوڑ کر ایک دوسرے کو نوچنا اور بھنبھوڑنا شروع کر دیں تو ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ہم آخری سانس تک زندگی کی جدوجہد کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے نظم و ضبط ضروری ہے۔ آپ لوگ بھجھداری سے کام لیجئے۔ اتنی افراتفری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے خدا سے زندگی مانگئے اور اپنے طور پر جدوجہد کیجئے، اگر آپ لوگ مجھ سے اتفاق کریں تو میں آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھے ہاتھ اٹھا کر اجازت دیں اگر آپ لوگ اجازت دیں گے تو میں آگے بات کروں گا ورنہ خاموش ہو جاؤں گا۔“

تقریباً تمام ہاتھ بلند ہو گئے تھے۔ تب اسپیکر سے آواز ابھری۔ ”بے حد شکر۔“ میں یہ چاہتا ہوں کہ نو جوان نولیاں بنا کر مختلف ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ سب سے پہلے ہمیں جہاز پر خوراک کے ذخائر کا جائزہ لینا ہے۔ اس کی ذمہ داری نو جوانوں کی ایک ٹوٹی کو سنبھالنی ہوگی۔ کچھ نو جوان بچن کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ کچھ سے جہاز کی صفائی کا کام لیں گے اور آپ لوگوں میں کچھ ڈاکٹر بھی ہوں گے جہاز پر ڈپنٹری موجود ہے وہ اپنی ڈیوٹی سنبھالیں گے۔ ہم لوگوں میں اگر کچھ انجینئر ہوں تو وہ انجن روم میں اپنے کام سرانجام دیں۔ اگر تقدیر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگی تو یقیناً ہم زندگی تلاش کر لیں گے۔ آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔ آپ مجھے اپنی رائے دیں۔“

جواب میں ہر طرف سے تائیدی شورا بھرنے لگا۔ ”اب میں کچھ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہر شعبہ سے متعلق لوگوں کو بلا کر ان سے ان کی تجاویز لیں اور ان کی خدمات کا تعین کریں۔ میں خود بھی آپ کے درمیان آتا ہوں۔ وہ ایک شاندار شخصیت کا مالک فوجی تھا۔ اسے بہت احترام دیا گیا۔ ایک گوشے میں میز کرسیاں لگائی گئیں جنہیں ایک پپ سے اٹھایا گیا

تھا۔ ایک بہترین ماحول بن گیا تھا۔ صوفیہ نے کہا۔ ”جو کچھ ہو رہا ہے ہم اسے زندگی تو نہیں کہہ سکتے۔ کم بخت جہاز کے عملے نے یہی غدار کی ہے۔“ میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کام شروع ہو گیا۔ مہجری ہدایت کے مطابق نولیاں بننا شروع ہو گئی تھیں اور لوگ اپنے اپنے بارے میں بتانے لگے۔ گیارہ ڈاکٹر تھے جن میں پانچ خواتین تھیں یہ سب مغربی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سی خواتین نے خود کو زبونی کی حیثیت سے پیش کر دیا تھا۔ جہاز پر بے شمار بچن تھے جن میں خاص اشیاء تھیں اس طرح سمندر کی آبادی میں جہاز ایک انسانی جزیرہ بن گیا تھا۔ جہاں سب ایک دوسرے کے دھردل تھے۔ مخلص تھے۔ ماحول بے حد خوب صورت ہو گیا تھا۔ ہر طرف سے تجاویز موصول ہو رہی تھیں۔ ایس او ایس سکیننگ کا بندوبست کیا گیا تاکہ اگر کوئی جہاز کے قریب سے گزرے تو مدد حاصل ہو سکے۔ یہ تجویز پوری سنجیدگی سے سنی جا رہی تھی ایک شخص جو بڑی اچھی شخصیت کا مالک تھا اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

”میرا نام ساون اوگلے ہے۔ آپ لوگوں سے اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اور ایک بے حد کام کی بات بتانا چاہتا ہوں۔“

یہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے تب اس نے کہا۔ ”میرا تعلق فرانسیسی پولیس سے ہے۔ اوری ایٹ ڈپارٹمنٹ سے میرا تعلق ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ممکن ہے آپ لوگوں نے کبھی اوترے گارساں کا نام سنا ہو جو کوئی ملکوں کے سمندروں میں ایک ہیبت ناک عفریت کی حیثیت رکھتا تھا وہ نہ صرف بحری قذاق تھا بلکہ ایک وحشت گرد کی حیثیت سے بھی مشہور تھا۔ سبے شمار انسانوں کا قاتل۔ کوئی چودہ سال تک اس نے بحری قذاق کی۔ لاتعداد جہاز لوٹے۔ الجزائر میں اس نے خوفناک دہشت گردی کی اور ایک سو ساٹھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حکومت الجزائر نے فرانس کے اشتراک سے پرتگال سے درخواست کی تھی کہ اس

کو گرفتار کیا جائے۔ یہ ذمہ داری مجھے سونپی گئی اور میں نے اس کے گرد جال بچھا کر اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ تو دوسرے افراد جو اس کے خاص ساتھی تھے پکڑے گئے اور یہ سارے کے سارے بہترین جہاز والے اور بہترین شب انجینئر ہیں کیونکہ ساری زندگی سمندروں سے بھٹکتے رہے ہیں۔ خود کارساں انتہائی شاندار کپتان اور انجینئر ہے۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جناب اوگلے۔“

ایک شخص نے پوچھا۔ ”دو بے تار ہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے کارساں اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا ہے اور اب میں اسے حکومت الجزائر کے حوالے کرنے کے لئے جا رہا تھا۔“

”اس جہاز سے۔“

”ہاں۔“

”گویا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ۔۔۔۔۔“

”ہاں۔ وہ سب اس جہاز پر قیدیوں کی حیثیت سے لے جائے جا رہے تھے۔“

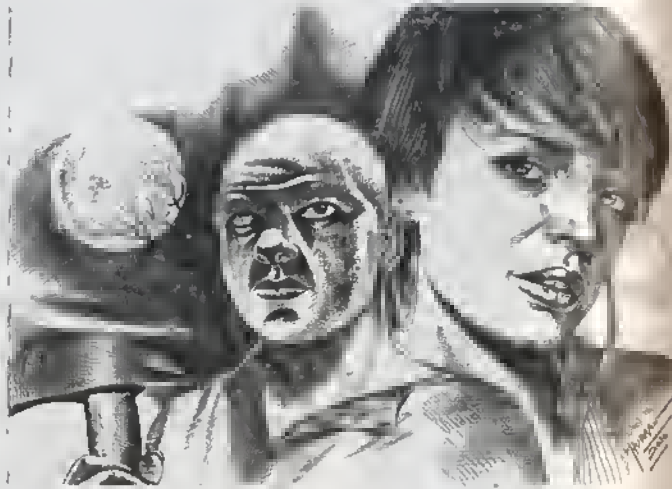
”وہ کہاں ہیں۔“

”جہاز کے قید خانے میں بند ہیں۔ اور اس وقت ہم ان سے جہاز کی درستگی کا کام لے سکتے ہیں۔“

یہ اتنا پرکشش اور انوکھا انکشاف تھا جس نے سمندر کے قیدیوں کو خوشی سے دیوانہ کر دیا۔ ہر شخص اپنی زبان بولنے لگا۔ سارن اوگلے سے فرمائش کی جانے لگی کہ فوراً اس کام کو سرانجام دے۔ انکشاف تو زندگی کی روشنی دکھاتا ہے۔

”ہم انہیں پیشکش کریں گے کہ اگر وہ خود بھی زندگی چاہتے ہیں تو یہ کام سرانجام دیں ورنہ ہمارے ساتھ انہیں بھی مرنا ہوگا۔“

سارن اوگلے ہیرو بن گیا تھا۔ اس کی شخصیت بھی شاندار تھی اور وہ بے حد سخت گیر انسان معلوم تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ”یہ زندگی کی طرف ایک قدم ہے لیکن میں یہ بھی بتادینا چاہتا ہوں کہ کارساں شیطان زادہ



## قاتل

شائستہ سحر - راولپنڈی

سلاخوں میں قید انسان لفظ "ہاگل" سنتے ہی اچانک بپھر گیا اس کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں اس کی تیوری پر دل ہڑکنے اور پھر وہ خوفناک انداز سے اپنے سامنے بیٹھے نوجوان پر جھپٹا لیکن پھر اچانک۔۔۔

ذمہ دار پراکھین ہند کر کے بھروسہ کرنے والے اکثر زندہ رہ گئے ہوتے ہیں۔ حق آموز کہانی

"مجھے" اس چیز کا دکھ نہیں کہ میں ایک قاتل ہوں، میں نے کلباڑی کے دھنڈے دار کے لیک شخص کو بے دردی سے قتل کیا ہے اور نہ ہی اس چیز کا انہوں نے کہ میں نے اپنے گھر والوں کو دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں نے اپنی ہوس کے چکر میں سب کچھ ڈاؤن لگا دیا۔ اپنا سب کچھ۔ وہ گھنٹوں میں سردیے روانی سے بڑبڑا رہا تھا۔

"یہ خبی انسان ہر وقت یہی جملے دہراتا رہتا ہے۔" ڈاکٹر سجاد نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک پستہ قد نوجوان سے کہا۔

وہ پستہ قد شخص ایک اخباری رپورٹر تھا۔ ڈاکٹر سجاد اس خبی شخص کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی نرم لہجے میں بولے۔ "عمر یہ شیراز صاحب ہیں روزنامہ سچ کے کرائم رپورٹر تمہارے ٹیس پر رپورٹ تیار

"خود کو پرسکون رکھیں۔ ہو سکتا ہے تقدیر ہمیں زندگی دیدے۔"

"جی۔"

"آپ اب تک ناراض ہیں۔"

"ناراض؟"

"جی۔" اس کے اداس لہجے میں کہا۔

"براہ کرم مجھ سے یہ سوال نہ کریں جس کے جواب سے آپ کی دل آزادی نہ ہو۔ ان لحاظات میں کسی ذاتی احساس کو نمایاں کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ آپ نے خاص طور سے جہاز پر جس طرح ہمارا ساتھ دیا ہے۔ اس کا شکریہ نہیں ادا کیا جاسکتا۔"

عسکری صفائی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

دوسری طرف فرانسیسی ایجنسی کے افراد اپنے افسر کی سرکردگی میں قیدیوں کو اوپر لانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اسی وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ مجھے وہ پراسرار شخص البرٹوس یاد آیا جو دو تابوت لے کر الجوز اتر جا رہا تھا۔ یہ تابوت بھی تو جہاز کے نچلے حصے میں تھے۔ مجھے اس پراسرار گھر کے وہ تابوت یاد تھے جن سے میری زندگی کے گہرے راز وابستہ تھے۔

بے اختیار امیر اداں چاہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں ان تابوتوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں۔ میں نے ایک لمحہ سوچا پھر عسکری سے بولی۔

"کیا تم ایک کام کر سکتے ہو۔"

"دل سے تیار۔"

"تمہیں البرٹوس کے بارے میں معلوم ہے جو پراسرار طور پر مر چکا ہے اور جو دو تابوت لے کر جا رہا تھا۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔"

"میں وہ تابوت دیکھنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا اور عسکری حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

سٹر صفیہ بھی میری اس انوکھی فرمائش پر دنگ رہ گئی۔ (جاری ہے)

ہے۔ یہ لوگ بدترین قاتل، خطرناک دہشت گرد اور خطرناک شیطان صفت ہیں۔ ہم انہیں آزادی نہیں دے سکتے بلکہ ان پر تشدد کر کے ہی ہم ان سے کام لیں گے۔ انہیں آزادی دینا پورے مسافروں کے لئے خطرناک ہوگا۔

دوسری حکومت میں بھی وہ ہمارے لئے خطرناک ہوں گے۔

اس کے لئے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔

"ٹھیک ہے یہ حق آپ کو دیا جاسکتا ہے۔ آپ ان سے کب بات کریں گے؟"

"فوراً۔ میرے ساتھ میری ایجنسی کے نہیں افراد موجود ہیں جو انہیں کنٹرول کر رہے ہیں۔ میں انہیں کے ذریعے انہیں قابو کروں گا۔"

"مجھے اعتراض ہے سر۔" ایک شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ "میں برٹش عدلیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس وقت جب کہ جہاز مصیبت میں گھرا ہوا ہے اور یہ شخص موت کا انتظار کر رہا ہے دنیا کے کسی ملک کا قانون کسی کو حراست میں رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

اس وقت ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "میں بھی پیرسٹر ہوں۔ بینک ان لحاظات میں یہ شخص آزاد ہے۔ لیکن ان حالات کا اپنا قانون ہے اور خطرناک لوگوں کو قانون کا تحفظ دے کر باقی لوگوں کو عذاب میں گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔"

"گویا آپ چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ ان سے کام لینے کے لئے ان پر تشدد غیر مناسب ہوگا۔"

"بالکل۔"

"آپ کے فیصلے پر مجھے اعتراض نہیں۔"

"یہ بحث جاری تھی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے قریب آ کر کھڑا ہوا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ عسکری تھا۔ "آپ ٹھیک ہیں شام۔"

"ہاں شکریہ۔"



کرنا چاہتے ہیں۔

عمر نے یکدم اپنا سر اوپر اٹھایا اس کی کئی راتوں سے جاگی ہوئی آنکھوں میں خوفناک قسم کی جنونیت اور سفاکی تھی، وہ شعلہ بار نظروں سے اس اخباری رپورٹر کو گھورتے ہوئے ناگوار سی بولا۔

”اس گدھے کو اب خیال آیا ہے رپورٹ لکھنے کا، میں پچھلے پانچ سالوں سے تمہارے اس زندان نما اسپتال میں مڑ رہا ہوں۔“

وہ اخباری رپورٹر عمر کے منہ سے اپنے لئے ”گدھے“ کا لفظ سن کر کھڑک اٹھا۔ ”یہ شخص تو انتہائی بدتمیز ہے۔“

ڈاکٹر سجاد حقل سے بولے۔ ”سوری سر شیراز! ہمارے یہ مریض اپنے حواسوں میں کب ہوتے ہیں، یہ ہر قسم کی تمیز کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔“

اخباری رپورٹر جواب بولا۔ ”میں جانتا ہوں یہ پاگل ہوتے ہیں۔“

رپورٹر کے منہ سے عمر نے اپنے لئے ”پاگل“ کا لفظ سن کر بھڑ گیا اور غصے سے اس پر جھپٹ پڑا۔ ”تو نے مجھے پاگل کہا..... میں پاگل نظر آتا ہوں تجھے۔“ عمر اس کا گریبان نوچتے ہوئے غرایا۔ ”پاگل تو تم لوگوں نے مجھے بنایا ہے..... میں پوچھتا ہوں پہلے کہاں تھے تم جب میں یہاں زبردستی قید کیا گیا تھا۔ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں مجھے جانے دو مگر میری بات کسی نے نہ سنی اب جب میں ختم ہو گیا ہوں تو تم اب میرا کیس لوگوں کے سامنے لانے کے لئے آئے ہو، اب کیا فائدہ؟ سب لے اڑے وہ سب کچھ۔“

وہ اخباری رپورٹر کا گریبان جھنجھوڑ کر چیخ رہا تھا، قریب تھا کہ وہ اس کا گلا ہی وہاں دیتا، ڈاکٹر سجاد نے اپنی مدد کے لئے اسپتال کے دیگر عملے کو بلالیا۔ بڑی مشکل سے اس اخباری رپورٹر کو عمر کے ہاتھوں کی گرفت سے نکالا گیا۔ تین چار بندے عمر کو گھسیٹے ہوئے دارڈ میں لے گئے۔ عمر بدستور چیخ دینا کر رہا تھا۔

ڈاکٹر سجاد شیراز کو اپنے روم میں لے آئے۔ شیراز

اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے میرے منہ سے کچھ ایسا نکل گیا جس نے اس جنونی کو اشتعال دلادیا۔“

ڈاکٹر سجاد شرمندگی سے بولے۔ ”میں بہت معذرت چاہتا ہوں، بہت کم ایسا ہوتا ہے جو عمر اس قسم کے رد عمل کا اظہار کرے زیادہ تر بالکل پرسکون ہی رہتا ہے۔“ شیراز ایک خیال کے تحت بولا۔ ”مجھے یہ شخص پاگل نہیں لگتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شدید قسم کے صدمے کی وجہ سے اس پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔“

ڈاکٹر سجاد وہمے لکھے میں بولے۔ ”اگر یہ لڑکا بالکل نہ ہوتا تو یوں آپ پر حملہ کرتا؟ دراصل اس لڑکے کو کوئی پاگل کہتا ہے اس پر وحشیانہ انداز سے جھپٹ پڑتا ہے۔“ شیراز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”قمر کا مریض کافی مشہور مریض ہے مگر اس کے اصل حقائق آج بھی لوگوں سے پوشیدہ ہیں۔“

”مجھے بڑا تجسس ہے میں اس کیس کے اصل حقائق کو جان سکوں اب جبکہ میں نے ایک اخبار کو کرائم رپورٹری حیثیت سے جوائن کر لی آیا ہے تو سب سے پہلے اپنے اس تجسس کو ختم کرنے آیا ہوں۔“

ڈاکٹر سجاد فوراً بولے۔ ”شیراز صاحب عمر کو اس اسپتال میں آئے ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں، عدالت کی طرف سے یہ مجرم ثابت ہو چکا ہے تاہم یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ عمر ایک جنونی قسم کا خطرناک دہشی مریض ہے۔ اگر اس وقت اس کے لئے کوئی آگے بڑھتا تو شاید اصل حقائق سامنے آجی جاتے مگر اب میرا نہیں خیال کہ کچھ فائدہ ہوگا۔“

شیراز سنجیدگی سے بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب عمر نے ایک قتل کیا ہے یہ ثابت بھی ہو چکا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ عمر ایک قاتل ہے مگر اس نے قتل کس وجہ سے کیا؟ یہ بات مجھ میں نہیں آتی جبکہ عمر اس کے مقتول بھائی قمر کی کوئی خاص جاسید اد بھی نہیں تھی۔ دونوں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔“

ڈاکٹر سجاد نے بے ساختہ کیا۔ ”میرا نہیں خیال کہ

ایک دہشی مریض کو قتل کرنے کے لئے کوئی وجہ درکار ہوتی ہے، دروازے کی حالت میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ شیراز نے تائید میں سر ہلایا۔ ”بالکل ٹھیک کہا آپ نے اب ذرا یہ بھی بتائیے ان پانچ سالوں میں کسی اور نے بھی اس کیس کو کریدنے کی کوشش کی؟“

ڈاکٹر سجاد ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ”میں کسی نے بھی کوشش نہیں کی جب میرا ٹرانسفر اس اسپتال میں ہوا تھا تب عمر کو اس اسپتال میں لگ بھگ دو سال ہو چکے تھے اس سے پہلے کسی نے کوشش کی، ہونو الگ بات ہے کم از کم میری موجودگی میں تو آپ پہلے شخص ہیں جو اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں، اور ایک بات میں ضروری سمجھتا ہوں آپ کو بتانا، میں جب اس اسپتال میں آیا تو یہاں کے عملے ہی نے مجھے بتایا کہ مجھ سے پہلے جو ڈاکٹر یہاں تعینات تھا وہ عمر کو کچل کے جھکے اور دیگر تکلیف دہ طریقوں سے گزارتا رہتا تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ عمر حد سے زیادہ جنونی فطرت کا تھا اور مجھے بھی عمر سے متاثر رہنے کا کا گیا، جب میں عمر سے ملا تو میں نے اسے اکثر ایک خبی بات ہراتے ہوئے سنا ہے جو آپ بھی سن چکے ہیں اگر عمر کو پاگل کہا جائے تب اس پر بھگان طاری ہو جاتا ہے اور شدید بیجانی کیفیت میں یہ چٹنا چلاتا ہے حتیٰ کہ قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کا عملی مظاہرہ آپ اپنے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔“

شیراز ایک لخت بولا۔ ”جی ہاں! دیکھ بھی چکا ہوں اور کچھ بھی چکا ہوں، آپ نے غور نہیں کیا، عمر کے لہجے میں شگہ تھا کہ میں دیر سے آیا ہوں یعنی وہ کسی ایسے بندے کا انتظار کر رہا تھا جو اس کی حالت زار کو لوگوں کے سامنے لا سکے۔“

ڈاکٹر سجاد ایک گہرا سانس لے کر بولے۔ ”شیراز صاحب آپ بہت عجیب انسان ہیں، وہ بندہ آپ پر قاتلانہ حملہ کر چکا ہے اور آپ کو پھر بھی اس سے امید ہے کہ وہ آپ کو اپنے متعلق کچھ بتائے گا۔“

شیراز نے اٹھتے میں سر ہلایا۔ ”جی بالکل یقین ہے کیونکہ میں مایوسی کو گناہ سمجھتا ہوں اگر اس مریض سے

کچھ جاننے کی کوشش کی جائے تو وہ ضرور بتا دے گا۔“ ڈاکٹر سجاد شیراز کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ ”آپ کا کیا خیال ہے کہ عمر سے کچھ جاننے کی کوشش پہلے نہیں کی گئی ہوگی؟ میں نے بہت کوشش کی انکوائری کی پیار سے نری سے سختی سے عمر کو دس سے کم نہ ہوا۔“

شیراز حقل سے بولا۔ ”آپ کا اپنا انداز ہے ڈاکٹر صاحب اور یقیناً بہت بہتر ہوگا لیکن میرا اظہار یقینہ ہے، صرف ایک بار مریض سے اکیلے میں مجھ کو ملنے کا موقع دیا جائے۔“

”کیا اکیلے میں؟ ناممکن..... آپ نہیں جانتے یہ سب کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر سجاد یکدم گھبرا کر بولے۔

شیراز ڈاکٹر سجاد کو قائل کرتے ہوئے بولا۔ ”میں سب جانتا اور سمجھتا ہوں اگر کوئی بھی مسئلہ ہوا یا قمر نے مجھ پر حملہ کر دیا تو میرے شور سے آپ لوگوں کو پتہ چل ہی جائے گا البتہ مجھے یقین ہے اس بات کی نوبت ہی نہیں پیش آئے گی۔“

ڈاکٹر سجاد پریشانی سے بولے۔ ”یہ رسک آپ اپنی ذمہ داری پر لے رہے ہیں۔“

شیراز مسکرا کر بولا۔ ”بالکل میں خود ذمہ دار ہوں گا۔ ہر طرح کے حالات کا۔“

شیراز کو ڈاکٹر سجاد کی طرف سے عمر سے اکیلے میں ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی تو وہ خوش تھا۔ اگلے دن شام چار بجے وہ سنٹل ہاسٹل پہنچا ڈاکٹر سجاد نے پہلے سے ہی عمر سے ملاقات کا بندوبست کر دیا تھا۔ شیراز بڑے جوش و خروش سے ایک کمرے میں بیٹھا تھا، ورسمان میں ایک میز تھی۔ جس کے اوپر نوٹ بک اور پین رکھے تھے، شیراز بڑے غور سے سامنے دیکھ رہا تھا کیونکہ سامنے والی کرسی پر عمر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”یو جی سر جھکائے بیٹھے رہے ہو گے۔“ شیراز دھیمی مسکراہٹ سے بولا۔ ”مگر عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔“

”مجرم نہیں ہو تو سراٹھا کر بات کرو چپ کیوں ہو؟“ شیراز اسے جواب دینے پر اکساتے ہوئے بولا۔

عمر نے آہستگی سے اپنا سر اٹھایا اور شیراز کو خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے نفرت سے بولا۔ "میں مجرم ہوں میں نے انکار نہیں کیا۔ خونیں ہوں میں، ایک قتل کیا ہے میں نے! جانے ہو کس کا؟ اپنے گتے بھائی کا مگر۔۔۔ مگر میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔ نہیں ہوں میں پاگل۔"

"میں جانتا ہوں تم پاگل نہیں ہو مگر۔" شیراز کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا۔ "کیا یہ تمہیں پاگل بنادیا گیا ہو مگر کیوں؟ میں بھی جانتے آیا ہوں۔"

"بہت دیر ہو چکی ہے، اب تم جاؤ یہاں سے مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔" عمر قدرے غصے سے بولا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ تمہیں میری ضرورت ہے؟" شیراز بھید کی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ مگر جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے وہ منظر عام پر آنا چاہئے کیا یہ اسے جان کر کئی لوگوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے کیا تم چاہو گے کہ تمہاری طرح کئی اور عمر جنم لیں اور یوں قید خانے میں اپنی زندگی کا بہترین وقت برباد کر دیں۔ تم چاہو گے ایسا؟"

عمر جواباً چپ رہا تو شیراز انتہائی غصے سے اٹھ کر بولا۔ "ٹھیک ہے تم منت بناؤ مجھے، جو راز تمہارے سینے میں دفن ہیں ان رازوں کو اپنے ساتھ لے کر قبر میں چلے جانا اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ میں آج چلا جاؤں گا پھر میرے بعد یہاں کوئی اور تمہارے حقائق جاننے نہیں آئے گا۔"

یہ بات کہہ کر شیراز نے عمر کا رد عمل جاننے کے لئے بڑے غور سے اسے دیکھا، عمر بدستور کسی بے جان جسم کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔

شیراز نے گہرا سانس لے کر افسوسناک انداز میں عمر سے کہا۔ "جیسے تمہاری مرضی۔" یہ کہتے ہوئے وہ پلٹنے لگا تو یک لخت عمر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ "گھبرو۔"

شیراز نے پلٹ کر عمر کی طرف دیکھا۔ عمر کے وجود

پر لرزہ طاری ہو گیا، ایک شدید دکھ کی لہر اس کے چہرے واضح تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی وہ کچھ نہیں ہوئے لبوں سے بولا۔ "بھئی۔"

شیراز انتہائی خاموشی سے اس کے سامنے بڑھ گیا۔ وہ خامشی میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "میں یعنی عمر میرا مقول بھائی قمر دونوں بڑوں بھائی تھے، بڑا پیدا اس کے وقت ہی ہماری والدہ کا سایہ ہمارے سر اٹھ گیا تھا ہم دونوں بھائیوں نے بد قسمتی سے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا تھا جو ایک مدت سے غربت و افلاس کی خوفناک پرچھائیاں کا شکار تھا جہاں ایک گہری مادی تھی اور اس مادی میں ہمارے غربت زدہ ذہن کی کچھ ٹپٹے تھے کہ ہماری حالت کبھی نہیں بدل سکتی، ہمارا زندگی بہترین آسائشوں پر کوئی حق نہیں، ہمارا مقدر صرف موت و مشقت کر کے درد و کٹ کی روٹی کھانا ہے اور یوں زندگی گاڑی کو رواں دواں رکھتے ہوئے موت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے، ہم میں اپنی حالت سدھارنے کا کوئی جذبہ نہ بہت چھوٹی عمر میں ہم دونوں بھائی محنت و مزدوری پر لگ گئے تھے اور یوں محنت و مشقت کرتے ہوئے ہم دونوں بھائیوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔"

میں نہیں چاہتا تھا میرے والد اس بڑھاپے میں مزدوری کریں مگر وہ ایک خوددار انسان تھے انہیں خدا کے سوا کسی کا محتاج ہونا پسند نہ تھا اور پھر ایک دن اسی خودداری کی لالچ رکھتے ہوئے وہ موت سے جا ملے، کام کے دوران ہی ان کو دل کا جان لیوا دورہ پڑا اور یوں باپ کا سایہ بھی ہمارے سر سے اٹھ گیا۔"

باپ کے مرنے کا ہم دونوں بھائیوں کو بہت دکھ تھا کافی دن تک ہم بے دلی سے زندگی کے دن گزرتے رہے، وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے، آہستہ آہستہ ہمارے صدمہ بھی کم ہونے لگا اور ہم دونوں بھائی پہلے کی طرح زندگی جینے کی جدوجہد میں خوب محنت اور مشقت کرنے لگے۔

قمر کی عجیب عادت تھی وہ جو کما تھا اس میں کچھ نہ کچھ ضرور اپنے پاس جوڑ کر مختلف قسم کے انعامی بانٹ لیتا

رہتا تھا اور پانچ وقت کی نماز میں ان کے نکلنے کی خصوصی دعا مانگا کرتا تھا۔ عقیدہ پختہ ہوا تو انسان جو چاہتا ہے وہ ایک دن ضرور پالیتا ہے اسے بھی بھروسہ تھا خدا پر۔

ایک دن میری طبیعت ٹھیک نہ تھی میں اس روز کام پر نہ جاسکا اور سارا دن چار پانی پر پڑا رہا، شام کے وقت اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور قمر اس میں سے نمودار ہوا، وہ خوشی سے سرشار آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ "تو کہتا تھا میں بے وقوف ہوں میرا انعامی بانٹ کبھی نہیں نکلے گا مگر یہ دیکھ۔" اس نے میرے سامنے اپنا انعامی بانٹ اور اس کی قرعہ اندازی وائی لٹ لہرائی۔ "پورے دس لاکھ کا انعام نکلا ہے میرا۔"

میں حیرت سے اٹھ بیٹھا اور خود اس کو پکڑ کر دیکھا جہاں مطلوبہ نمبر کے نیچے قمر نے لائن لگا رکھی تھی۔ قمر نے فوراً اپنا انعامی بانٹ والا نمبر دکھایا، اس کا وائی دس لاکھ کا انعام نکلا تھا۔

دس لاکھ میرے لئے بہت بڑی رقم تھی۔ قمر نے حتی سے مجھے مع کیا کہ میں انعام دہائی بات کا ذکر کسی سے نہ کروں کیونکہ اس نے خود بھی میرے علاوہ کسی کو بھی اس بات کا نہیں بتایا تھا۔

میں پوری دنیا سے یہ بات چھپا سکتا تھا مگر ایک ایسی ایسی تھی جس سے میں اپنی زندگی کی کوئی بات نہیں چھپا پاتا تھا، اسے میں اپنے دل و جان سے چاہتا تھا وہ بھی میرے تایا کی اکلوتی بیٹی مینا۔

میں بچپن سے ہی مینا کو بہت پسند کرتا تھا اور جوانی میں بھی پسندیدگی محبت میں بدل گئی۔ مینا سے میری محبت چھپی ہوئی نہ تھی اور مینا بھی مجھ سے اس طرح سے پیش آتی تھی جیسے وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہو مگر اپنی اس محبت کا اظہار اس نے کبھی مجھ سے نہ کیا تھا۔

تاہم ہم دونوں تقریباً وہی شام کے وقت جمیل کے کنارے بیٹھ کر کافی دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نے انعامی بانٹ کے نکلنے والی بات مینا کو بتائی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"کیا ج؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"تو کیا میں تیرے ساتھ جھوٹ بولوں گا؟" میں جان بوجھ کر ہلکی سی خفگی سے بولا۔

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا مگر قمر اتنی بڑی رقم کا کیا کرے گا؟" مینا فوراً بولی تو میں کاندھے اچکا کر بولا۔ "مجھے کیا پتہ شاید کوئی کاروبار شروع کرے۔"

وہ بھڑکی۔ "وہ جیسا بھی ہے کم از کم تم سے تو سمجھدار ہی ہے۔ اس نے اپنے لئے کچھ کیا تو ہے۔" میں مسکرا کر بولا۔ "اس نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا میری جان! اس کی قسمت ساتھ دے گئی ہے۔"

وہ منہ پھلا کر بولی۔ "جو بھی ہے تم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا۔" میں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "چھوڑو دن باتوں کو ہر کوئی اپنی قسمت کے مطابق سب کچھ حاصل کرتا ہے، قمر کی قسمت اچھی تھی میری اتنی نہیں ہے مگر کیا پتہ زندگی میں کبھی میں بھی اس کی طرح اتنی بڑی رقم کا مالک بن جاؤں۔"

مینا سر جھٹک کر بولی۔ "تم بس خواب ہی دیکھتے رہنا اور لوگ عملی کوشش کر جاتے ہیں۔ مجھے ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔" اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا سوچنا پڑے گا؟" میں حیرت سے سوالیہ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ مجھے شش و پنج میں مبتلا کر کے کسی بہرانی کی طرح فلاںچیں بھرتی ہوئی دور نکل گئی اور میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

قمر دس لاکھ کا انعام فوراً حاصل کرنا چاہتا تھا اس لئے اگلے دن ہی انعام لینے کے لئے گھر سے نکل گیا مگر بد قسمتی سے راستے میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس حادثے میں اس کی جان تو بچ گئی مگر ٹانگ پر گہرا زخم آیا۔ ڈاکٹر نے قمر کو کم از کم ایک ہفتہ تک آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ قمر بھی بڑی مشکل سے وہ قدم چل پاتا تھا۔ اس لئے میں ہی قمر کا خیال رکھتا تھا۔ قمر کو انعامی رقم لینے کی جلدی تھی مگر وہ اس معاملے میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر رہا تھا حتیٰ کہ مجھ پر بھی نہیں۔ حالانکہ میں اسے کئی بار کہہ چکا تھا کہ انعامی رقم مقررہ مدت سے پہلے میں خود اسے لا دیتا ہوں



مگر وہ مانتا تھا ناں!

نہیں۔

اس دن میں کام سے ذرا جلدی واپس آیا تھا، دل چاہا تو پھیل کے کنارے چلا آیا، میں نے دور ہی سے دیکھا کہ وہ میرے انتظار میں بیٹھ چینی سے وہاں کھل رہی تھی میں آتے ہی بولا۔ ”آج تو بڑا سہانا دن ہے جو چاند ہمارے انتظار میں پریشان ہے۔“

”میتا میری بات سن کر غصے سے سرخ ہو گئی۔ ”تمہیں اپنی فضول قسم کی باتوں سے فرصت نہیں! اور یہاں میں سوچ سوچ کر کٹھن حال ہو رہی ہوں۔“

”کیوں ایسا کیا ہو گیا؟ جو تم پریشان ہو۔“ میں گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں دس لاکھ کے متعلق سوچ رہی ہوں۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”کیا یہ دس لاکھ ہمارے دماغ پر سوار ہو چکے ہیں؟ میں نے بہت بڑی غلطی کی جو تمہیں بتا دیا۔“ میں غلطی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں اتنا ناراض ہو رہے ہو؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ہمارا مستقبل شاندار ہو۔“ میں بدستور سخت لہجے میں بولی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو صاف صاف بات کرو۔“ میرے لہجے میں یہ بات کہتے ہوئے سختی آتی تو وہ اچانک میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور انتہائی نرم لہجے میں بولی۔

”مجھے غلط مت سمجھو عمر، میں یہ چاہتی ہوں تمہاری زندگی سنور جائے وہ دس لاکھ تمہیں مل جائیں اور تم کوئی اچھا کام دھندہ کر کے اپنی زندگی بناؤ اگر تم اچھا کام نہ لگو گے تو یقیناً میرے ابا اور اماں بھی نور اراخی ہو کر تمہیں میرا رشتہ دے دیں گے اور پھر ہم ایک خوب صورت زندگی کی ابتدا کریں گے مجھے یقین ہے تم جو کام بھی شروع کرو گے اس میں اپنی محنت کی وجہ سے خوب تر بن کر دو گے۔“

میں گہرا سانس لے کر بولا۔ ”تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ دس لاکھ، میں کیسے حاصل کروں گا۔“ قرآن پڑھتے جیتے جی تو وہ رقم مجھے دے گا

میتا فوراً بولی۔ ”یہی تو میں کہہ رہی ہوں قرآن پڑھتے جیتے جی تو وہ رقم نہیں دے گا تو بہتر ہے تم اسے قتل کرو۔“

میتا کے منہ سے اتنی بڑی بات آسانی سے سن کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ”کیا تم مجھے اپنے سگے بھائی کو قتل کرنے کا بول رہی ہو؟ تم ہوش میں تو ہو؟“ میں قدرے غصے سے بولا تو وہ جواباً سخت لہجے میں بولی۔

”اور کیا کرو گے تم، کوئی اور تدبیر ہے تمہارے دماغ میں، رقم حاصل کرنے کی تو بتاؤ مجھے۔“

میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے صرف اتنا پتہ ہے میں ایسا کر نہیں کر سکتا وہ میرا بھائی ہے، میں اپنے بھائی کو کیسے مار دوں، وہ گہری نظروں سے میرا بازو لے کر بولی۔

”تمہارا یہی فیصلہ ہے کیا؟ میں اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تم مجھے بھول جاؤ۔“ وہ اٹھنے لگی تو میں نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا اور بے بسی سے بولا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو کیا میں تمہیں بھول سکتا ہوں؟“ وہ سر دھجے میں بولی۔ ”اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو سب کچھ کر سکتے ہو تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔“

اس نے انتہائی غصے سے میرے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔ ”نہی بات نہیں ہے میتا۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تمہارے سامنے اور ہے ہی کوئی؟ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں مگر کسی کا قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔“

میرے ڈھیلے لہجے کو دیکھ کر اس کا انداز پھر سے انتہائی نرم ہو گیا اور وہ پھر سے بیٹھ کر مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”تم فکر مت کرو یہ سب بہت آسان ہے، تم فکر رات سونے سے پہلے دودھ پا چائے میں بے ہوشی کی دوا دے دینا اور جب وہ بے ہوش ہو جائے گا تو رات کو ہی کلبھاڑی کے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دینا اور وہ کلبھاڑی کے سچے سچے خون میں مٹی کود کر فون کر دینا ہاں خود کو زخمی کرنا مت بھولنا اور بے ہوش ہونے کی اداکاری کرنا، میں صبح ای ای ایو کو لے کر قمر کی عبادت کے لئے آؤں گی اور باقی حالات خود ہی سنجال لوں گی۔ تم نے ہی تو بتایا تھا چند روز

لی قرآن پڑھنا ہے ساتھ کام کرنے والے ایک شخص کے ساتھ جکر اہوا تھا اور اس شخص نے سب لوگوں کے سامنے قمر کو جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی تھی، تو بس ہمارا کام مزید آسان ہو گیا تم پولیس کو بیان دینا کہ تمہیں اس بندے پر شک ہے اسی نے رات کے کسی پہر تمہارے گھر میں گھس کر قمر کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا اور جب تم شور مچا کر جاگے اور اسے روکنا چاہا تو تمہیں بھی اس نے زخمی کر دیا اور فرار ہو گیا۔

چند دن بعد وہ دس لاکھ ہمارے ہو جائیں گے۔“ وہ انتہائی شاطر انداز سے قمر کے قتل کا منصوبہ مجھے بتا رہی تھی اور میں جیڑائی سے اس کے معصوم چہرے کو دیکھ رہا تھا جس پر مجھے کہیں بھی عیاری نظر نہیں آ رہی تھی۔

”بولو کیا منصوبہ ہے؟“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ دوا طلب انداز سے بولی۔

میں بے دلی سے مسکرایا۔ ”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا تم اتنی چالاک ہو سکتی ہو، تم فکر نہ کرو، میں کوشش کرتا ہوں کہ آج ہی یہ کام ہو جائے اور تم صبح اپنے والدین کو لے کر بھاگ جانا۔“

”کیا ج۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے میرے ہاتھوں کو چوم لیا، تم بہت اچھے ہو عمر، اچھا باب میں چلتی ہوں، بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں فوراً بولا۔ ”میتا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی گزبوز ہو جائے۔“

میتا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”تمت ڈرو کچھ نہیں ہوگا، بس تم اپنا کام کرو باقی کے حالات میں سنجال لوں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

مگر مجھے وہ ایک بہت بڑی آزمائش میں مبتلا کر چکی تھی جس پر ہر حال میں مجھے پورا اترنا تھا۔ گھر آ کر میں سبدم ہو کر چار پائی پر گر پڑا میتا کی کبھی ہونئی ایک ایک بات میرے دماغ میں گون رہی تھی۔ مجھے دس لاکھ کا لالچ نہیں تھا صرف اور صرف طلب تھی تو مجھے میتا کی محبت کی، میں میتا کی طرح بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اپنی دائیں جانب دیکھا جہاں قمر کھڑی تھی جس پر ہر حال میں مجھے پورا اترنا تھا۔ گھر آ کر میں سبدم ہو کر چار پائی پر گر پڑا میتا کی کبھی ہونئی ایک ایک بات میرے دماغ میں گون رہی تھی۔ مجھے دس لاکھ کا لالچ نہیں تھا صرف اور صرف طلب تھی تو مجھے میتا کی محبت کی، میں میتا کی طرح بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اپنی دائیں جانب دیکھا جہاں قمر کھڑی تھی جس پر ہر حال میں مجھے پورا اترنا تھا۔ گھر آ کر میں سبدم ہو کر چار پائی پر گر پڑا میتا کی کبھی ہونئی ایک ایک بات میرے دماغ میں گون رہی تھی۔ مجھے دس لاکھ کا لالچ نہیں تھا صرف اور صرف طلب تھی تو مجھے میتا کی محبت کی، میں میتا کی طرح بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اپنی دائیں جانب دیکھا جہاں قمر کھڑی تھی جس پر ہر حال میں مجھے پورا اترنا تھا۔ گھر آ کر میں سبدم ہو کر چار پائی پر گر پڑا میتا کی کبھی ہونئی ایک ایک بات میرے دماغ میں گون رہی تھی۔ مجھے دس لاکھ کا لالچ نہیں تھا صرف اور صرف طلب تھی تو مجھے میتا کی محبت کی، میں میتا کی طرح بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

چار پائی پر بے سندھ بڑا سورا تھا کتنا معصوم لگ رہا تھا اس وقت مجھے اس کا چہرہ، وہ میرا بھائی تھا کتنا بھائی میرا خون۔

اور دوسری طرف میتا بھی جو زندگی تھی میرا روشن مستقبل! میرے اندر دل و دماغ کی ایک جنگ جاری تھی، دماغ نہیں چاہتا تھا کہ میں قمر کو قتل کروں جبکہ دل نہیں چاہتا تھا کہ میتا مجھ سے دور چلی جائے اور پھر وہی وجوہات جیت گئی وہ قمر کے لئے میرے اندر موجود تمام تر جذلوں پر غالب آگئی اور میرا دماغ میرا ضمیر ہار گیا، میں قمر کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔

سونے سے پہلے میں نے دودھ میں بے ہوشی کی دوا ملا کر قمر کو پلا دی تھی۔ قمر دودھ پیتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ رات کے کسی پہر میں ایک انتہائی سفاکانہ فعل کو سر انجام دینے کے لئے اٹھ گیا۔

ہاتھ میں کلبھاڑی تھاتے ہی میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا قمر کی چار پائی کے قریب پہنچ گیا اور دونوں ہاتھوں سے منصوبی سے کلبھاڑی کو بیکر قمر پر وار کیا مگر میری بد قسمتی کہ پہلے وار میں ہی قمر جاگ گیا، وہ دوسرے کر ہا اور ایک زوردار بھیانک چیخ اس کے منہ سے خارج ہوئی، وہ نہ جانے کیسے بے ہوشی سے جاگ گیا تھا شاید بے ہوشی کی دوا کا اثر زائل ہو چکا تھا، تاہم قمر کے یوں چیخنے پر، میں بری طرح سے گھبرایا تھا، میں نے اگلا دار انتہائی تیزی سے کیا ضرب کاری تھی قمر کا سر کترن سے جدا ہو گیا۔

خدا جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا کہ میں انسان سے بالکل درندہ بن چکا تھا، میں وحشی درندے کی طرح مسلسل قمر کی لاش پر وار کرتا گیا یہاں تک کہ قمر کا وجود بکلی ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا تھا۔

دھنستا مجھے باہر سے دروازہ کھینچنے کی آواز آئی، میرا دماغ بالکل سن ہو چکا تھا، پھر مجھے صحن میں کسی کے کودنے کی آواز سنائی دی اور چند ہی لمحوں میں کمرے کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور میرا دماغ گویا سانے دیکھ کر چمکا سا گیا کیونکہ میرے سامنے میرے چچا اور ان کا بیٹا احمد کھڑے تھے۔

میرے چچا ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ اپنے چچا اور کن کو سامنے دیکھ کر

میرے چچا ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ اپنے چچا اور کن کو سامنے دیکھ کر

میرے چچا ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ اپنے چچا اور کن کو سامنے دیکھ کر

میرے چچا ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ اپنے چچا اور کن کو سامنے دیکھ کر

میرے چچا ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ اپنے چچا اور کن کو سامنے دیکھ کر

میں دنگ رہ گیا، مجھے سمجھ نہ آئی وہ کیسے جاگ گئے تھے اور کیسے عین موقع پر پہنچ گئے تھے؟  
دماغ نے یہی کہا کہ قمر جو دروازہ آواز میں چنچا تھا تو یقیناً وہی جیج ان کو صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے یہاں پہنچ لائی تھی۔

میرے ہاتھوں میں خون آلود کپھاڑی تھی۔ میرے سامنے قمر کا کئی ٹکڑوں میں تقسیم وجود تھا۔ اور اس کے خون کے چھیننے میرے ہاتھوں اور چہرے کو میرے کپڑے سمیت داغ دار کر گئے تھے میں بری طرح سے پھنس چکا تھا، بچاؤ کی کوئی راہ نہ تھی۔ میں آکر قتل سمیت ان کے سامنے موجود تھا، اس لئے حیران و پریشان بس ان کو ہی گھورے جا رہا تھا۔

”عمر یہ کیا کر دیا تم نے؟“ میرے چچا قریب آتے ہی مجھے پھنچھوڑتے ہوئے چلے۔

مگر میں تو جیسے پھر کا بن چکا تھا پکڑے جانے کے صدمے نے میرے ہوش و حواس شکل کر دیئے تھے، مجھ پر سکتہ سا طاری ہو چکا تھا۔ میرے دماغ پر جیسے ایک دھند سی چھا گئی تھی، ایسے میں میرا دل بس ایک ہی سوال کر رہا تھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

اور دماغ انتہائی حقارت سے کہہ رہا تھا۔ ”اے ہاتل اور قاتل کی داستان تازہ کرنے والے بد بخت انسان! اپنے ہی بھائی کے خون سے ہاتھ رنگتے والے وحشی درندے! جو تو کر چکا ہے اس کا انجام اب کرب و اذیت سے جھگٹنا ہوگا، یا پھر پھانسی کا پھندا تیرا منتظر ہے۔“

اور پھر اسی رات مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس کی حراست میں تھا نے میں دو دن تک میں رہا پھر مجھے جیل بھیج دیا گیا۔

حالات نے جیسے پلٹا کھایا تھا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ جیل میں ہی مجھ سے مینا ملنے کے لئے آئی۔ مینا کو کھیتے ہی میں تڑپ کر بولا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟“

مینا نے سلاخوں کو کچڑتے ہوئے انتہائی تحمل سے کہا۔ ”حیران تو میں بھی ہوں کہ ایک دم سے یہ سب کیا ہو گیا مگر تم فکر مت کرو ابھی ایک راستہ باقی ہے۔“

میں دکھ سے بولا۔ ”اب کیا باقی رہ گیا ہے؟“ پھانسی چڑھنا یقینی ہے کیونکہ میں آکر قتل سمیت گرفتار ہوں۔“

وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں یہاں نہیں چڑھنے دوں گی، یہ میرا تم سے وعدہ ہے میں نے سب چچا کے بیٹے احمد سے بات کی ہے اس کا جائزہ دلا گیا۔ بہت اچھا دیکھلے، وہ ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا۔“

الحال اس نے مجھے جو تہارے بچاؤ کی تدبیر بتائی ہے، وہ دیکھیں ابھی کچھ دیر میں خود آکر سمجھا دے گا۔“ احمد جو کہ میرا چچا زاد تھا پڑھا لکھا تھا اور کام مہذب اچھا کرتا تھا مگر میں حیران تھا احمد مجھے کیوں بچانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس نے مجھے جس حالت میں فری لاش کے پاس دیکھا تھا اس میں تو کوئی بھی جھجھکے سا دکھ نہ دے کے پھانسی چڑھ جانے کی خواہش کرتا۔

میں نے یہی سوال مینا سے کیا تو وہ بولی۔ ”میں نے احمد سے خود بات کی ہے تم فکر مت کرو اس نے تمہارا مدد کرنے کا مجھ سے وعدہ کیا ہے اور ہاں قمر کا وہ انعامی بانڈ میں نے وہاں پہنچتے ہی اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ یہ بت پوچھو کتنی مشکل سے ڈھونڈا اور کیسے دوسروں کی نظروں سے بچ کر یہ سب کیا، اب میں نے رقم بھی دیکھ سے نکال ہے اتنی بڑی رقم کو بڑی احتیاط اور حفاظت نے میں نے گھر میں ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیا ہے۔“

میں حیران رہی سے مینا کے منہ سے وہ ساری تفصیل سن رہا تھا، وہ ویلی پتلی سی دھان پان ی لڑکی تھی پانچاں اور پھر تلی تھی کتنی تیزی سے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔“

پھر بولی۔ ”تم فکر مت کرو بس کچھ مدت سوچو جب تک ہو جائے گا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مجھے بڑے حوصلے سے تسلی دے کر لوٹ گئی۔ اس کے کہنے کے مطابق کچھ ہی دیر بعد احمد ایک ادیب و عمر وکیل کے ساتھ مجھ سے ملنے آیا اور اس وکیل نے مجھے بچاؤ کی جو تدبیر بتائی اسے سن کر واقعی میرے دل میں جینے کی انگ ایک بار بار سے جاگ اٹھی۔

تدبیر یہ تھی کہ وہ وکیل عدالت میں یہ ثابت کرنے

کی کوشش کرے گا کہ میں ایک ذہنی مریض ہوں اور یہ قتل میں نے اپنے ہوش و حواس میں نہیں کیا بلکہ دورے کی حالت میں کیا اور مجھے بھی اپنی طرف سے ایک ذہنی مریض کی پوری آڑ کا کری کرنا پڑے گی۔

وہ وکیل مجھے جو ہدایات دیتا گیا میں ان پر عمل کرتا تھا۔ عدالت میں میرا دیکھنا لینے کا بھی آرڈر دیا گیا اور مجھے جلا وطن پولیس اہلکاروں کے حوالے کر دیا گیا تاہم میں اپنے موقف پر ڈٹ رہا ہوں کہ ظالمانہ تشدد کے باوجود میں نے قمر کے قتل سے لاش کی اٹھارہ کیا۔ آخر عدالت نے مجھے مشنل ہاسپتال علاج کے لئے بھیج دیا۔

کیس کا کافی عرصہ چلا پھر آخر ثابت ہو گیا کہ میں ایک خطرناک قسم کا ذہنی مریض ہوں جس کو کسی بھی وقت وارہ پر سکتا ہے۔ اس لئے عدالت نے مجھے ٹرل ہونے تک علاج کے لئے مشنل ہاسپتال میں بھیج دیا۔ میں خوش تھا کہ میرے ذہنی مریض ہونے کی گواہی احمد کے والد یعنی میرے چچا اور مینا کے والدین نے بھی دی تھی انہوں نے مجھ پر یہ یحسان کیوں کیا تھا، میں نے بعد میں جانا تھا۔

میشنل ہاسپتال میں آنے کے بعد ایک سفاک ڈاکٹر نے جس قدر میرے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا وہ بیان سے باہر ہے، میں وہاں کسی جانور سے بدتر زندگی گزار رہا تھا اور بے تابانی سے مینا کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آکر وہاں سے ملے لے جائے گی اور آخر ایک دن میرا انتظار بھی ختم ہو گیا، مجھ سے ملنے اسپتال میں آئی، مجھے سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا گیا تھا۔

میں مینا کو دیکھ کر تڑپ کر بولا۔ ”مینا کچھ سوچو یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اب جبکہ عدالت سے میرا کیس بھی خارج ہو چکا ہے سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے جب بھی یہ اسپتال والے مجھے جانے نہیں دے دیں میں انہیں کتنی بار دھمکاتا ہوں کہ میں پائل نہیں بلکہ پائل ٹھیک ہوں جب بھی روکے جانے نہیں دیتے بلکہ انہوں نے جو میرے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہے وہ میں تمہیں بتائیں سکتا۔“

وہ سفاک ڈاکٹر مجھے واقعی پائل بنانا چاہتا ہے، ہر دفعہ مجھے کھلی کے جھٹکے لگاتا ہے اور بری طرح مارتا پینتا

ہے۔ اپنی حالت بیان کرتے ہوئے میں واقعی رو پڑا۔ مینا میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرگوشی سے بولی۔ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم واقعی پائل ہو جاؤ عمر۔“ مینا کی بات سن کر میری آواز جیسے حیرت سے پھٹ ہی گئی۔ ”کک۔۔۔ کیا مطلب؟“ میں ہلکایا۔

مینا سکر کر بولی۔ ”مطلب یہ کہ یہ سب میرے ہی کہنے پر ہو رہا ہے۔ اس ڈاکٹر نے تمہیں پائل بنانے کی قیمت وصول کی ہے، اب میں نہیں چاہتی کہ تم بھی اس پائل خانے سے باہر نکلو۔“

”مگر کیوں؟“ میں حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں چنچا۔

وہ ایک بار پھر مجھ پر حیرت کا پہاڑ گراتے ہوئے بولی۔ ”اس لئے کہ میں اب احمد سے شادی کر رہی ہوں، اب تم یہ سوال کرو گے کہ کیوں؟ تو فرق صاف ظاہر ہے تم خود غور کرو، احمد تم سے کہیں بہتر ذہین اور اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے ہر انسان کو اچھی سے اچھی چیز کی تلاش ہوتی ہے اور مجھے تم سے بھی اچھی چیز مل چکی ہے اب میں اور احمد قمر کے اس پرائز بانڈ کی رقم سے ایک خوب صورت زندگی کا آغاز کریں گے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔“ میں تھلا کر بولا۔

وہ طنز پر انداز میں ہنس پڑی اور زیر لب بڑبڑائی۔ ”پیار! آج کل کے دور میں یہ پیار جیسا لفظ کسی مذاق سے کم نہیں یہ پیار و یار تم جیسے سرچھروں کے لئے کوئی چیز ہوگا مگر میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔“

میں نے نفرت سے مینا کی طرف دیکھا۔ ”تم کتنی گھٹیا اور شاطر از فطرت کی بالکل ہو، مینا خدا کی قسم میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا جو تم نے میرے ساتھ کیا، تمہیں ذرا خیال نہیں آیا کہ میں نے تمہاری محبت میں اپنے بھائی کی جان لے لی اور اپنی جان واؤ پر لگا دی آخر مجھ سے محبت کا ڈھونگ کیوں رہا یا تم نے اگر تمہیں پیسے ہی چاہئیں تھے تو چڑھ جانے دیتیں مجھے پھانسی! کیوں مجھے پائل بنا کر اس اسپتال میں ایک اذیت ناک حالات سے دوچار کر دیا جواب دو آخر کیوں؟“



میں دکھ سے بچتی ہوئی آواز میں بولا۔

بیٹا ڈھٹائی سے بولی۔ ”سچ بتاؤں پہلے میرا ارادہ تم ہی سے شادی کرنے کا تھا مگر پھر اچانک احمد نے آکر میرے ذہن کی کاپی لٹ دی اور میں نے تمہارے بجائے احمد سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا، تمہیں پچھائی کے تحفے میں نہیں لے جانا چاہتی تھی اس لئے تمہیں پاگل ثابت کر کے اس پاگل خانے کو تمہاری آخری قیام گاہ بنادیا۔“

”تم۔۔۔ تم انتہائی شاطر عورت ہو بیٹا آج زندگی میں پہلی بار مجھے تم سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ اتنی نفرت کہ“ میں نے بات اور حوری چھوڑ کر سلاخوں سے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن دیوبچ کی اور غصے سے چیخا۔ ”آج میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار دوں گا تم جیسی بے وقوف لالچی عورت کو جینے کا کوئی حق نہیں۔“ میں انتہائی نفرت سے غرایا اور اس کے گلے کو غصے سے دبائے لگا۔

بیٹا میرے اس رد عمل کے لئے بالکل تیار نہ تھی اس لئے اسے اپنے بچاؤ کو بالکل بھی موقع نہ مل سکا تاہم وہ اپنے بچاؤ کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے پھنچ پھرانے لگی، میرے ہاتھوں کی گرفت سے اپنی گردن کو نہ چھڑا سکی، بیٹا کی چیخ و پکار سن کر اسپتال کے عملے کے چند بندے دوڑے ہوئے آئے اور میری گرفت سے بیٹا کی گردن کو آزاد کرانے لگے مگر میں غصے سے مس نہ ہوا۔ میں ہر صورت میں بیٹا کو مار دینا چاہتا تھا۔ عملے کے ایک بندے نے جب یہ دیکھا کہ میں بالکل اپنے حواسوں میں نہیں ہوں تو اس نے کوئی بھاری چیز میرے سر پر دے ماری۔ ضرب لگتے ہی مجھے چکر سا آگیا۔ میری گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میرا دماغ تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

مجھے انفسوس تھا بیٹا میرے ہاتھ سے بچ گئی تھی اس روز کے بعد سے آج تک میں نے بیٹا کی شکل نہیں دیکھی تاہم بیٹا کے ساتھ جارحانہ سلوک کے بعد میرے ساتھ اس اسپتال میں جس قدر ظالمانہ اذیت ناک اور انسانییت سوز سلوک کیا گیا وہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مجھے مکمل پاگل بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی یہ اس قدر سلوک کا نتیجہ ہے کہ میں اکثر آپے سے باہر ہو جاتا ہوں۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں مجھے اپنے سامنے کھڑی ہوئی بیٹا دکھائی دیتی ہے اور میرا دل چاہتا ہے۔ میں اس کا گلا دباؤں۔۔۔۔۔“

عمر اپنی داستان سناتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکا پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ ”بیٹا نے جو کچھ مجھ سے اس کے بعد مجھے اندازہ ہوا، میرے ساتھ ایک بیوی لے کھیل کھیل گیا تھا اور اس کھیل میں میری حیثیت صرف ایک سرے جتنی تھی، مجھے استعمال کیا گیا تھا اور سب کو بیٹا احمد اور ان دونوں کے گھر والے لے آئے، اور میں خالی ہاتھ رہ گیا اپنے معصوم بھائی کو کھو بیٹا اپنی زندگی برباد کر دی میں نے۔“ عمر نے روتے ہوئے اپنا سر تھما لیا۔

میں پوری توجہ سے اس کی رو داد سن رہا تھا۔ میرے دفعتاً اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کر کے اپنے سامنے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔ میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا کہ اس کے خالی ہاتھوں میں بس اب پچھتاوے کے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا تھا۔ وہ گنہگار تھا مگر اس وقت تھا کہ وہ قابلِ رحم نظر آ رہا تھا۔

عمر کو جو اپنے کئے کی سزا ملی تھی وہ پچھائی کی سزا سے کہیں زیادہ اذیت ناک تھی تاہم عمر کی سزا میں بیٹا کی شریک تھی مگر وہ بچ گئی تھی۔

شیراز مختلف لوگوں سے پوچھتا ہوا آخر بیٹا کے تک پہنچ گیا وہاں ایسے پتہ چلا کہ بیٹا کی احمد سے ایک سال قبل شادی ہوئی تھی۔ اپنی بیوی منانے وہ کسی بھاری مقام پر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بلیا بک ایکسپرنٹ میں دونوں کی موت ہو گئی تھی اور یوں بیٹا احمد کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تھا۔

جن بیویوں کے لئے انہوں نے اپنے جتن دیے تھے ایک معصوم کی جان لے لی تھی اور دوسری جاہ کر دی تھی وہ ان کے کام بھی نہ آ سکے تھے۔



## خونی پاؤں

احسان بحر - میانوالی

رات کے وقت اچانک بوڑھے کی آواز سنائی دی میرا خیال مہ کہ وہ جہنمی روح دوبارہ جہنم کی طرف لوٹ گئی ہوگی لیکن پھر اچانک۔۔۔۔۔

کیا وہ جس بھی اپنا انتقامی منصوبہ مکمل کرتی ہیں۔ یہ جاننے کے لئے یہ کہانی پڑھنا نہ بھولنے کا

لوگ تو بچا تھا سن کو نہیں جانتے تھے ان کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور ان کو بنوئی گردانتے تھے۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ انہیں مشرقیات سے عشق تھا۔ نوادر عجائبات جمع کرنے کا خیال انہیں لے ڈوبا۔

وہ بے نیکی اتنا کہہ سکتا ہوں وہ اس معاملے میں کسی قدر خفیہ ضرورت تھے۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ خود اپنی جمع کی ہوئی چیزوں سے خائف رہا کرتے

میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تھا۔ جن بیویوں کے لئے انہوں نے اپنے جتن دیے تھے ایک معصوم کی جان لے لی تھی اور دوسری جاہ کر دی تھی وہ ان کے کام بھی نہ آ سکے تھے۔

میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تھا۔ جن بیویوں کے لئے انہوں نے اپنے جتن دیے تھے ایک معصوم کی جان لے لی تھی اور دوسری جاہ کر دی تھی وہ ان کے کام بھی نہ آ سکے تھے۔

اپنے بچا تھا سن سے مجھے بڑی محبت تھی۔ وہ

تھے۔ وہ ایک قلعہ نما مکان میں رہا کرتے تھے۔ میں ان دلوں آکسفورڈ سے نکلا تھا کرسس کی چھٹیاں تھیں اس لئے مجھے ان کا دعوت نامہ ملا تو میں نے ان کے مکان بلوخر بری جانے میں کچھ قباحت نہ سمجھی، واصل وہ مجھے اپنے نوادر دیکھانا چاہتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے بلوخر بری سے ہمیشہ سے ہی چڑھ رہی ہے اور آج بھی میں اس جگہ کو قطعی پسند نہیں کرتا۔

بہر حال وہ دمبر کی بائیس تاریخ تھی ایک بے حد سرد اور کھراؤ اور دہرات۔ کھانے کے بعد ہی وہ مجھے اپنے "ہولناک گھر" میں لئے چلے گئے۔ یہ دہ کرہ تھا جہاں ان کے خصوصی نوادر رکھے ہوئے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی مجھے خوف کا احساس ہوا اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ چچا نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دیواروں پر جو اشیاء لٹکی ہوئی ہیں وہ انہیں مانا صاحب کے کل داغ ہندوستان سے لٹی تھیں۔ جزل ہیولاک نے اس محل سے یہ اشیاء نکال لی تھیں۔ واصل مانا صاحب کا محل کا بیرونی واقعہ تھا۔ جب اس پر حملہ ہوا تو وہاں ایک کنواں ملا۔ جو جو رتوں اور بیچوں کی لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں میں آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ میں چچا تھامس کو بہت پسند کرتا تھا۔

بہر حال جب ہم اندر داخل ہوئے تو چچا نے نکلی جلا دی اور ادھر جا کھڑے ہوئے جہاں آتش دان کے قریب ایک بڑی ہی الماری رکھی ہوئی تھی اور اس پر سلک کے نیلے پردے پڑے تھے۔ پردے ہٹتے ہی الماری کے شیشوں میں سے اندر کی اشیاء نظر آنے لگیں۔

"یہ دیکھو۔" چچا بولے۔ "اس میں جو بڑا چاقو دکھائی دے رہا ہے یہ کالی کے مندر سے حاصل ہوا ہے اس سے ہزاروں بیچوں کی قربانی دی جا چکی ہے، بالوں کا وہ گچھا جو ادھر لگا ہوا ہے کانپور کے اس کنواں سے حاصل ہوا ہے جو اٹھارہ سو ستاون کے قتل عام میں لاشوں سے بھر گیا تھا۔ دیکھو اس میں خون کے دھبے ابھی بھی ہیں۔" میں نے الماری کا دروازہ کھول کر اس میں رکھے ہوئے کھنگھروں کا لئے ہوئے کہا۔

"اور یہ کہاں سے ملے ہیں؟" "خدا واسطے" چچا تھامس نے گہرا کر کہا۔

"انہیں وہیں رکھ دو۔" میں نے محسوس کیا کہ کچھ پریشان سے ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھے گہرا دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے اسے ہاتھ تو نہیں لگایا تھا؟"

وہ موم کے بنے ہوئے دو زمانہ ہیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے جو تقریباً ایک انچ لمبے تھے اور ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور کھنگھروں کے قریب تھے اسی لمحے میں نے انہیں غور سے دیکھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے پاؤں تھے۔ زمانہ ہیرو اور دلوں ہیروئن کے اوپر سے کئے ہوئے تھے اور ایک رہا تھا جیسے ابھی انہیں جسم سے کاٹا گیا ہے، فنکار نے انہیں بڑی خوب صورتی سے بنایا تھا، رنگوں کا استخراج ایسا تھا کہ وہ بالکل حقیقی اور تازہ لگتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے ان کے ننھے ننھے ماتن صفائی سے رنگے ہوئے تھے۔

"نہیں! میں نے تو چھوٹا تو درکنار اسے دیکھا تک نہ تھا۔" میں نے چچا سے کہا۔

وہ آہستہ سے بولے۔ "دیکھو انہیں بھول کر بھی نہ چھوٹا۔"

"مگر کیوں؟" کچھ توقف سے میں نے پوچھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ "چلو پہلے کافی پی لو۔" انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر میز تک لاتے ہوئے کہا۔

پھر جو کچھ انہوں نے مجھے بتایا وہ کچھ اس طرح تھا۔ "یہ سولہویں صدی کا ذکر ہے۔ ایک ہندوستانی نواب، جسے اپنی رعایا کے ساتھ ظلم کرنے کی پاداش میں ملک چھوڑنا پڑا۔ وہ انگلینڈ میں آ گیا۔ اس کے پاس خاصی دولت تھی وہ جانتا تھا کہ اسے سوسائٹی میں جگہ مل جائے مگر اس کے داندرا دامن کے باعث اسے عزت نصیب نہ ہو سکی اس طرح وہ سب سے الگ تھلک زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس کے قلعہ نما مکان کے

باب سے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہونے لگیں۔ راتوں کو وہاں چھین سنائی دیتی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب انگلینڈ میں سارے مکانات حویلیوں جیسے ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اندر کا حال معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ چند سالوں کے بعد اس حویلی کے باغ سے 15، 10 کچھ دریاں کھود کر نکالی گئیں اس نواب کا ایک نوٹم اس وقت بھی الماری کے عین اوپر لٹکا ہوا دیکھ سکتے ہو اور دیکھو کیا شیطان جیسی شکل تھی۔"

"میں نے مڑ کر دیوار پر دیکھا اور واقعی اس آتش بیٹنگ میں بنی ہوئی شکل کچھ شیطان کی ہی تھی، اس نے جسم پر سرخ لپاس پہن رکھا تھا۔ نقوش سے بے رخی اور سخت گیری عیاں تھی۔

"نواب کی موت یا قتل کے بعد اس کے محل کی اشیاء کو اٹھارہ دانہ کر دیا گیا اور مکان کو نیلام کر دیا گیا اس کے مکان کا پہلا خریدار، وہاں ایک ہفتہ بھی نہیں رہنے پایا تھا کہ اسے اپنے ٹیلر کی موت کا سوگ منانا پڑا، دوسرے ملازمین نے وہاں رہنے سے انکار کر دیا۔

پھر اس مکان میں دوسرا شخص آیا اسے بھی چند دنوں میں اپنے دو بیچوں سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ وہ دونوں ہال میں تھے اور ان کی گردنیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر زاسے کسی بھی طور پر حادثہ قرار دینے کو تیار نہ تھے مگر یہ سب کیسے ہوا؟ یہ کوئی بھی نہ جان سکا اور یہ حادثات تین ہفتے کے اندر رونما ہوئے تھے اس کے بعد یہ مکان ہمیشہ خالی ہی رہا۔

البتہ ہر سال اس کی رنگائی ہوتی تھی۔ کم کر ایہ ہونے کے باوجود بھی کوئی اس میں آنے کو تیار نہ تھا۔ خود صفائی کرنے والوں کا کہنا تھا کہ ہر سال انہیں خاک آلود فرش پر کسی عورت کے پیروں کے نشان ضرور ملتے تھے کسی کھار انہیں کھنگھروں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں، لیکن کسی بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے بعد یہ مکان میں آنے لایا جس میں تم اس وقت ہو۔

یہ وہی مکان ہے جیسا کہ تم جانتے ہو تمہارے والد کے بعد عجائبات اور نوادرات کا کاروبار میرے

## تین دوست

علم، دولت، عزت رخصت ہونے لگے تو ان کے درمیان کچھ اس طرح گفتگو ہوئی، علم کہنے لگا مجھے ملنا ہو تو عالموں کی صحبت اور کتابوں میں ملوں گا۔ دولت کہنے لگی مجھے ملنا ہو تو امیروں کے محلوں میں تلاش کرو۔ عزت کچھ نہ بولی اور خاموش رہی۔ تب علم اور دولت نے پوچھا؟ تم کیوں خاموش ہو؟ تب عزت افسوس سے بولی۔ میں اگر ایک بار چلی جاتی ہوں تو دوبارہ نہیں ملتی۔

(بلقیس خان۔ پشاور)

ہاتھ میں رہا اور مجھے ہمیشہ سے اعتقاد رہا ہے کہ پراسرار خالقیتیں بعض چیزوں میں پوشیدہ رہتی ہیں اور وہ محسوس بھی ہو سکتی ہیں اور مبارک بھی۔

جس دن میں یہاں آنے والا تھا میری دکان پر ایک ہندوستانی ملاح آیا اور اس نے مجھے ایک چھوٹا سا مجسمہ فردخت کے لئے دیکھا یا اور یہ مجسمہ کسی رقاصہ کا تھا۔ میں نے وہ مجسمہ خرید لیا کیونکہ ملاح نے کہا تھا "وہ شخص ہر بلا سے دور رہتا اور محفوظ ہو جاتا ہے جس کے پاس یہ مجسمہ ہو۔"

آج سے ٹھیک ایک سال قبل آج ہی کی تاریخ تھی یعنی 24 دسمبر کو میں یہاں اپنے سوٹ کیس کے ساتھ آیا تھا۔ نواب کے ورثا کے ہندوستانی ملازموں نے میرے لئے دروازہ کھولا تھا۔

مجھے وہ ملازم کچھ اچھا آدی نہ لگا تھا مجھے معلوم تھا کہ وہ کمرہ جو نواب صاحب کی شب خوابی کے لئے تھا میرے لئے تیار کیا گیا تھا میں جھمیں وہ کمرہ دکھاؤں گا، وہاں جب میں اندر پہنچا تو آتش دان میں آگ روشن تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ صندوق کی لکڑی کے تین ٹیلف صرف دو بیروں تک ہی صاف کئے گئے تھے تیسرا اوپر کی تینہ بغیر صفائی کے رہ گیا تھا اور وہاں گرد و غبار میں نے سب سے پہلے رقاصہ کے مجسمے کو میز پر



رکھا لیپ کے نزدیک، اور اسے غور سے دیکھا واقعی بوجھ  
خوب صورت اور زندہ جسم تھا ابھی میں کڑی پر بیٹھا تھیں۔  
کا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے ایک مجبور مضبوط سا ہاتھ  
جس کی انگلیوں میں بہت سی قیمتی انگلیوں چمک رہی  
تھیں۔

میں میز پر سے مجھے کو اٹھا لیتا جاتا تھا۔ میں نے  
پھرتی سے مجھے کو جھپٹ لیا اور اسے بٹنی جیب میں ٹھونس  
لیا ایسی لمبے وہ ہاتھ جس طرح نمودار ہوا تھا اسی طرح  
غائب ہو گیا تھا۔ پھر میں آتش دان کے سامنے پڑی  
ہوئی کڑی پر جا بیٹھا۔ آدھا گھنٹہ تک کوئی خاص بات  
معلوم نہ ہوئی لیکن پھر مجھے یوں لگا جیسے کہیں دور کسی کے  
منہ سے کراہی نکلی ہو یا کوئی رویا ہو بہر حال وہ آواز  
دارح نہ تھی۔

میں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی ہو سکتا ہے  
کوئی ہوا کا جھونکا رہا ہو اور پھر مجھ پر غنڈہ سی طاری  
ہو گئی۔ میں ابھی اونگھ ہی رہا تھا کہ یکایک مجھے ایسا لگا  
جیسے کوئی ہاتھ میری بٹنی جیب میں آگھسا ہوا اور میں فوراً  
ہی چونک گیا، لیپ روشن تھا لیکن مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا  
البتہ لا شعوری طور پر میرا ہاتھ جیب ہی کی طرف بڑھا تھا  
اور تم یقین کرو میرے ہاتھ میں ایک نادیدہ کلائی آگئی  
تھی جو بے حد سرد اور سخت تھی۔

یہاں پہنچ کر میں نے زندگی میں پہلی بار چچا کی  
آنکھوں میں دہشت کی لہر ابھرتے ہوئے دیکھی، وہ  
بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ "شراب اور  
پراسرار علوم اچھی چیز نہیں ہوتے۔" میں نے ہنسنے لیا۔  
"بہر حال۔" وہ بولے۔ "تم یقین کرو وہ کوئی  
حقیقی ہاتھ نہ تھا۔ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ فوراً ہی وہ  
ہاتھ میری گرفت سے نکل گیا۔

اسی لمحے کہیں مجھے ہتھکڑیوں کی آواز سنائی دی  
تھی جو غالباً نواب کے حرم خانے سے برآمد ہوئی تھی،  
آہستہ آہستہ اور مدھم مدھم۔

گھبرا کر باہر کی طرف لپکا مجھے پہلی ہی نظر میں وہ  
شخص اچھا نہ لگا تھا، میں نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا اور

اسے ساتھ ہی روک لیا تاکہ اس پر نظر رکھ سکوں وہ آواز  
آگیا میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ یہ  
مکان آسب زدہ ہے؟" اس کی آواز بے حد سرد تھی  
اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھمکتے ہوئے اس نے کہا۔  
"اس مکان میں ایک رقا کا کھجوت موجود ہے،  
رقا کا نواب کی نور نظر تھی مگر ایک گورے صاحب سے  
عشق ہو گیا تھا اور وہ جس وقت بھاگنے کی تیاری کر رہی  
تھی نواب نے اسے پکڑ لیا تھا۔"  
"پھر.....؟" میں نے پوچھا۔

"نواب صاحب نے اس کے پیر خوشوں سے  
کاٹ دیئے تھے اور وہ دونوں جیرا اس کے محبوب کو ختم  
کے طور پر پھینچ دیئے تھے۔"

اسی لمحے چچا نے الماری کی سمت نظر اٹھانے  
ہوئے کہا، ہتھکڑیوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگی  
تھیں، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میری طرف بڑھتے چلے  
آ رہے ہوں۔

بہر حال اسی لمحے سارے کمرے کی روشنی بے  
حد مدھم ہوتی چلی گئی اور پھر یوں لگا جیسے کہ ہتھکڑیوں  
کی آواز سے گونج اٹھا ہو۔۔۔۔۔

تب چچا نے اپنا ہاتھ اگڑتے ہوئے کہا۔ "میں  
نے دیکھا، وہاں مجھے دو پیر، صرف دو پیر نظر آ رہے تھے،  
فرش پر کچھ فاصلے پر۔"

چچا نے جس وقت یہ جملے ادا کئے خود مجھے بھی  
کمرہ قدرے دہشت زدہ ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"اور وہ بیرونی، ہی تھے جیسے تم نے الماری میں  
دیکھے تھے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ چھوٹے ہیں اور وہ  
پورے انسانی پیر تھے خوشوں کے پاس سے کٹے ہوئے،  
اس کے بعد وہ پیر چلتے ہوئے صندل کی شیفٹ کے  
نزدیک گئے اور شیفٹ کے خانے پر اس طرح چڑھنے  
لگے جیسے وہ اوپر پہنچنا چاہتے ہوں میں چپ چاپ  
گوگوں کی مانند دیکھتا ہی رہا اسی لمحے مجھے دوبارہ رونے  
کی آواز سنائی دینے لگی، بڑی سخت کوشش کے بعد میں  
اپنے ساتھ موجود ملازم کو دیکھ سکا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر

ہوا وہ کسی شیطان کی طرح خوفناک لگ رہا تھا میں اچھلا  
اور میرے ساتھ ہی لیپ لڑھک گیا۔  
"شیو!..... شیو!.....!" میں نے اسے چیخنے  
ہوئے سنائے۔ بالکل اسی لمحے میں جیسے کوئی پجاری چنچا ہو۔  
"شیو!..... شیو!....." محافظ شیو!..... میری  
حفاظت کر.....!"

اسی طرح چیخنے ہوئے وہ مجھ پر چھپٹا اور اس نے  
اپنا ایک ہاتھ میری پچھلی جیب میں ڈال دیا۔ منٹوں میں  
اندر رکھا جسم اس کے قبضے میں تھا میں نے سنبھلتے ہوئے  
مجھے کو چھیننا چاہا۔

مگر مجھے کے صرف پیر ہی میرے ہاتھ میں  
آٹکے جو ٹوٹ کر میرے ہاتھوں میں رہ گئے۔ اس  
کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں فرش پر تھا ایک  
دوسرا ملازم چائے لئے کھڑا تھا اور اس طرح مجھے دیکھ رہا  
تھا جیسے اس کا یہ خیال رہا ہو کہ میں نے بونے کے لئے  
خود ہی فرش کو چننا ہوگا۔

اس وقت بھی میرے ہاتھوں میں بت کے  
پاؤں دبے ہوئے تھے۔

یہاں رک کر چچا نے مجھے یوں گھورا جیسے انہیں  
یقین رہا ہو کہ اس کہانی سے میں یقیناً محفوظ ہوا ہوں،  
انہوں نے رک کر کہا۔

سب سے عجیب بات یہ تھی کہ جو ملازم چائے  
لایا وہی ایک تنہا ملازم تھا وہاں۔ میرے استغفار پر اس  
نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "صاحب مجھے افسوس ہے  
کہ کل میں آپ کو یہاں نہ مل سکا۔۔۔۔۔ دراصل میری  
بیوی اسپتال میں تھی جہاں وہ..... رات ہی کو مر گئی۔  
مجھے معلوم ہوا تھا کہ مکان کی ایک چابی آپ کے پاس  
ہے۔ اس لئے میں صبح سیدھا یہاں آ گیا۔ اس  
لئے میری عدم موجودگی میں مجھے معاف کر دیجئے۔" چچا  
تھامس کرسی سے اٹھ گئے اور شراب پنانے لگے۔

میں نے فوراً ہی ایک فیصلہ کیا، خوف کا یہ  
کاہل جس فوراً ہی ختم کئے جانا ضروری تھا، ورنہ مجھے ڈر تھا

کہ چچا کے اعصاب بری طرح متاثر ہوں گے، میں نے  
سوچا کہ میں ان موی پیروں کو اٹھانوں گا اور صبح ان کو  
بتا دوں گا کہ میں نے ایسا کیا تھا اور اب وہ کہیں غائب  
ہو گئے ہیں، مجھے یقین تھا کہ اس طرح خوف کا جادو ٹوٹ  
جائے گا ورنہ انہیں دیکھنے کے نہ ہی پریشان ہوں گے۔

میں وہاں الماری کی سمت گیا اور نظر بچا کر وہ  
دونوں ننھے پیر اٹھا کر جیب میں ڈال لئے۔ "اور اس  
آوی کا کیا ہوا؟ جسے آپ نے ملازم سمجھ رکھا تھا۔ میرا  
مطلب ہے جو شخص اصل ملازم کی عدم موجودگی میں  
آپ کو ملا؟" میں نے یونہی پوچھا۔۔۔۔۔

"اس وقت رات کے گیارہ بجے ہوئے تھے  
جواب میں چچا نے آنکھ اٹھا کر دیوار پر آویزاں نواب کی  
تصویر پر نظر ڈالی، پھر بولے۔ "میرا خیال ہے کہ وہ چھٹی  
روح تھی اور دوبارہ جہنم کی طرف لوٹ گئی ہوگی؟" پھر وہ  
اٹھ گئے اور باہر چلے گئے۔ انہوں نے میرے ساتھ ہی  
کمرے کا دروازہ کھولا اور ہال کی جانب بڑھے۔

جس وقت ہم دونوں ہال تک پہنچنے کے لئے  
سیر ہیاں اتر رہے تھے، کہیں سے ہتھکڑیوں کی آواز  
تیزی سے بلند ہوئی، ایسے ہی جیسے وہ ہتھکڑیوں والی  
بھاگ رہی ہو۔

چھٹی جس کی وجہ سے میرا ہاتھ خود بخود چٹلون کی  
جیب میں رینگ گیا۔ کیونکہ میں نے وہ ننھے ننھے  
پاؤں الماری سے نکال کر اس جیب میں رکھے تھے اور  
پھر میں جیسے سنائے میں آ گیا۔ میری جیب خالی  
تھی۔۔۔۔۔

"یہ آواز.....؟" لرزتی ہوئی آواز میں چچا  
تھامس نے کہا۔ "یہ آواز تو ان پیروں کی ہے۔ مگر  
یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"۔  
انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کئی بار کہا۔ اور  
پھر ان کا جسم کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر  
ڈھیر ہو گیا۔ اوہ مر چکے تھے۔!!



## سیاہ بھوت

عمران قریشی - کوئٹہ

رات کا اندھیرا ہر سو مسلط تھا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اچانک کسی نے عورت کو دیوچ لیا، عورت کے منہ سے آواز نکلا نہ نکلی اور پھر جب صبح لوگوں نے دیکھا تو عورت کو بری طرح بھنبھوڑ دیا گیا تھا کہ اچانک.....

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک دہشت ناک اور دل گرفتہ کہانی

**ضلع** مدھن پور سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں موہن پورہ واقع ہے، یہ گاؤں سرسبز اور گھنے درختوں سے مزین سو سے زائد گھروں پر مشتمل پہاڑی گاؤں ہے۔ یہاں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن گزشتہ دو سال کے دوران تقریباً چالیس کے لگ بھگ افراد کا قتل عام ہوا اور قاتل کا پتہ نہیں لگایا جاسکا۔ جب میں محکمہ جنگلات میں بطور فاریسٹ آفیسر تعینات ہوا۔ تب پہلی پوسٹنگ موہن پورہ میں ہوئی۔ شکار کرنا میرا مشغلہ تھا اور بندوق کو ہمراہ رکھنا میری عادت تھی۔ موہن پورہ کے ڈاک بنگلے میں جب میں نے اپنے نوکر گوپی کے ہمراہ قدم رکھا۔ تب پہلی خبر یہی ملی کہ ڈاک بنگلے سے کچھ دور پتھر ملی پہاڑیوں کے پاس پھونٹے ہوئے جسنے کے قریب ایک عورت کی آدھ کھائی ہوئی لاش دستیاب ہوئی ہے۔ بقول گوپی کے..... یہ سلسلہ ڈیڑھ سال ہوئے شروع ہوا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بے شمار ملنے والی لاشوں کے قریب کسی بھی درندے یا پھر انسانی قدموں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ وہ کہاں سے آتا ہے اور شکار کرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے۔ کچھ بتائیں چلا۔ گاؤں کے تو ہم پرست اور سادہ لوح افراد سے سیاہ بھوت کے نام سے تشبیہ دیتے ہیں۔

لاش کے دستیاب ہونے اور نشانات کا مٹنا میرے لئے بھی حیرت کا باعث بنا۔ لیکن میں دیہاتیوں کی نظرت سے بخوبی آگاہی رکھتا ہوں۔ چشم دید ویسی بھی واقعے کو نمک مرچ لگانے کے علاوہ کافی حد تک بات چیت میں رد و بدل بھی کرو سیتے ہیں۔ علاوہ ازیں واقعات کو برسرِ اریث کاروپ دینے کے لئے چیدہ چیدہ اور اصل معاملے کو بتانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے گاؤں کے افراد کی ملنے والی لاشوں کے پاس انسان یا بچہ جانور کے کچھ نہ کچھ نشانات پائے گئے ہوں۔ لیکن معاملے کو برسرِ اریث کاروپ دینے کے لئے مجھے بتانے سے گریز کیا جا رہا ہو۔

بہر کیف میں نے جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کے لئے گوپی کے ہمراہ موہن پورہ سے کچھ دور ہٹ کر پہاڑیوں کی جانب رخ کیا۔ عورت کی لاش پہاڑی کے قریب گھاس کے سرسبز خطے میں پہاڑی جسنے کے قریب پڑی تھی۔ لاش کے سینے کا نرم گوشت اور پیٹ کا زلیخہ حصہ کھالیا گیا تھا۔ چونکہ زمین کا وہ سرسبز و شاداب حصہ تھا اس لئے نشانات اس لئے نمایاں نہ ہو سکے۔ لیکن ہم نے مذکورہ بالا سطور میں تحریر کر چکا ہوں کہ موہن پورہ گاؤں سرسبز و شاداب گھاس سے ڈھکی ہوئی



خوب صورت دادیوں پر مشتمل گاؤں ہے۔ یقیناً نشانات نہ ملنے کی یہی وجہ رہی ہوگی۔ میں نے لاش کے اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ حسب توقع پاؤں کے نشانات مفقود تھے۔ گھاس بری طرح روندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ پائی کے آثار نمایاں تھے۔

آدم خور عفریت نے گھاس کے خٹے سے کچھ دور خشک اور گھنی جھاڑیوں کے پاس مقولہ پر حملہ کیا تھا۔ یہاں ایک جگہ خشک جھاڑیوں اور گھاس پر اس کے بیٹھے رہنے کے محدود نشانات بھی مل گئے تھے۔ وہ یقیناً کسی چوپائے کے نشانات تھے۔ لیکن اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ شیر یا بھر چیتا..... جو بھی تھا۔ اس نے عورت پر ان جھاڑیوں کے درمیان چھپ کر گھات لگائی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت محسوس ہو رہی تھی کہ عورت گاؤں سے اتنی دور ویرانے میں بھلا کیا کرنے آئی تھی۔ شاید رنج حاجت کے لئے..... لیکن میں نے فوراً اس خیال کو ستر دکر دیا۔ ایک تو گاؤں سے اتنی دور اور پھر وہ بھی رات کے وقت رنج حاجت کے لئے یہ مقام نامناسب تھا۔ کسی ضروری کام کی نیت سے بھی اتنی دور آنا اور وہ بھی رات کے اس پہر جب آدم خور اپنی خونی سرگرمیوں میں مشغول ہو..... ناممکن تھا۔

اچانک میری نگاہ جھاڑیوں کے پاس پڑی اسٹنچ والی ایک گھسی ہوئی چیل پر پڑی۔ میں نے جوتی اٹھائی۔ گوئی میرے پیچھے کھڑا حیرت بھری نگاہوں سے میری حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میں نے جوتی اس کے چہرے کے سامنے لہرائے ہوئے پوچھا۔

”اے بچیاں سیکے ہو؟ کس کی جوتی ہے؟ اتنا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جوتی گاؤں کے کسی فرد کی ہے اور ممکن ہے کہ اس کا تعلق مقتول کی لاش سے بھی کسی حد تک رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی شخص قتل کی واردات میں بھی ملوث رہا ہو۔“

”جناب ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں رات کے وقت گاؤں کا کوئی فرد موجود رہا ہوگا اور بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے اپنی جوتی یہاں

چھوڑ گیا ہوگا۔ لیکن قتل کی واردات سے اس کا کوئی تعلق نہیں..... لاش کو چیر پھاڑ کر دکھایا گیا ہے۔ اگر آپ تصور غور فکر کے ساتھ لاش کا معائنہ کریں تو آپ کو با آسانی یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ لاش کے جسم پر دانستوں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ یقیناً یہ نشانات سیاہ بھوت کے ہی ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی انسان اس طرح لاش کے ساتھ چیر پھاڑ نہیں کر سکتا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ لاش کے ادھر سے ہوئے جسم پر دانستوں کے نشانات واضح تھے۔ لیکن یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ کس جانور کے دانستوں کے نشانات تھے۔ بہر حال میں نے گوئی کے ہمراہ گاؤں کا رخ کیا۔ عورت کا گھر گاؤں کے درمیان میں واقع تھا۔ مکان کی حالت بہت خستہ حال تھی۔ یہاں عورت اپنی بوڑھی ماں کے ہمراہ اکیلی رہتی تھی۔ مختصری نقیشتیں کے دوران جو باتیں سامنے آئیں۔ ان کے مطابق عورت کی ڈیڑھ سال قبل شادی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی اپنے شوہر کے ساتھ بن نہ سکی اور کچھ ہی دنوں میں طلاق ہوئی۔ غلط غالباً شوہر کی رہی ہوگی۔ کیونکہ وہ اس طلاق پر پشیمان تھا۔ اور اکثر اپنی بوڑھی ماں کے گھر کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ اسے اس بات پر راضا مند کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ کوئی بھی ایسا مل نکال کر اس کی بیوی کو سنانے کے بعد اس کے ہمراہ کر دے۔ میں نے عورت کے مکان کا پتہ لیا۔ جو کہ بوڑھی کے گھر کے قریب واقع تھا اور گوئی کے ہمراہ وہاں جا پہنچا۔ عورت کے بچے کا نام رکھو تھا۔ وہ تین پندرہ سال کا جوان تھا۔ مونچھوں کو تادوے کر رکھتا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں اس کی درزی کی دکان تھی۔

میں نے آنے کا مدعا بیان کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ گزشتہ رات جب تمہاری بیوی پر حملہ ہوا۔ تب تم وہاں کیا کر رہے تھے۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات نمایاں ہوئے۔ اور وہ پریشان لہجے میں بولا۔

”میں اسے ایک سال قبل طلاق دے چکا ہوں۔

میرا اس کے ساتھ بھلا کیا واسطہ؟“

میں نے بات درمیان میں کاٹ دی اور میں نے اس دفعہ غصیلہ لہجے میں پوچھا۔ ”میں جو بات پوچھ رہا ہوں صرف اس کا جواب دو۔ بات کو سمجھانے پھرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کل رات جاے تو وہ پر تھے۔ اس بات کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔ مجھے صرف موجودگی کی وجہ دریافت کرنی ہے۔“

”مجھے کچھ معلوم نہیں.....“ وہ ہن دھری کے ساتھ بولا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے گوئی کے ہاتھوں سے جنگل سے ملنے والی جوتی ہاتھ میں لی اور رگھو کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

”جوتی مجھے لاش کے قریب جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی ملی ہے۔ کیا اسے پہچانتے ہو؟“ رگھو کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات ابھرے اور لاشعوری طور پر اس کی نگاہ کمرے میں رکھی ہوئی چار پائی کے نیچے پڑی۔ جہاں دیکھی ہی جوتی کا دوسرا جوڑا پڑا تھا۔ اور جسے میں کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھ چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر جوتی کو اٹھالیا۔ رگھو پریشان نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے جوتی رگھو کے چہرے کے سامنے لہرائے ہوئے کہا۔

”یہ اسی جوتی کا جوڑا ہے۔ جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ ہمیں یہ جوتی جنگل میں لاش کے قریب پڑی ہوئی ملی ہے۔ اب سچ بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟“

رگھو کے چہرے پر موجود پریشانی کے تاثرات نے انھیں زور دیکھ کر اس کی چھاپ کو نمایاں کیا۔ پھر اطمینان کی ہلکی سی لہر ابھرنی چلی گئی۔ جیسے وہ کسی اہم فیصلے پر پہنچنے کے بعد مطمئن ہو گیا ہو۔ اس دفعہ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

”میرا اس تمام معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں صرف اپنی طلاق شدہ بیوی کو سنانے کے لئے اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے بدظن ہو چکی تھی۔

اس لئے بات چیت سے بھی گریز کرتی تھی۔ واردات والی رات میں اسے زبردستی کھینچ کر گاؤں سے باہر لے گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں درندہ ہماری گھات میں چھپا بیٹھا ہے، اس نے اچانک ہی حملہ کر کے میری پتی کو گردن کے پاس سے پکڑا اور گھینٹا ہوا جسے کی جانب لے گیا۔ میں اٹنے قدموں گاؤں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔“

رگھو کے چہرے پر خوف کی دبیز چادر پھیلنے لگی تھی۔ وہ کھٹکھٹاتے ہوئے اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ میں نے ہاتھ میں موجود جوتی کو چار پائی کے پاس پھینکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ شیر تھا..... یا بھر چیتا..... میرے خیال میں تم بخوبی جان گئے ہو کہ حملہ کرنے والے جانور کی جنس کیا تھی؟“

”وہ سیاہ بھوت تھا۔“ رگھو متزلزل لہجے میں بولا۔ ”رات کے سیاہ اندھیرے کی مانند سیاہ.....“ اس کی کوئی آواز تھی اور تانی کوئی جسامت تھی..... مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے میری پتی کو سیاہ اندھیرے نے نگل لیا ہو۔“ وہ ایک دفعہ پھر بات کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ میں نے حیران ہو کر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے گوئی کی جانب دیکھا۔ پھر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ تمہارے سامنے تمہاری بیوی کو اٹھا کر لے گیا۔ لیکن تم اسے لے جاتے ہوئے دیکھ نہیں سکے۔ کیا جسامت کے علاوہ تمہیں اس کی آواز سے بھی اندازہ نہیں ہوا یا کہ وہ جانور تھا یا بھر بھوت.....؟“

رگھو نے انکار میں سر ہلایا اور حتمی لہجے میں بولا۔ ”مجھے اپنی پتی کے چپختے چلانے کی آواز کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دی وہ مکمل خاموشی کے ساتھ آیا اور واردات کرنے کے بعد خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

بات کچھ غیر معمولی سی تھی۔ اگر واردات کرنے والی جنس جانور کی تھی۔ تب حملہ کرنے کے دوران اس کے

منہ سے غراہٹ کی آواز کا نکلتا..... یا پھر دھاڑنا ضروری تھا۔ لیکن رگھو کا کہنا تھا کہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ خاموشی طاری رہی۔ عورت کا چیخنا چلانا فطری عمل تھا۔ اب یہی سوچا جاسکتا تھا کہ عورت کے چیخنے چلانے کی آواز میں حملہ کرنے والے جاندار کی آواز دب کر رہ گئی ہو۔ لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ جانور اور خاص طور پر شیر یا چیتا حملہ کرنے سے پہلے دھاڑ کر مقابلے کا اعلان کرنے کے بعد حملے کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ دھاڑ اتنی کمزور نہیں ہوتی۔ جو عورت کے چیخنے چلانے کی آواز میں دب کر رہ جائے۔ اب ایک ہی بات باقی بچی تھی۔ یہاں بھی شاید دیہاتیوں کی فطرت آڑے آئی ہوگی۔ معاملے کو پراسراریت کا روپ دینے کے لئے وہ کچھ باتیں بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ جن میں سے ایک بات آواز دالے معاملے کی پردہ پوشی تھی۔

میں تفتیش کے معاملے کو منقطع کر کے دہاں ڈاک بنگلے میں چلا آیا۔ شام کو میں نے عورت کی لاش والی جگہ کا چکر لگایا۔ ارادہ یہ تھا کہ لاش کے قریب ترین درخت پر چان لگا کر عفریت کا انتظار کیا جائے۔ لیکن مقصد میں ناکامی ہوئی۔ لاش کو جنگلی کتے اور لگو بگو مکمل طور پر چٹ کر گئے تھے۔ اب وہاں مختصر بھایا جات کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اس لئے میں ڈاک بنگلے میں واپس چلا آیا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے مختصر سورتوں کا وظیفہ کیا۔ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے چاروں جانب پھوکی۔ پھر راتقل تھا مے ڈاک بنگلے سے باہر نکل آیا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے جسم پر گرم کپڑوں کا فقدان تھا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسے کپڑوں کا انتخاب کیا تھا جو میری پھرتی میں مانع ثابت نہ ہو سکیں۔ مجھے حملہ آور سے بچنے اور جسم کو آزادانہ حرکت دینے کے لئے آرام دہ کپڑوں کی ضرورت تھی۔ بہر حال اب تک کی تفتیش کے مطابق میں اس نتیجے پر پہنچ پایا تھا کہ ان تمام وارداتوں میں کوئی جنگلی جانور ملوث تھا۔ شاید چیتا.....

تھے۔ جنہیں میں تحریر کی طوالت کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر نہیں کر پایا۔ ان کے مطابق جانور نے اب تک جتنے بھی انسانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان میں اکثریت عورتوں کی تھی۔ یا پھر دس سے پندرہ سال کے بچوں کی تھی۔ طاقتور مردوں کو نقصان پہنچانے کے لئے جیتے جیسے پتلے دیے جانور کو بہت سے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا۔ ان تکلیف دہ مراحل کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ ایسے انسانوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ جنہیں وہ با آسانی اٹھا کر لے جاسکے۔ یہاں یہ بھی بتانا چاہوں کہ شیر یا پھر چیتا آدم خور بحالت مجبوری بنتا ہے۔ فحشی ہونے کی صورت میں جب اس کے دانت یا پھر پنچے مجروح ہو جائیں۔ یا پھر اناڑی شکاریوں کی گولی کی صورت میں خون زیادہ بہہ جانے کی بدولت جانور کی طاقت زائل ہو جائے۔ علاوہ ان میں کوئی بھی جانور انسانوں کی رفاقت سے دور رہی رہتا پسند کرتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ اگر شیر یا چیتے کے منہ کو انسانی خون لگ جائے تب پھر وہ جانوروں کے شکار کو ترک کر دیتا ہے اور انسانوں کو شکار کرنے میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

میں نے قصبے کے ارد گرد چکر لگایا۔ پھر گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ رات بارہ بجے میں نے تھک ہار کر دربارہ ڈاک بنگلے کا رخ کیا۔ گولی میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے چائے بنانے کا حکم دیا۔ اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے کی جانب چل دیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب میں چہرے کو توتلے کے ساتھ خشک کر رہا تھا۔ تب میں نے اچانک ہی کمرے کی ٹین کی چھپ پر دھب کی آواز کے ساتھ کسی کے کودنے کی آواز سنی۔ میں نے بڑبڑا کر توتلہ ایک جانب رکھا اور پھر ٹی کے ساتھ غسل خانے کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن دروازہ دھس سے مس نہ ہوا۔ میں نے دروازے کی کنڈی کی جانب دیکھا۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ شاید باہر سے دروازے کو لاک کر دیا گیا تھا۔ ایسا کون کر سکتا تھا۔ گھر میں سوائے گولی اور میرے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اچانک غسل خانے کے باہر کھڑ ہو کر آواز سنائی دی۔ پھر دھب کی آواز کے ساتھ کوئی محسن میں کودا۔ غسل خانے کا

میں نے گھبرا کر غسل خانے کے روشن دان کی جانب دیکھا آوازوں کا شور محسن سے آرہا تھا۔ میں نے چھانک لگا کر روشن دان کو تھاہ اور واش بین پر پاؤں رکھ کر جسم کو اوپر کی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ میرا چہرہ با آسانی روشن دان تک پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں چیخنے چلانے کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں دوبارہ خاموشی کا کھمبہ تسلط قائم تھا۔ محسن میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ لیکن وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ روشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس لئے تھوڑی سی کوشش کے بعد میں روشن دان کے ذریعے دوسری جانب کودنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لینے کے بجائے فوراً کمرے کا رخ کیا۔ میری رائفل کمرے کے درمیان میں فرش پر گر گئی ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ غسل خانے میں جانے سے پہلے میں نے اسے دیوار کے ساتھ لٹکا رکھا تھا۔

سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ رائفل اٹھائی اور دوبارہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ باورچی خانہ برآمدے کے آخری سرے پر تھا۔ دروازہ چھوٹ کھلا ہوا تھا اور برآمدے کے کچے فرش پر خون کے چھینٹے بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا جیسے وہاں کسی جانور کی گردن پر چھری بھری گئی ہو۔ برآمدے سے آگے محسن کا فرش پکا تھا۔ میں نے کچے فرش کا معائنہ کیا۔ لیکن وہاں کسی بھی جانور کے قدموں کے نشانات مفقود تھے۔ میرے اور گولی کے قدموں کے نشانات نمایاں تھے۔ اور بھی کچھ انسانی قدموں کے نشانات موجود تھے۔ لیکن میرے خیال کے مطابق وہ گاؤں والوں کے تھے۔ مجھے اپنے جسم میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ میری سوچ کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ قدموں کے نشانات کی عدم

میں نے بنگلے کے ساتھ محسن کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہاں گپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے پاس پہنچ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دھکا دیا۔ تب کھلتا چلا گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ لیکن مجھے جہاں تک یاد پڑتا تھا۔ میں بنے کمرے میں سے باہر نکلتے ہوئے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

بہر حال سوچنے کا سلسلہ منقطع کر کے میں نے ایک سائیز پر موجود لماری کے اوپر سے ٹارچ اٹھائی اور دوبارہ گھر سے باہر نکل آیا۔ ٹارچ کی محدود روشنی میں..... میں نے ڈاک بنگلے کے ارد گرد کچھ زمین کا معائنہ کیا۔ وہاں نہ صرف خون کے چھینٹوں کے نشانات موجود تھے بلکہ کسی جانور کے تازہ قدموں کے نشانات بھی نمایاں تھے۔ میں نے حیرت اور جوش کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ قدموں کا معائنہ شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں..... میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نشانات تیندوے کے تھے۔ تیندوے نے پہاڑی شیر بھی کہا جاتا تھا۔ جسامت میں عام شیر کی نسبت کچھ چھوٹا ہوتا ہے اور شکل و صورت میں گھریلو بلی سے مشابہت رکھتا ہے۔ قدموں کے نشانات کا رخ ڈاک بنگلے کے پیچھے موجود پہاڑیوں کی جانب تھا۔ لیکن حیرانگی کی بات یہ تھی کہ تیندوے کے فرار ہونے کے نشانات موجود تھے۔ لیکن ڈاک بنگلے کی جانب آنے کے نشانات موجود نہیں تھے۔

تھوڑی ہی غور و فکر کے بعد میں نے اس معمر کو بھی حل کر لیا۔ وہ ڈاک بنگلے سے متصل پہاڑی سے کود کر ڈاک بنگلے کی چھت پر آجاتا تھا۔ اس کے چھت پر کودنے کی آواز میں نے سنی تھی۔ چھت سے وہ برآمدے کی چھت پر آیا۔ وہاں سے محسن میں کودنے کے بجائے وہ برآمدے کی دیوار سے ہوتا ہوا برآمدے کے کچے فرش پر کود گیا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے محسن کے کچے فرش پر تیندوے کے قدموں



کے نشانات نہیں ملے تھے۔ اس نے برآمدے میں کودنے کے بعد باورچی خانے میں سے باہر نکلتے ہوئے بد نصیب گولی کو گردن کے پاس سے دو جا۔ اور اسے چیتنے چلانے کا موقع دے بغیر دیوار پھلانگ کر ڈاک بنگلے سے باہر لے گیا۔ مخفی اندام گولی کے ہمراہ دیوار کو پھلانگنا اس کے لئے چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔ میں نے قدموں کے نشانات پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ جی زمین پر قدموں کے نشانات نمایاں تھے۔ لیکن گھاس کے شروع ہوتے ہی مفقود ہو گئے۔ خون کے چھینٹے بہر حال اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ تین دو پھر ٹی پہاڑیوں کی جانب گیا ہے۔ اندھیرے کی سیاہ چار کے درمیان صرف نارنج کی محدود روشنی میں ان نشانات پر آگے بڑھنا مشکل تھا۔ اس لئے میں نے دوبارہ ڈاک بنگلے کا رخ کرنے میں بہتری جانی۔

گولی کو پچانا اب میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ یقیناً تیندوے نے اسے گردن سے دو جا ہوگا۔ اور گولی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا ہوگا۔ ابھی میں نے ڈاک بنگلے کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میں نے ڈاک بنگلے کی چھت پر سیاہ سائے کو ڈاک بنگلے سے متصل پہاڑیوں کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے پھرٹی کے ساتھ کاندھے پر لٹکی ہوئی بندوق کو نیچے اتارا۔ پھر نارنج کوز مین پر رکھ کر بندوق کو کاندھے کے ساتھ لگا کر اندھیرے میں اندھا دھند فائر کر دیا۔ لیکن نارنج کوز مین پر رکھنے کے بعد گھپ اندھیرے کی بدولت صرف اندازے پر نشان لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ اس لئے میرے خیال کے مطابق فائر نشانات پر نہیں لگ سکا۔ میں نے نارنج کو اٹھا کر چھت کی جانب روشنی جھینگی اس دفعہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کیا وہ سیاہ بھوت تھا؟ اگر وہ سیاہ بھوت تھا۔ تب پھر گولی کو کون اٹھا کر لے گیا تھا؟ اور اگر وہ سیاہ بھوت کا نہیں تھا۔ تب پھر وہ کون تھا؟ مختلف سوالات میرے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ میں نے بندوق کاندھے کے ساتھ لٹکائی اور نارنج کو سنبھالے ڈاک بنگلے کی جانب چلا آیا۔ میرا ارادہ چھت

کا معائنہ کرنے کا تھا۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ اخروٹ کا درخت لگا ہوا تھا۔ اس لئے مجھے چھت پر چڑھنے میں مشکل درپیش نہیں آئی۔ میں نے بندوق کو سنبھالا اور نارنج کی روشنی میں چھت کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سائے کو گولی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ یا پھر اگر لگی تھی تو سیاہ بھوت کو پھلانگ دے بھری گولی کیا نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ چھت پر مٹی کی دبیز تھک کے اوپر تیندوے کے قدموں کے نشانات کے علاوہ کسی انسان کے قدموں کے نشانات بھی موجود تھے۔ میں نے نشانات کا بخور جائزہ لیا۔ وہ جو گولی بھی تھا۔ نکلے پاؤں تھا۔ اس نے جو تھک نہیں پہن رکھے تھے۔ پیروں کا ساڑنا نابل تھا۔ لیکن سیدھے پاؤں کا انگوٹھا جڑ کے پاس سے کٹا ہوا تھا۔ یعنی اس کی سیدھے پاؤں کی چار انگلیاں تھیں۔

مجھے اپنے جسم میں مسرت کی لہر دوڑنی محسوس ہوئی۔ میں ایک اچھا اور جاندار ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب چھت پر مزید تفتیش کرنا فضول تھا۔ اس لئے میں درخت کے ذریعے واپس مگن میں کود کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ برآمدے میں خون کے علاوہ چائے کی کرسیاں بھی بکھری پڑی تھیں۔ میں نے پہلے پانی کے ذریعے خون کے نشانات کو صاف کیا۔ پھر جائے بنا کر اپنے کمرے میں بستر پر آ بیٹھا۔ میرا دماغ کسی حد تک معاملے کو جانچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اور اب میرے خیال میں سیاہ بھوت کی کہانی جھوٹ پر مبنی تھی۔ یہ ایک ایسی افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ گاؤں کے کچھ افراد شاید اپنے مفاد کی خاطر ایسی افواہ پھیلانے کا باعث بن رہے تھے۔ لیکن ان افواہوں کے علاوہ جنگل کا تیندوہ بھی وارداتوں میں ملوث تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ یہ جاننے کے لئے مجھے تفتیش کے آخری لمحات کا انتظار کرنا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے وضو کیا۔ نماز پڑھ کر قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف ہو گیا۔ صبح گولی کے سیاہ بھوت کی جھینٹ چڑھنے کی خبر

جنگل کی آگ کی طرح تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ قصبے والے جوتی درجوتی ڈاک بنگلے کا رخ کرنے لگے۔ لیکن ان میں ایسا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ جس کے پاؤں کا انگوٹھا موجود نہ ہو۔ میں نے گاؤں کے کھیا کو بلایا۔ اور کسی ایسے قصبے والے کے متعلق دریافت کیا۔ جس کے پاؤں کی انگلیاں کم ہوں۔ کھیانے لاطمی کا اٹھارہ کیا۔ تب میں نے اسے ہمراہ لیا۔ اور تیندوے کے شکار کردہ گولی کے خون کے دھبوں کا تعاقب کرتے ہوئے ڈاک بنگلے کی پشت پر واقع پہاڑیوں کا رخ کیا۔

کھیا کا نام عجیب تھا۔ وہ ایک کم اور عیار فطرت کا مالک پیتھائکس اور پچاس کے لپیٹے کے درمیان کا شخص تھا۔ میری مختصر پوچھ گچھ کے دوران اس نے صرف ہوں ہاں میں جواب دینے کے علاوہ کسی بھی قسم کی بات چیت سے مکمل پرہیز کیا۔ مجھے یقین تھا کہ چار انگلیوں والے انسان کے متعلق بھی اس نے پردہ پوشی کی ہوگی۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ چار انگلیوں والے انسان کو ضرور تلاش کروں گا۔ پتھروں پر خون کے نشانات تلاش کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اور ہم پتھر ٹی پہاڑیوں پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ پہاڑیوں پر کم دبیش تین فرلانگ کے فاصلے طے کرنے کے بعد ایک پہاڑی کھائی میں اتر کر تیندوے نے لاش کا تقریباً آدھے سے زیادہ حصہ ہڑپ کیا تھا۔ باقی ماندہ کو جنگلی جھاڑیوں میں ڈھانپ کر اگلے طعنام کے لئے چھوڑ دیا۔ لیکن گدھ اور گز بگڑ لاش تقریباً ہضم کر گئے تھے۔ اس لئے وہاں اب سولے ہڈیوں کے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ چان باندھ کر تیندوے کا انتظار کرنا فضول تھا۔ پتھر ٹی زمین پر پاؤں کے نشانات بھی مفقود تھے۔ اس لئے میں نے پتھر آگے تک پہاڑی کا معائنہ کیا۔ خیال یہی رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ تیندوے کی رانٹ گاڑ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

لیکن مقدمہ میں ناکامی کے بعد عجیب کے ہمراہ واپس گاؤں چلا آیا۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے کھانا کھایا۔ پھر ڈاک بنگلے سے باہر نکل آیا۔ ڈاک بنگلے کے باہر عجیب کے ہمراہ بیس پچیس سال کے ایک نوجوان

لڑکے کو اپنا مختصر پایا۔ لڑکے نام رامو تھا۔ اور گولی کے مرنے کے بعد اسے کھانا پکانے کے کام پر معذور کر دیا گیا تھا۔ وہ گولی کا رشتہ دار تھا۔ بہر کیف میں نے لڑکے کو کام کے متعلق بتایا۔ اور خود عجیب کے ہمراہ گاؤں کے کچے مکانات کی جانب چل دیا۔ عصر کی نماز کے بعد چار انگلیوں والے انسان کی تلاش شروع ہوئی۔ یہ ایک تکلیف دہ اور صبر آزمائے عمل تھا۔ عجیب حیرت کا باعث بنا میری کارروائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

تلاش کا سلسلہ رات دس بجے تک جاری رہا۔ اس دوران میں نے عشاء کی نماز ادا کی۔ اور دوبارہ ایک ایک گاؤں والوں کو چیک کیا۔ لیکن تمام گاؤں میں چار انگلیوں والا انسان موجود نہیں تھا۔ میں مقصد میں ناکام ہونے کے بعد واپس ڈاک بنگلے میں چلا آیا۔ رامو کھانا کھانے کے لئے میرا انتظار تھا۔ میں نے کھانا کھایا اور مختلف سورتوں کا وظیفہ کرنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور میرا دماغ مختلف سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ چار انگلیوں والے انسان کے نہ ملنے کا عقدہ حل نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عجیب اسے گاؤں سے باہر بھیج چکا ہو۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر کیا.....

تیندوے کے علاوہ اس تمام کارروائیوں میں سیاہ بھوت کا بھی عمل دخل رہا تھا۔ اور اگر ایسا تھا تب پھر مجھے دو محاذوں پر جنگ لڑنے کے لئے تیاری کر لینی چاہئے تھی۔ رات کے نہ جانے کس پہر مجھے نیند آئی۔ معلوم نہیں ہو پایا۔

دوسرے دن رامو کی زبانی مجھے یہ روح فرسا خبر معلوم ہوئی کہ آدھ خور تیندوے کو اسکول کی عمارت میں قید کر لیا گیا ہے۔ میں نے ہڑ بڑا کر رامو کی جانب دیکھا۔

اور پریشان لہجے میں پوچھا۔  
”اسکول خالی ہے یا پھر بیچ بھی اندر ہیں۔“  
صاحب..... بچے اسکول کے اندر ہی ہیں۔“  
میں نے پھرٹی کے ساتھ اپنی رائفل اٹھائی اور رامو کے ہمراہ اسکول کی عمارت کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ گاؤں کے اسکول کی عمارت حال ہی میں پہاڑی ٹیلے کو صاف





”لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”ایسا کنواں جس کا منہ اوپر سے بند ہو۔ اس میں زہر ملی گیس دافر مقدار میں پانی جاتی ہے۔ لڑکوں کو نقصان نہ پہنچا دے۔“ لڑکا پریشان لہجے میں بولا۔

میرے خیال کے مطابق آدم خور دروازے کو تھوڑی سی کوشش سے توڑ سکتا تھا۔ باہر نکلتے ہی وہ بچوں کو نقصان پہنچاتا۔ اس لئے میں نے تہہ خانے کے ڈھکنے کو بند کر کے انہیں محفوظ کر دیا۔

اس کی منطق کو سمجھنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ وقت بھی کم تھا۔ میں نے اسکول کی عمارت کا باہر سے جائزہ لیتا شروع کیا۔ وہاں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی کھڑکی موجود تھی۔ جو کہ اندر سے منقش تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کسی بھی قسم کا کوئی راستہ موجود نہیں تھا۔ بند کمرے کے اندر جانور کا شکار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر روشن دان موجود ہوتا تب سیرگی کے ذریعے روشن دان تک پہنچنے کے بعد جانور پر فائز کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہاں حالات مختلف تھے۔ روشن دان تو درکنار شیشے کی کھڑکی کے آگے بھی دبیز پردے لگا کر جھانکنے کے راستے کو بھی مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

میں نے گاؤں والوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی چھت پر چڑھ کر بیٹھتا ہوں۔ تب سب مل کر پتھروں کے ذریعے کمرے کی کھڑکی کو توڑ دو۔ میرا ارادہ کچھ یوں ہے۔ کہ کھڑکی ٹوٹنے کے فوراً بعد جانور پڑ پڑا کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ اور میں چھت پر سے با آسانی اسے گولی کا نشانہ بنالوں گا۔ گاؤں والوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ترکیب پر عمل شروع ہوا۔ میں چھت پر چڑھ کر کھڑکی کے عین اوپر بیٹھ گیا۔ گاؤں والوں نے بڑے بڑے پتھر جمع کرنا شروع کئے۔ اور محفوظ مقامات پر کھڑے ہو کر شیشے کی کھڑکی پر برسنا شروع کر دیئے۔

میں آج بھی جب اس حقیقت پر مبنی تدبیر کے متعلق سوچتا ہوں۔ تو جسم کے دو ٹکٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے جانور کو جو مکمل انہماک کے ساتھ پیٹ

بھرنے میں مصروف عمل ہو۔ اسے چھیڑنا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں ہے۔ بجائے اس کے پتھر مار کر اسے تنگ بھی کیا جائے۔ وہ غیث میں آکر گاؤں کے کسی بھی فرد پر حملہ کر سکتا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ایسا ہوا نہیں..... کیونکہ پتھروں کی زلہ باری ہونے کے بعد تین دو گھبرا گیا۔ اور کھڑکی کے راستے فرار ہونے کے بجائے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کا دروازہ توڑ کر باہر نکلا۔

یہاں میں یہ بھی بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آدم خور جانور عموماً خیر یا چھٹا اور تین دو آدم خور ہونے کے بعد فطرتاً بادل ہو جاتے ہیں۔ انہیں غیر معمولی حالات کی بدولت اپنی اس روش کو منقطع کرنا پڑتا ہے۔ جس پر وہ بچپن سے چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ روش بدلنے کی مجبوری کو وہ یقیناً گناہ سے تشبیہ دیتے ہیں اس لئے بھوک کی صورت کے علاوہ انسانوں کا سامنا کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ حالات کی غیر معمولی کردٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے تین دو نے فرار ہونے کے لئے اس راستے کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ جہاں اس کے خیال کے مطابق انسانوں کی زیادہ تعداد موجود تھی۔ اس کے بجائے اس نے اس راستے کا انتخاب کیا۔ جسے میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

دروازہ دھماکے کے ساتھ باہر گرنے کی آواز کو سن کر میں نے ہڑ ہڑا کر صحن کی جانب رخ کیا۔ تب میں نے اسے بجلی کی مانند شہوت کے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اف میرے خدا!..... میں نے غیر معمولی طور پر اتنا بڑا تین دو اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا رنگ کالی رات کی مانند سیاہ تھا اور سرخ زبان خون سے تھکڑی ہوئی تھی۔

میں نے پھرتی کے ساتھ راتفل کو کاغذ سے لٹا کر لایا۔ شست باندھی اور فائز کر دیا۔ ماحول فائز کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے نشانہ تین دو کی کمرے کے پاس موجود ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کا لیا تھا لیکن اندازے کی غلطی..... یا پھر شاید تین دو کی طوفانی رفتار کی بدولت نشانہ چوک گیا۔ گولی اس کی پچھلی ٹانگوں پر لگی اور وہ دھب کی آواز کے ساتھ شاخوں کے درمیان میں سے ہوتا محض

کے درمیان میں آگرا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ دوبارہ نشانہ باندھا۔ میری راتفل میں دو کاتوس بیک وقت کام کر سکتے ہیں۔ اس لئے نشانہ باندھنے میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن زمین پر گرتے ہی تین دو پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گولی کی رفتار کے ساتھ اسکول کی بیرونی دیوار کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک ہی چھلانگ میں وہ مجھے اسکول کی دیوار پر دکھائی دیا۔ اس دفعہ اس کا پیٹ والا حصہ بالکل ہمیری نگاہوں کے سامنے تھا۔

میں نے مکمل احتیاط کے ساتھ نشانہ باندھ کر فائز کر دیا۔ دوسرے فائز کے دھماکے کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ اور تین دو کاتوس لٹکنے کی شدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے اچھل کر دیوار کی دوسری جانب جاگرا۔

میں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ اور دیوار سے نیچے کود کر اسکول کے گیٹ کی جانب موجود دیوار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ گاؤں والے دور کھڑے تھا شاید دیکھنے میں مصروف تھے۔ آگے بڑھنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ بہر حال گیٹ کے پاس دیوار کے سامنے خون تو کافی مقدار میں موجود تھا۔ لیکن تین دو اگدھے کے سر سے سینگ کی مانند غائب تھا۔ پتھر ملی زمین کا جائزہ لینے پر پاؤں کے نشانات مفقود پائے۔ لیکن خون کی موٹی دھار ٹیلے سے نیچے جاتی دکھائی دی۔ سمت کا تعین کرنا مشکل نہیں تھا۔ منزل ڈاک بنگلے کے پیچھے موجود پہاڑی علاقہ تھا۔ نشانات کا تعاقب کرنا حماقت سے عاری نہ تھا۔ ایک ایسے آدم خور کا تعاقب کرنا جو فوجی ہو۔ خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جانور کی جھنجھلاہٹ زخم سے خون بہنے کی بدولت اپنے عروج پر ہوئی ہے۔ اور وہ ایسے عالم میں خطرناک ہونے کے علاوہ ہر قسم کے انتہائی اقدام کے لئے بھی تیار ہوتا ہے۔ زخم سے خون کی کافی مقدار خارج ہونے کے بعد ایک تو اس کی پھرتی زائل ہو جاتی ہے۔ یوں وہ اپنے آپ کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بعد صرف غرانے کے علاوہ حملہ کرنے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر انتظار کرنے میں مضائقہ نہیں ہوتا۔ اس لئے میں تعاقب کا ارادہ ہٹا کر اس کے بعد وہاں گاؤں والوں کی جانب

چلا آیا۔ وہ میرے غلط تھے۔ میں نے انہیں ہمراہ لیا اور اسکول کا گیٹ کھول کر شہوت کے درخت کے نیچے واقع کنوئیں کا جائزہ لیتا شروع کیا۔

کنوئیں کا دہانہ بے حد وسیع و عریض تھا۔ جسے لکڑی کے مضبوط تختوں کے ساتھ مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا تاکہ اسکول کے بچے محفوظ رہ سکیں۔ تختے کے ایک سائڈ پر دروازہ بنا ہوا تھا۔ جسے باہر سے لکڑی لگا دی گئی تھی۔ کنوئیں کے پاس کچی زمین کچڑ کے تالاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہاں بچے تختیاں دھرتے تھے۔ میں نے لکڑی کے دروازے کی لکڑی کو کھولا اور اندر جھانکا۔ دروازے کے کھلنے کی آواز سننے ہی کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ پھر متعدد بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں باہر آنے لگیں۔ دروازے کے پاس چڑھی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لوہے کی میڑھیاں نیچے کی جانب جارہی تھیں۔ میں نے گاؤں والوں کو اشارہ کیا کہ وہ نیچے اتر کر بچوں کو کنوئیں سے باہر نکالیں۔ پھر خود ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی جانب چل دیا۔

دروازہ کمرے سے کچھ دور گرا ہوا تھا۔ اس کے قبضے اکڑ گئے تھے۔ کمرے کے درمیان میں اوہ دکھائی لاش موجود تھی۔ میں نے لاش کا معائنہ کیا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ لاش کے پاؤں کی انگلیوں کی تعداد چار تھی۔ یقیناً وہ وہی آدمی تھا۔ جس کے قدموں کے نشانات میرے ڈاک بنگلے کی چھت پر پائے گئے تھے اور جسے میں گاؤں میں تلاش کرتا رہا تھا۔ وہ یہاں چھپا بیٹھا تھا۔ اس کی پوشیدگی میں کچھ نہ کچھ ہاتھ بجلیت کا بھی ہوگا۔ تفصیلی پوچھ کچھ کا فیصلہ بعد پرچھوڑ کر میں باہر کی جانب چل دیا۔ کنوئیں میں سے بچوں کو باہر نکالا جا رہا تھا۔ ان میں سے کچھ بچوں کی حالت خراب تھی۔ لیکن زیادہ تر قابل اطمینان حالت میں تھے۔ بچوں کی قسمت اچھی تھی۔ کہ کنوئیں خشک ہو گیا تھا اور اسے مزید کھودنے کا عمل شروع نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور بکجیت کے ہمراہ اسکول کی عمارت سے باہر کی جانب چل دیا۔

صبح بارہ بجے کے قریب میں نے قصبے سے کچھ

ہٹ کر پتھر ملی پہاڑیوں کے اوپر جاتے ہوئے خون کے نشانات کا تعاقب شروع کیا۔ پہاڑی زیادہ دھواں گزرا نہیں تھی۔ موسم صاف اور خوشگوار تھا۔ ہر سمت خاموشی طاری تھی۔ جگہیت میرے ہمراہ تھا۔ گاؤں کے مزید افراد بھی ساتھ آ جاتا تھے۔ لیکن میں نے انہیں منع کر دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم نشانات کے تعاقب کی بدولت ایک ایسے درے میں داخل ہوئے جس کا میاب ہو گئے۔ جو بل کھاتا ہوا اوپر کی جانب جاتا تھا۔ درے کے دونوں سرے آسان سے باتیں کر رہے تھے اور بعض مقامات پر دھوپ کی روشنی نیچے نہیں پاری تھی۔ میں نے جگہیت کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور خود بندوق کو تھامے درے کے اندر کی جانب چل دیا۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد درے نے بل کھایا اور پہاڑ کے اوپر کی جانب سفر شروع کیا۔ نشانات بتدریج کم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن پھر بھی تیندوے کی موجودگی کا سراغ نمایاں کر رہے تھے۔ یقیناً دشمنوں میں سے بہتے ہوئے خون کی مقدار کم ہونے کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ زخم زیادہ مہلک نہیں ہوگا۔ میں نے احتیاط کے تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے راتقل کو کاندھے سے لگایا اور کسی چاک و چوند فوجی کی مانند احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن کچھ آگے جانے کے بعد نشانات غائب ہوتے چلے گئے۔

میں نے حیران ہو کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہاں قد آدم خشک جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ دونوں اطراف کی اونچی اونچی دیواریں مکمل طور پر ساٹ اور پتھر ملی تھیں۔ جن پر چڑھنا کسی انسان یا جانور کے لئے ممکن نہیں تھا۔ سامنے کی جانب سے درہ دوبارہ ٹھوس ہوا دکھائی دیا۔ میں سر کو جھک کر آگے کی جانب چل دیا۔ درے کے مڑتے ہی مجھے سامنے پتھر ملی دیوار اوپر آسان کی جانب اٹھتی دکھائی دی۔ راستہ یکنشت بند ہو گیا۔ میں نے طویل سانس لیا۔ اور دوبارہ اس جگہ چلا آیا۔ جہاں خون کے نشانات ختم ہوئے تھے۔ یہ بات کنفرم تھی کہ تیندوہاں تک آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر دشمنوں سے خون بند ہونے کے بعد اس نے اپنی غنیمت جگہ جگہ کا رخ کیا ہوگا۔ مجھے اس جگہ کو تلاش کرنا

تھا۔ میں نے دوبارہ ارد گرد کھڑی اونچی درے کی دیوار کا جائزہ لیا۔ دیواریں سیدھی اور پتھر ملی تھیں۔ جہاں چھپنے کے لئے کسی بھی قسم کا غارتو دور کی بات چوسے کے گھسنے کے لئے سوراخ بھی موجود نہیں تھا۔ ہر جانب عجیب سی خاموشی کا عالم طاری تھا۔

میں پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں کہ درے میں خشک جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ شاید وہ جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو۔ اس لئے میں نے اسے جھاڑیوں کے درمیان تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مجھے چندہ منٹ کا وقت دے دیا تھا۔ لیکن قد آدم جھاڑیوں کی بہتات کی بدولت آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت محسوس ہوئی کہ جھاڑیوں میں کسی بھی قسم کے جانور کا نام نشان موجود نہیں تھا۔ پھر تیندوے کو آسان کھا گیا۔ یا پھر زمین نگل گئی۔ اس محاورے سے میرے دماغ میں بجلی کوندی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جھاڑیوں کے درمیان کوئی ایسا غار پوشیدہ ہو۔ جس کا وہاں جھاڑیوں کے اندر ڈھک گیا ہو۔ ایسی صورت میں اسے تلاش کرنے کی ممکن نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لاحاصل..... مجھے ناکامی ہوئی۔ اب ایک آخری تدبیر میرے دماغ میں باقی بچی تھی کہ میں جیب میں سے موجود راجس باہر نکالوں اور خشک جھاڑیوں کو آگ لگا دوں۔ ایسی صورت میں جانور ہڑبڑا کر باہر نکلتا اور جھنجھلاہٹ یا طیش کے عالم میں مجھ پر حملہ کرتا۔ ظاہر ہے حملہ ناپسندیدہ ہوتا اور بچاؤ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ وہاں چھپنے کے لئے مناسب جگہ بھی موجود نہیں تھی۔ درے کے دونوں سائیڈوں پر موجود چٹانوں پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے میرے دماغ لگانے کے بجائے میں نے جیب میں سے مایوس باہر نکالی اور اللہ کا نام لے کر جھاڑیوں کو آگ لگا دی۔

جلتی پرتیلی کے مترادف جھاڑیوں نے فوراً آگ پکڑ لی اور نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگی۔ کچھ لمحوں پر درہ دائیں جانب مڑ رہا تھا۔ میں نے بندوق سنبھالی اور مڑتے ہوئے درے کی دیواروں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں میں تیندوے کے حملے سے قدرے محفوظ تھا۔ آگ

کارخ میرے مخالف جانب تھا۔ اس لئے میں نے مطمئن انداز میں جلتی ہوئی جھاڑیوں کے علاوہ مکمل سکوت طاری تھا۔ ہوا کا رخ میرے مخالف جانب تھا۔ اس لئے جھاڑیاں تیزی کے ساتھ آگ پکڑتی چلی جا رہی تھیں۔ نہ جانے بجلیت درے کے باہر کھڑا کیا کر رہا ہوگا۔ مجھے درے میں داخل ہونے تقریباً یوں گھنٹہ بیت چکا تھا۔ یہ شاید اب تک گاؤں والے بھی درے کے باہر پہنچ گئے ہوں۔ میری سوچوں کا سلسلہ یکنشت ٹوٹ چلا گیا۔

اچانک ماحول تیندوے کی غضبناک دھاڑ سے گونج اٹھا۔ میں نے ہڑبڑا کر درے کے اندر کی جانب دیکھا۔ لیکن آدم خور دکھائی نہیں دیا۔ ماحول دوبارہ اس کے چھپنے کی آواز سے گونجا۔ میں نے بندوق پر گرفت مضبوط کر دی اور اعصاب کو معتدل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر جیسے بجلی چمکتی ہے۔ ویسے وہ آگ میں لگی بھڑکتی ہوئی جھاڑیوں میں سے باہر نکلا۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ میں نے پتھر کی کے ساتھ نشانہ باندھا۔ اور فائر کر دیا۔ گولی نشانے پر لگی۔ وہ قلابازی کھا کر چھٹا اور اس کا جسم تیزی سے بڑھتی ہوئی آگ کے درمیان جا گرا۔ ایک دفعہ پھر ماحول اس کی غضبناک دھاڑوں سے گونج اٹھا۔

خدا کی پناہ..... میں وہ وقت بھی بھی بھلا نہیں پاؤں گا۔ اس کی دل دہلا دینے والی دھاڑیں سن کر مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ مختصر وقت کے دوران آگ سے تو باہر نکل آیا۔ لیکن بری طرح جھلنے کے بعد..... بارود کی تباہ کاریوں سے وہ بہر حال اپنے آپ کو بچا نہیں پایا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور بندوق کو کاندھے کے ساتھ لٹکا۔ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کھپا جگہیت کی آواز ابھری۔ وہ میری غمزدگی سے دریافت کر رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور تیندوے کے مردہ جملے ہوئے جسم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے اٹھانے کا حکم دیا اور خود درے سے باہر کی جانب چل دیا۔

ظہر کی نماز میں نے چشمے کے پانی سے وضو کرنے کے بعد پڑھی۔ تب تک گاؤں والے درے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا چکے تھے۔ میں نے سگتے ہوئے درے کا معائنہ کیا۔ جھلکی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان ایک تنگ اور لمبا میز ہار راستہ موجود تھا۔ جو کچھ آگے جانے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ یہ راستہ یقیناً زلزلے کی کارستانی رہا ہوگا۔ بہر حال جھاڑیوں سے مکمل طور پر ڈھکے ہونے کی بدولت انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ آگ پھیلنے ہی دراڑ نما راستہ دشمن کی بدولت بھر گیا اور تیندوے کو مجبوراً باہر نکلتا پڑا۔ وہ سیاہ رنگ کا تیندوہ تھا۔ جس کی کھال کے نیچے پیلے رنگ کے دھبوں کی آمیزش محسوس کی جا سکتی تھی۔ آدم خور کیوں بنا.....

اس کی کہانی علیحدہ اور درگتے کھڑے کر دینے والی تھی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب میں تیندوے کی لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ تب میں نے ارد گرد کھڑے ہوئے کچھ لوگوں..... جن میں جگہیت سرفہرست تھا۔ ان کے چہروں پر مایوسی کے تاثرات دیکھے۔ مجھے کچھ حیرانگی محسوس ہوئی۔ آدم خور سے نجات دلوانے کے بعد انہیں میرا احسان مند ہونا چاہئے تھا لیکن حیرت انگیز طور پر میں نے ان کے چہروں پر منفی تاثرات دیکھے۔ گزشتہ کچھ باتوں کے مدغم خیالات میرے دماغ میں سوالیہ نشان کی بدولت ابھرنے لگے۔ جن میں سرفہرست میری راتقل کو چرانے کی وہ کوشش تھی جس کی بدولت مجھے ہاتھ روم میں بند کیا گیا تھا۔ چار اگھیوں والے انسان کے نشانات کا میری چھت پر پایا جاتا۔ اور بعد میں تلاش کے باوجود اس کا گاؤں میں نہ ملنا.....؟ پھر اسکول کی عمارت سے لاش کا ملنا.....؟

یہ باتیں اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ مجھ سے بہت کچھ چھپایا جا رہا ہے اور اس تمام معاملے میں جگہیت کا نمایاں ہاتھ کار فرما ہے۔ گاؤں والے تیندوے کی لاش کو اٹھانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں نے جگہیت کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ڈاک بنگلے کی جانب چل دیا۔ میرا ارادہ اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کا تھا۔ اور پوچھ گچھ سے جو کہانی سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی۔





## دعا کی طاقت

عامر ملک - راولپنڈی

اچانک موسم کے تیور بدل گئے ، ہر دل دہشت سے لرزنے لگا۔ بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ تھی کہ پھر اچانک ایک موزہ رونما ہوا۔ اور دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

صدق دل سے کی گئی دعا اپنا اثر رکھتی ہے۔ ایک ناقابل فراموش دل گرفتہ دل فریلتہ کہانی

”بڈھا“ نہ جانے کب ہماری جان چھوڑے گا۔ یہ میرے گا تو اس کا کمرہ میں لے لوں گی عدیل بہائی!۔

”لے لیتا مگر پہلے اسے فینا کل سے دھو کر اچھی طرح انیمر اسپر سے کر لیتا۔“

یہ میرے پوتے عدیل اور پوتی لیلی کے دیکھ کر میرے بارے میں تھے۔ اس قسم کی باتیں اکثر سننا رہتا ہوں۔ اور اندر ہی اندر اس نئی نسل کے اطوار پر کڑھتا ہوں۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ میں زندگی کی اشی بہاریں دیکھ چکا ہوں، اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے نہ جانے کب سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے کیونکہ میں دوسرا اور کھانسی کا مریض ہوں، میرا ایک بیٹا امریکہ میں ہے۔ کئی برسوں سے میں نے نہ ہی اس کی شکل دیکھی ہے اور نہ ہی فون پر آواز سنی ہے۔ گرین کارڈ کی

میں پہلے بھی پتا چکا ہوں کہ تیندو، شیر یا بھر چیتا اس وقت تک آدم خور نہیں بنتا۔ جب تک وہ صحت مند ہو اور باآسانی جانوروں کو ہلاک کر کے اپنا رزق تلاش کر سکتا ہو۔ بصورت دیگر اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ یا پھر دانت چھڑ جائیں۔ علاوہ ازیں زخمی ہونے کی صورت میں بھی وہ فطری راستے کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ کار اپنانے کے لئے انسانوں کے شکار کی جانب بڑھنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ تیندو صحت مند ہونے کے باوجود بھی انسان کے شکار پر آمادہ تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اسے بچپن سے انسانی گوشت کھلایا گیا تھا۔ جانور ایک دفعہ انسانی گوشت کھانے کے بعد دوبارہ جانور کے گوشت کو منہ نہیں لگاتا۔ وجہ شاید یہی ہو کہ انسانی گوشت نہایت لذیذ اور تازہ ہوتا ہوگا۔ بہر حال سردار بھگیت کا کہنا یوں تھا کہ تیندو بچپن سے انسانی گوشت کھانا گاؤں کے سرکردہ افراد کی مجبوری تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے کے دوران گاؤں میں کینسر کی وبا کے بڑھنے میں شدت آئی تھی۔ کھیا بھگیت سینے کے کینسر میں مبتلا تھا۔ پنڈت اور سادھوؤں سے علاج کر دیا۔ لیکن افادہ نہیں ہوا۔ گاؤں کے کسی فرد کی زبانی اسے ایک ایسے شخص کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں جو پہاڑوں کے اوپر کنبایا کر رہتا تھا۔ گاؤں والوں کے کہنے کے مطابق بہت بچی ہوئی بزرگ ہستی کا اختیار رکھتا تھا۔ اس کی کنیا کے سامنے سیاہ تیندو اذخیروں کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔

جب بھگیت نے سادھو کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے بعد آنے کا سبب پیش کیا تب سادھو نے اقرار میں سر ہلایا اور کہا۔ ”بے شک میں تمہارے علاج کے علاوہ گاؤں والوں کو بھی اس بیماری کی صورت میں پھیلنے والے عفريت سے نجات دلوا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے سمیٹ کی ضرورت ہے۔ میری کنیا کے سامنے بندھے ہوئے سیاہ تیندو کے جسم میں ایک ایسے دیوتا کی روح حلول کر چکی ہے جو انسانی خون کا شیدائی ہے۔ لیکن طاقت کے لحاظ سے تمام دنیا کی زمین کو پلٹنے کی حیثیت رکھتا ہے۔“

قصہ مختصر..... جاہل اور سادہ لوح قصبے کے مختصر

لیکن تیندو کے اچانک ڈاک بنگلے کا رخ کرنے کی بدولت اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے بعد ازاں سادھو کی کنیا کا بھی معائنہ کیا۔ وہاں مختلف برتنوں میں انسانی ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور کنیا میں نحوست کے علاوہ میرانی کا دور دورہ تھا۔ ڈاک بنگلے میں واپس آنے کے بعد میں نے عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر گاؤں کے سادہ لوح افراد کی کم عقلی کی دوری، فحاشی و بہود اور خوشحالی کے لئے دعا کرنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔



خاطر اس نے کسی امریکن لڑکی سے شادی کرنی ہے اور ہم سب کو خواب سمجھ کر بھول گیا ہے۔ نواز اس سے بڑا ہے۔ بہت ہی تالعداد اور فرمانبردار ہے۔ مگر اس کی اولاد اس کے بس میں نہیں ہے۔ ماں باپ دونوں ہی اولاد کے معاملہ میں بد قسمت ہیں۔ ان کے لاڈلیار نے ان کو اس قدر رکاوٹ دیا ہے کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ والدین کا احترام کتنی اہمیت کا حامل ہے۔

میں اس عمر میں بھی نماز اور روزے کی پابندی کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر گھر کے دیگر تمام افراد جب سے کوسوں دور ہیں۔ نواز صرف جہ کی نماز ادا کرتا ہے۔ گھر میں جب لوگ انڈین فلم دیکھ کر اوجھم بچاتے ہیں تو میں برداشت نہیں کر پاتا۔ میں روک ٹوک کرتا ہوں تو ان کے ساتھ بے ریل بڑھ جاتے ہیں اور یہ میرے مرنے کی دعائیں مانگتے لگتے ہیں۔ کیونکہ میں ان کی آزادی کی راہ میں بڑا بھاری پتھر ہوں۔ میں اپنے پوتے اور پوتی کا رویہ دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے اپنے ماں باپ یاد آ جاتے ہیں کہ میں ان کا کس قدر ادب اور احترام کرتا تھا۔

برصغیر کی تقسیم سے قبل ہمارا خاندان کیسبل پور (انک) میں آباد تھا۔ میری والدہ صاحبہ نے حج کی سعادت تو حاصل نہ کی تھی مگر وہ پھر بھی ”بی جن“ کہلاتی تھیں۔ ابا جان مسجد کے امام تھے۔ نماز پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کو قرآن مجید بھی پڑھاتے تھے۔ محلے کے لوگ ان کی خدمت کر دیتے تھے۔ یوں ہی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ابھی میں آٹھ سال کا تھا کہ ابا جان کا انتقال ہو گیا، ادراہی جان کے کندھوں پر بھاری بوجھ آن پڑا۔ انہوں نے میرے مستقبل کی خاطر دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور زندگی بھر اس پر قائم رہیں۔

ہمارے گھر کا ماحول شروع ہی سے مذہبی تھا۔ ابا مرحوم کی طرح امی بھی گھر میں بچیوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں اور خود بھی مذہبی احکامات کی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ امی جان کو حج کی سعادت حاصل

کرنے کی شدید خواہش تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب کہ اکثر لوگ بذریعہ خشکی حج پر جاتے تھے۔ اس سفر میں آخر جات بھی کم ہوتے تھے۔ ابا جان کی وفات کے بعد امی نے گھر میں سلائی اور کڑھائی کا کام بھی شروع کر دیا۔ وہ ان کاموں کی ماہر تھیں۔ انہوں نے مجھے اسکول میں داخل کر دیا۔ اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حج کے لئے بھی رقم جمع کرنی شروع کر دی۔۔۔۔۔ ان کے لئے گاؤں کے دو مردوں نے اپنی بیویوں کے ہمراہ حج کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ امی جان کا ان کے ہمراہ سفر مبارک کرنے کا ارادہ تھا۔ اس لئے وہ بھی رقم جمع کر رہی تھیں۔ بلاخر وہ وقت آن پہنچا۔

ایک ہفتہ بعد ان لوگوں کی روانگی تھی کہ امی جانے نے اچانک اپنا فیصلہ بدل دیا کہ وہ حج کرنے نہیں جائیں گی۔ ان کے ساتھ جانے والی عورتوں اور مردوں کو حیرانی ہوئی۔ انہوں نے میری والدہ سے پروگرام منسوخ کرنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے وجہ بتائی اور ان کو ٹال دیا۔ ان لوگوں نے امی جان کو یہ پیشکش کی کہ اگر تم کا مسئلہ ہے تو فکر مت کریں۔ ہم رقم ادا کر دیں گے۔ مگر امی جان کا ایک ہی جواب تھا ”میں اس سال حج پر نہیں جاؤں گی۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

وہ لوگ حج کے سفر پر روانہ ہو گئے کئی ماہ بعد ان کی واپسی ہوئی تو گاؤں والوں نے ان کا خوب استقبال کیا۔ ان کی گاؤں کے ہر فرد نے دعوت کی۔ امی جان نے بھی ان کی دعوت کی، کھانے کے بعد مرد مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ اور وہ دونوں عورتیں امی کو بتانے لگیں۔ ”ہم دونوں نے مل کر کمرہ اور مدینہ منورہ میں کئی بار ایک ہی خواب دیکھا کہ تم کبھی خانہ کعبہ کا طواف کر رہی ہو اور کبھی مقام ابراہیم پر نفل ادا کر رہی ہو۔ کبھی صفا اور مردہ کی پہاڑیوں کے درمیان سٹی کر رہی ہو۔ ہم منی عرفات۔۔۔۔۔ اور مزدلفہ گئے تو وہاں بھی تمہیں ہی پایا۔ مدینہ منورہ میں تمہیں نماز پڑھتے دیکھا۔۔۔۔۔ تم ہی

بناؤ کیا راز ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں“ امی نے انہیں ٹالنا چاہا۔ مگر وہ نہ مانیں۔ کہنے لگیں۔

”لگتا ہے کوئی خاص بات ہے کہ تم اس پاک سرزمین پر نہیں گئیں۔ پھر بھی یوں لگتا ہے کہ تمہارا حج قبول ہو گیا ہے۔“

انہوں نے بہت ضد کی۔ تو امی جان نے نہ چاہنے کے باوجود ان کو بتایا۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ ”ہمارے گاؤں کا ایک غریب شخص نذیر علی ٹی۔ بی کے مرض میں مبتلا تھا۔ اس دور میں ٹی۔ بی کا مرض لا علاج ہوتا تھا۔ اس بیماری کا نام سن کر ہی لوگ خوف کھاتے تھے۔ اس کا علاج بھی ہونگا تھا۔ ٹی۔ بی سینوریم میں داخلہ اور علاج کا خرچ اتنا تھا کہ وہ نذیر کے کيس کی بات نہ سمجھی۔ جن دنوں امی جان کا حج پر روانگی کا ارادہ تھا۔ ان ہی دنوں کسی کام کے سلسلہ میں امی جان کا ان کے گھر کے قریب سے گزر ہوا تو نذیر علی اور اس کے بیوی بچوں کے رونے کی آوازیں سن کر وہ ان کے گھر میں داخل ہو گئیں۔ امی نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو نذیر کی بیوی نے بتایا کہ نذیر کو ٹی۔ بی ہے۔ سب کچھ اس کے علاج پر لگ گیا ہے اب گھر میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہی۔ مگر پھر بھی نذیر تندرست نہیں ہوا۔ گھر میں کئی دنوں سے فاقہ ہے۔ اگر نذیر کو ٹی۔ بی سینوریم میں داخل نہ کرنا تو یہ مرجائے گا۔“

امی جان نے اسے ولاسہ دیا اور گھر لوٹ آئیں۔ اور انہوں نے وہ تمام رقم جو حج کے لئے جمع کر رکھی تھی۔ نذیر کی بیوی کو پیسے سے دے دی۔ اور سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا، اگلے روز ہی نذیر کی بیوی اسے سینوریم مری لے گئی۔ جہاں اس کا علاج شروع ہوا اور پھر وہ آہستہ آہستہ۔۔۔۔۔ مکمل طور پر تندرست ہو گیا۔ اور اب وہ سخت مزدوری کرنے لگا ہے امی جان کے حج پر نہ جانے کی وجہ جان کر ان دونوں عورتوں کی گردنیں جھک گئیں اور وہ کہنے لگیں۔۔۔۔۔ ”کلوٹم! ہم نے حج کر کے وہ کچھ نہیں پایا جو تم نے ہمارے لئے پایا ہے۔“

## کیا خوب کھا ہے

تنگ نظر، تنگ ذہن لوگ دوسروں کی ذات پر بحث کرتے ہیں اوسطاً درمیانہ ذہن قسم کے لوگ واقعات پر بحث کرتے ہیں اعلیٰ ذہن کے لوگ نظریات پر بحث کرتے ہیں اور عظیم ترین لوگ خاموشی سے مقصد کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔

(عثمان غنی۔ پشاور)

ان عورتوں نے یہ بات گاؤں میں پھیلادی۔ اور سب لوگ امی جان کو ”بی جن“ کہنے لگے۔ امی جان نے اپنی زندگی خدمت خلق اور عبادت کے لئے وقف کر دی۔ گاؤں میں کوئی بھی بیمار ہوتا تو وہ اس کی تیمارداری کرتیں اس کے لئے دوا کا بندوبست کرتیں۔ گاؤں کی گلیوں میں سے پتھر اور کانٹے چٹان ان کا معمول تھا۔ گاؤں کا کوئی آوارہ کتا یا بلی بیمار یا زخمی ہو جاتا تو امی جان اس کو گھر لے آئیں اور ان جانوروں کی طبی خدمت اور تیمارداری کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر ایک کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ اب وہ گھر میں گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں۔ وہ اپنے پروردگار کی اتنی بندگی کرتیں کہ پروردگار نے ان کو یہ خوبی عطا کر دی کہ گاؤں کے لوگوں کی چھوٹی موٹی بیماریوں پر وہ ذکر الہی کر کے دم کرتیں تو لوگ ٹھیک ہو جاتے۔۔۔۔۔ وہ کسی سے کسی قسم کا معاوضہ نہ لیتی تھیں۔ پھر بھی گھر میں کبھی تنگی نہ آتی تھی۔ اوپر والا ان کی غائبانہ مدد کرتا تھا۔

میں امی جان کا لاڈلہ اور آنکھوں کا تارا تھا۔ انہوں نے اپنی جوانی میرے لئے وقف کر ڈالی تھی۔ یوں بھی نماز روزہ اور دیگر مذہبی احکام کی سختی سے پابندی

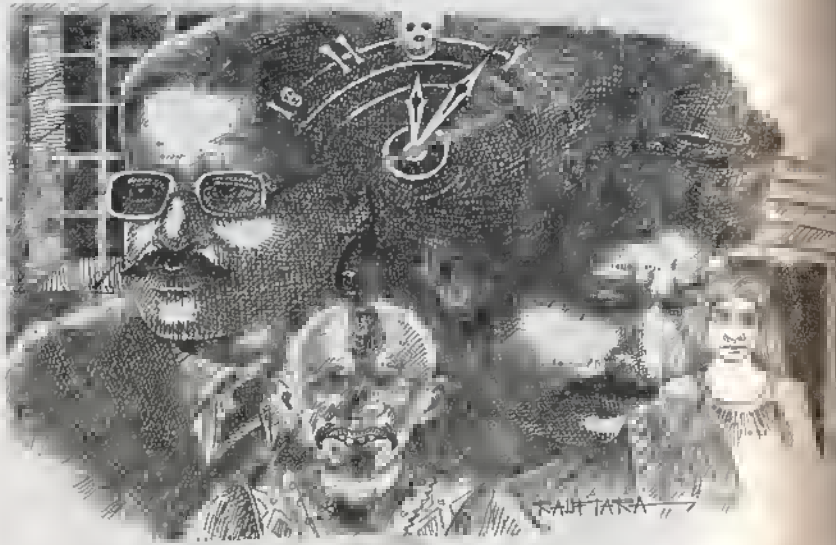


کرنا تھا۔ میں نے دین کی کتابوں میں بھی پڑھا تھا،  
برگول اور استادوں سے بھی سنا تھا کہ ہمارے مذہب  
میں خدا کی اطاعت کے بعد والدین کو اولیٰ مقام عطا کیا  
گیا ہے۔۔۔۔۔ اولاد کے لئے لازم ہے کہ وہ والدین کی  
اطاعت کرے۔ ان کا حکم مانے اور جب وہ بوڑھے  
ہو جائیں تو ان کی خدمت کرتے ہوئے ان نہ کرے۔  
ماں کے قدموں تلے جنت کی بشارت بھی پروردگار نے  
ہی دے رکھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جس نے ماں باپ کو  
راضی رکھا گویا اس نے خدا کو راضی رکھا اور جس نے  
والدین کو راضی اور خوش رکھا اسے جیتے جی جنت مل گئی۔  
میں باپ کی شفقت سے تو محروم تھا۔ اس لئے  
اب میری ماں ہی میرے لئے سب کچھ تھی۔ کاش  
میرے والد زندہ ہوتے تو میں ان کی بھی خدمت کرتا۔  
مگر میں اس معاملہ میں بدقسمت ٹھہرا کہ ان کی خدمت  
نہ کر سکا۔ اس لئے میں نے ماں کی خدمت میں کوئی کسر  
نہ چھوڑی۔۔۔۔۔ اسی بھی اس دنیا میں نہیں رہیں۔ مگر میں  
اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کی دعائیں۔ سائے کی  
مانند میرے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔

کبھی بھی ان کی زبان سے میرے لئے بدو عانی نہیں نکلی  
بلکہ ان کی دعائیں قدم قدم پر میرے ساتھ ساتھ رفتی  
تھیں۔ جو ہمیشہ میرے کام آتی تھیں۔ اور میری  
حفاظت بھی کرتی تھیں۔ ان کی دعائیں میرے لئے  
ایک سرمایہ تھیں۔ ہم ماں بیٹے میں اتنی محبت تھی کہ میری  
ذات کے بارے میں میری ماں کو روحانی کمال حاصل  
ہو گیا تھا کہ اگر میں گھر سے باہر ہوتا اور کوئی ایسا کام  
کرنے کا ارادہ بدل جاتا تو یوں لگتا جیسے کوئی زبردستی میرا  
ارادہ بدل رہا ہو۔۔۔۔۔ بعد میں پتہ چلتا کہ جو کچھ ہوا بہتر  
ہی ہوا ہے۔ میں گھر آتا تو میری ماں میرے بتائے بغیر  
مجھے یاد دہتیں کہ تو فلاں کام کرنے لگا تھا۔ مگر میں نے منع  
کر دیا تھا۔ یہ میری ماں کا مجھ سے حقیقی اور روحانی پیار تھا  
کہ وہ میرے بارے میں باخبر رہتی تھی۔

م۔ لیکن اسی رات مجھے تیز بخار ہو گیا۔ میں دو دن دفتر  
 جی نہ جاسکا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے دوا دی اور دو تین  
 دن مکمل آرام کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ دو دن گزر گئے مگر  
 بخار نہ اترا۔ بلکہ اسی کی شدت میں اضافہ ہی ہو گیا۔  
 میرے ساتھی بھی میری بیماری کی وجہ سے پریشان تھے۔  
 اگلے روز ایک ساتھی دفتر سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ  
 میں میرے لئے ایک ٹیلی گرام تھا۔ جس میں میری ماں  
 کی شدید بیماری کی خبر تھی اور مجھے جلدی گھر آنے کی  
 تاکید کی تھی۔

ساتھ ہی آسمانی بجلی بھی زور سے چمکتا اور کڑکنا شروع ہوگئی۔ مگر سب سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ بجلی کا کوندا مسلسل ہماری بس کے آگے گر رہا تھا۔ بالآخر بس ڈرائیور بے بس اور خوفزدہ ہو گیا۔ اور اس نے گاڑی کچے پر روک دی۔ اس کے بعد بجلی کا کوندا بس کے ارد گرد گرنے لگا۔ اس کے علاوہ کسی اور جگہ بجلی گرتی دکھائی نہ دیتی تھی بس رکنے پر کچھ سکون سامحوس ہوا۔ مگر ٹھوڑی دیر بعد پھر وہی افراتفری پیدا ہوگئی۔ عجیب بے کسی کا عالم تھا لگتا تھا ابھی بجلی بس پر گر پڑے گی۔ اور بس سمیت تمام مسافر جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ کچھ دیر اور گزر گئی۔ بجلی کا کوندا وقفے وقفے کے بعد بس کے ارد گرد گرتا رہا۔ ہم سب کو موت اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔ تمام مسلمان کلمہ شہادت کا درد اور ہندو رام رام کرنے لگے۔ اب ہر ایک کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ مگر کوئی بھی بس سے باہر نکل کر بھاگ نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس عالم میں وہ بس ہی سب کے لئے کوشہ عافیت تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ نہ بادش کا زور ٹوٹا اور نہ ہی بجلی کا گرنا بند ہوا۔ بالآخر ڈرائیور اور کچھ مسلمان اور ہندو بزرگوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک کو اپنے خدا پر اعتماد اور یقین ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے اور سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے تو اس صورت حال میں جب وہ یہ نظر آ رہا ہے کہ قدرت آج ہم میں سے کسی کی جان لینا چاہتی ہے تو کیوں نہ تمام مسافر ایک ایک باری باری بس سے نیچے اتریں اور کچھ دیر سامنے والے درخت کے نیچے کھڑے رہیں۔ جس کی موت کے لئے آج کا دن مقرر ہے وہ بجلی کی زد میں آکر زندگی ہار جائے گا۔ اور یوں دوسروں کی جان بچ جائے گی۔



## موت کا پیچھا

ساجدہ راجا - ہندواں سرگودھا

ایک شیر پر بیٹھا وہ نوجوان بہت اچنبھے میں تھا۔ شیر سر پٹ دوڑا جا رہا تھا اور پھر وہ شیر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا کہ نوجوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، پورے علاقے پر موت کی دھشت طاری تھی اور پھر.....

کیا کبھی بھار مارائی تو میں بھی انسانی مدد کی طلبگار ہوتی ہیں۔ اس کا پتہ کہانی پڑھ کر چلے گا

یہ واقعہ جو میں سنائے جا رہا ہوں میری زندگی کا سب سے ناقابل فراموش، بھیا تک اور حقیقی ہے، یہ بتانا بھی تلخ اور وحشت ناک تھا اس کے نتائج بہر حال میرے حق میں ہوتے تھے، آج بھی جب میں محسوس کرتا ہوں تو ابرا لگتا ہے کہ جیسے وہ واقعہ کل ہی میرے ساتھ پیش آیا ہو۔ اگر غور کریں تو یہ دنیا ان گنت ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا لیکن ہمارے سامنے نہ ماننے سے ان کی حقیقت بدل نہیں جاتی۔ لاکھوں لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ بہت کچھ عجیب پیش آیا۔ وہ نہیں جانتے تو نہ سمجھتے لیکن ان کی عقل آج بھی ان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ آج کی سائنس بہت ترقی کر چکی ہے، ایسے دور میں جب ہر چیز ممکن ہو چکی ہے لوگ دوسری مخلوقات پر یقین نہیں رکھتے، ان کے نزدیک جنت وغیرہ کا وجود

لگا، وہاں سے کیمبل پور پندرہ میل دور تھا۔ مگر نہ ہوا وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے اڑائے لے جاتی تھی۔ ابھی تک نہیں جان سکا کہ میں ایک گھنٹے میں گھر کیسے پہنچ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اور عزیز۔ میری ماں کی چار پانچ کے گرو بیٹھے ہوئے تھے اور میرے ہی بارے میں بات کر رہے تھے کہ میں ابھی تک کیوں نہیں گھر پہنچا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو میرے ایک عزیز نے مجھے بتا دیا کہ ”میری ماں کی حالت بہت ہی نازک ہے۔ دو دنوں سے ان کی بول چال اور کھانا پینا بند ہے۔ اسی لئے تمہیں مار دے کر بلا یا ہے۔“

میں کمرے میں داخل ہوا اور ”ماں جی“ کہہ کر ان کے پاؤں چومنے لگا۔ میرے ہونٹوں کے کس نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور مجھے سینے سے لگا کر کہنے لگیں۔

”بیٹا! برو روگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو زندہ سلامت گھر پہنچ گیا ہے۔ میری دعا میں رانجیاں نہیں گئیں۔ قدرت نے تجھے بچا لیا ہے۔ اوپر والے نے میری لاج رکھی ہے اب میں سکون سے مر سکوں گی۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے نگہ شہادت پڑھا اور اس کے ساتھ ہی وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔

میں اور دیگر افراد رونے لگے۔ مجھے یقین آ گیا کہ ماں کی دعاؤں کے طفیل ہی یہ کرشمہ قدرت نے دکھا یا ہے کہ میں زندہ بچ گیا ہوں۔ میں نے گاؤں والوں کو اس سانحے کا بتایا تو وہ بھی قدرت کے اس کرشمے پر حیران رہ گئے۔

بعد میں یہ واقعہ اخباروں کی زینت بن گیا تھا۔ ایک اخبار والے نے میرا انٹرویو بھی لیا تھا۔ میں نے اسے تمام حقیقت بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ میں زندہ رہا۔ شاید انہوں نے اپنے اپنے ماں کی حقیقی معنوں میں خدمت کی اور کبھی بھی زندگی میں ان کی حکم عدولی نہ کی تھی۔

کچھ دیر درخت کے نیچے کھڑا ہونے کے بعد بخیریت واپس آ گیا۔ اس نے پھر کنڈیکٹر کو اتارا۔ وہ بھی زندہ رہا۔ اس کے بعد سیٹ نمبر ایک سے مسافر باری باری اترنا شروع ہو گئے۔ مسلمان نگہ شہادت پڑھتے اور ہندو رام رام جیتے۔ ہر ایک یہی جان کر نیچے اترتا کہ وہ زندہ واپس نہیں آئے گا اور جب وہ زندہ واپس آتا تو اس کے چہرے پر اطمینان ہوتا۔ مسرت کی ایک لہر ہوتی جیسے اس نے نئی زندگی پائی ہو۔ ہر ایک کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے قہقہے کرتی نظر آتی تھی وہ لوگ جنہوں نے کبھی نماز نہ پڑھی تھی۔ وہ بھی اس وقت خدا کے آگے گڑگڑا رہے تھے کہ وہ ان کو معاف کر دے۔ آج ان کو زندگی دے کر ایک موقع اور دے دے تو وہ اس کی عبادت کریں گے اور جہد سے سر نہ اٹھائیں گے۔ اب وہ کوئی گناہ نہ کریں گے۔ روزے بھی رکھیں گے اور نمازیں بھی پڑھیں گے۔

تمام مسافر باری باری بس سے نیچے اترے اور کچھ دیر باہر گزارنے کے بعد بخیریت سے بس کے اندر واپس آ گئے۔ اب صرف میں رہ گیا تھا۔ چونکہ میں آخری سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لہذا اب میری ہی باری تھی۔ سب مسافروں کو اور مجھے بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ آج جس کی موت یہاں لکھی جا چکی ہے۔ وہ میں ہی ہوں۔ میں بہت ہی گھبرا رہا تھا۔ میری طبیعت تو پہلے ہی خراب تھی۔ مجھے اب اپنی موت کا بھی یقین ہو گیا تھا۔ میں نے بھی نگہ شہادت پڑھا اور اللہ کو یاد کر کے بس سے نیچے اتر گیا، تمام مسافروں نے حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں ڈرتا اور کانپتا ہوا درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ چند ہی لمبے گزروے تھے کہ بجلی زور سے کڑکی اور سیدی بس کے اوپر گر پڑی..... میرے دیکھتے ہی دیکھتے تمام مسافر بس سمیت جل کر راکھ ہو گئے۔ جبکہ میں معجزانہ طور پر زندہ رہا۔ قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ کر میں مجدے میں گر گیا۔

کچھ دیر بعد بجلی کا کڑکا بند ہو گیا اور بارش بھی رک گئی تو میں پیدل ہی سڑک کے کنارے کنارے چلنے



محض ایک سسنی خیر دینی ایجاد ہے، لیکن حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

جو لوگ نادیدہ مخلوقات پر یقین نہیں رکھتے ان کے ایسا سوچنے سے جو بے وہ بدل نہیں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے وجود کی گواہی دی ہے۔ یہ شیطان ابلیس جو پوری دنیا کو راہ سے بھٹکانے پر لگا ہوا ہے حقیقت میں اس کا تعلق بھی جنات سے تھا لیکن اس نے اتنی عبادت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فرشتوں کی صف میں رہنے کی اجازت دے دی تھی اور پھر اس کی غلطی کی وجہ سے وہ اللہ کی بارگاہ میں مردود اور لعین ٹھہرا۔

بات کہاں سے کہاں چل نکلی۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جو واقعہ اور جو حالات میرے ساتھ پیش آئے ان کو سوچ کر آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ کیا یہ سب کچھ حقیقت میں ہوا تھا.....؟

میرا تعلق آئٹریلیا سے ہے میرا باپ آئٹریلیا میں تھا جبکہ میری ماں کا تعلق ایشیا سے تھا اور وہ مسلمان تھی میرے والدین کی ملاقات ایک نقلی ادارے میں ہوئی جو بعد ازاں محبت میں تبدیل ہو گئی۔ محبت اتنی بڑھی کہ انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ میری ماں اپنے مذہب کو کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہیں تھی انہوں نے میرے باپ سے کہا: ”وہ دل سے اسلام کا مطالعہ کریں اگر ان کا دل رضامند ہو تو وہ مسلمان ہو جائیں ورنہ ان کے راستے الگ الگ ہوں گے۔“ باپ کو ماما سے دوری ہرگز گوارہ نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا کہ ٹھیک ہے۔ میں اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔ دوسرے دن ہی انہوں نے ایک اسلامک سینٹر جو ان کر لیا اور دل سے اسلام کو جاننے کی جستجو میں لگ گئے۔

جیسے جیسے وہ اسلام کو پڑھتے گئے ان کا دماغ روشن ہوتا گیا۔ اور آخر کار وہ مسلمان ہو گئے۔ ماما کی خاطر اسلام کو وہ سمجھنے پر راضی ہوئے لیکن جب ان پر اسلام کی حقیقت ظاہر ہوئی تو وہ دل سے ایمان لے آئے۔

مما باپ کی شادی کے دو سال بعد میری پیدائش

ہوئی انہوں نے میرا نام میری ماں کی خواہش پر رکھا۔ میرے والدین نے میری پیدائش نہایت مروت پر تھے۔

میں پڑھائی کے علاوہ ہر قسم کی غیر تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تھا۔ دوسری طرف میں نے مارشل آرٹ بھی سیکھنا شروع کر دیا۔ سال ہونے والی تیرائی میں میرا پہلا نمبر ہوا تھا اور جب میں کالج میں داخل ہوا تو میں ہر چیز میں حاضر ہو چکا تھا۔ اسلام میری روح میں شامل تھا۔ اس لئے میں اس کھلے معاشرے میں بھی اپنی ذات کے خول میں بند تھا۔ لڑکیاں مجھے ردّ ہوا کرتی تھیں لیکن میں نے کبھی توجہ نہیں دی۔

اور پھر وہ سب شروع ہو گیا جس نے میری زندگی اور میری سوچوں کو ایک نئی سمت دے دی۔ خوابوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ مسلسل ایک ہی طرح کا جواب، ہر رات آنے کے بعد میری نیند اڑا کے رکھ دیتا۔ جب ایک ہفتہ مسلسل اس خواب نے مجھے پریشان کئے رکھا تو میں نے باپا کو بتایا۔ باپا نے مجھے تسلی دی تو میں نے انہیں اپنا خواب سنایا۔

ایک چٹیل میدان ہے، ارد گرد سوائے درباری اور سناٹے کے کچھ نہیں، میں بھاگتا جا رہا ہوں۔ بھاگتا جا رہا ہوں..... میری ٹانگیں مل ہو چکی ہیں لیکن میں خود کو بچانے کے لئے پھر بھی بھاگتا جا رہا ہوں اور سب سے حیرانی کی بات کہ مجھے اپنے بھاگنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی کہ میں کس چیز سے خوف زدہ ہو کے بھاگ رہا ہوں؟ تھک ہار کے گرتا ہوں اور اٹھ کے پھر بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے عجیب و غریب غراٹیں سنائی دیتی ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کے نیچے دیکھتا ہوں کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ باپا کی یہ تسلی کہ ”بیٹا خواب صرف خواب ہوتے ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تم ان کے بارے میں پریشان نہ ہو بلکہ کسی سائیکلٹرسٹ سے چیک اپ کراؤ۔ یہ دماغی پریشانی بھی ہو سکتی ہے جو خواب کی صورت

میں نظر آتی ہے۔ لیکن میں باپا کو کیسے بتاتا کہ مجھے ان خوابوں سے تعلق اور کوئی پریشانی نہیں۔ تسلسل سے ایک خواب تھا کہ ایک غریب غراٹہ بات نہیں لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے ہارے تھے ان کے کہنے پر میں نے دماغی ڈاکٹر کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔

ڈاکٹر نے ہر طرح سے اپنا اطمینان کیا لیکن کوئی بڑا خوابات معلوم نہ ہو سکی۔ آخر میں ڈاکٹر نے ایک آخری سوال پوچھا۔ ”جس روز سے تمہیں یہ خواب نظر آنا شروع ہوئے ہیں اس دن کیا کوئی غیر معمولی واقعہ یا کوئی بات ہوئی تھی؟“ ڈاکٹر کے سوال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ سب کچھ ایک جگہ کے نمودار ہو گیا۔

اس دن میں کالج سے گھر آ رہا تھا کہ راستے میں مجھے ایک عجیب و غریب شخص ملا اس کا لباس بہت اہتر تھا، وہ مجھے سے سر جھکائے چل رہا تھا لیکن جیسے ہی وہ میرے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے ایک دم اپنی ٹانگیں اوپر اٹھا لی..... ”اود خدا.....“ اتنی ڈراؤنی ٹانگیں..... وہ اتنی سرخ تھیں کہ جیسے ابھی ان سے خون بہہ پڑے گا۔ مجھے جھرمجھری بی آگئی لیکن میں نے اپنی ٹانگیں اس کی آنکھوں سے ہٹا نہیں پارہا تھا.....

ایک دوہو بولا۔ تو جیسے میں کسی بحرے سے آزاد ہو گیا۔ ”تیرے خواب جھوٹ نہیں ہوں گے۔ وہ سب کچھ تیرے ساتھ ہوگا، تو خود کو تیار کر لے۔ تیار کر لے۔ ورنہ بہت بچھتاے گا۔ میں آؤں گا تیرے ساتھ۔“ خرد آؤں گا۔ اس وقت کا انتظار کرتا۔“

نہ جانے اس نے یہ سب کیوں کہا.....؟“ میری ٹانگیں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کو پاگل سمجھا اور کچھ ٹھیک ٹھاکہ طرف چل پڑا۔

رات کو جب میں سونے کے لئے لیٹا تو وہ عجیب و غریب آدھی میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا اور اسی وقت وہ اس کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جس نے میرا سکون

مجھ سے چھین لیا۔ آج اچانک ڈاکٹر کی بات پر وہ آدھی میرے ذہن میں آ گیا ایسا کیا ہونے والا ہے میرے ساتھ جس کا اس آدھی نے کہا تھا؟ میں انہی سوچوں میں تھا کہ ڈاکٹر کی آواز نے مجھے جو کچھ دیا وہ مجھے ایک نسخہ دیتے ہوئے ہدایت کر رہے تھے کہ میں ان دواؤں کو بغیر تاخیر کے استعمال کر دوں اور اپنے ذہن کو ہر قسم کی فکر سے آزاد کر دوں۔ میں نے نسخہ تھا مار گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں گھر کے قریب پہنچنے والا تھا تو اچانک وہی آدھی میرے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں نے ایک بار پھر مجھے خوف زدہ سا کر دیا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے بارے میں بچے میں بولا۔

”اب وقت آچکا ہے اس لئے میں تیرے پاس آیا ہوں تیرے خوابوں کا کنارہ لٹنے والا ہے تیری زندگی تجھے دعا بھی دے سکتی ہے اور تو بھی موت کو دھوکہ دے سکتا ہے، اس بارے میں وقت آنے پر تجھ کو خود ہی پتہ چل جائے گا۔ ہاں اگر میری ضرورت ہوئی تو میں خود تیری مدد کرنے آ جاؤں گا۔ شروع میں بہر حال تجھے خود اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے بہادری کا ثبوت دینا ہے، اگر تو شروع میں ہی موت کا شکار ہو گیا تو تجھے موت کے بعد بھی سکون نہیں ملے گا۔ تیری روح تیرے ناکردہ گناہوں کی سزا جھیلی رہے گی۔“

میں حیران و پریشان سا اس کی باتیں سن رہا تھا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہا ہے۔

”اگر تو کچھ پوچھنا چاہتا ہے تو پوچھ، میرے پاس وقت کم ہوتا ہے۔“ اس کی آواز مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی میں نے جلدی سے اس سے پوچھا۔ ”وہ کون ہے.....؟ اور میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ لیکن اس نے مجھے صرف یہی کہا کہ ”میرے بارے میں تجھے جلد معلوم ہو جائے گا اور جو کچھ تیرے ساتھ ہو رہا ہے اس کا اعانہ بھی تجھے خود ہی ہوگا.....“ ہاں صرف اتنا بتا دوں کہ تجھے ایک خطرناک کام کرنا ہے جس میں تیری زندگی کو بھی شدید خطرہ ہوگا لیکن اگر تو وہ

کام کر گیا تو تجھے وہ سب میسر ہوگا جو تو نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

اس کام سے انکار بھی تجھے موت کے منہ میں لے جائے گا۔ اس وقت تیرے پاس دور راستے ہیں یا تو اس کام سے انکار کر کے خود کو موت کے حوالے کر دے۔ یا پھر اس کام کے لئے ہاں بھر لے۔ خوف تو بہر حال اس میں بھی ہے لیکن فتنی فتنی چانس..... بچ گیا تو ایک خوشگوار زندگی تیری منتظر ہوگی..... ایک بات کا مجھے بہر حال یقین ہے کہ تو بہت بہادر ہے۔ موت کو اتنی آسانی سے گلے نہیں لگائے گا اور دے بھی اگر موت تعاقب میں ہو تو انسان خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

موت کا خوف یا تو انسان کو بہت بہادر بنا دیتا ہے یا پھر نہایت بزدل..... اور ہم جانتے ہیں کہ تو بزدل نہیں اور موت کے ڈر سے کبھی منہ نہیں چھپائے گا۔

وہ آدمی یا تو مجھے خبردار کر رہا تھا یا پھر ڈار رہا تھا کیونکہ اس کے ہر لفظ میں ہر بات میں موت کا ذکر تھا اور وہ اسے یوں بیان کر رہا تھا جیسے موت اس کے نزدیک ایک نہایت دل چسپ ٹھیل ہو۔

مجھے اچانک بہت غصہ آ گیا میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

”بس بہت ہو گیا۔ تم جو کوئی بھی ہو میرا بچپنا چھوڑ دو۔ اگر آئندہ مجھے نظر آئے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

میری بات کے جواب میں اس کے لبوں پر نہایت پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ جانے سے پہلے بولا۔ ”میں تو جا رہا ہوں لیکن اگر کبھی مشکل میں میری ضرورت ہو تو مجھے زور سے ”گمراہ“ کہہ کر پکار لینا میں آ جاؤں گا کیونکہ میں تیرا خیر خواہ ہوں دشمن نہیں.....“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہوجھا چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسی دن شام کے اخبار میں، میں نے ایک عجیب و غریب کالم پڑھا، وہ کالم ایک ایسی وادی کے متعلق تھا جہاں ہیروں کی بہتات تھی۔ وہاں جو جشمے،

ندیاں، بستی تھیں، ان کے پانی میں بھی بہرے نہ ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جن پہاڑوں سے نکلتی تھیں ان پہاڑوں میں ہیروں کی بہتات تھی۔ پہاڑوں کے اندر غار تھے جو ہیروں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ غاروں سے غاروں سے گزر کر آتے تھے اس لئے وہ بہرے نہ ہوتے تھے۔ لیکن وہاں تک پہنچنا عام انسان کے بس کی بات نہ تھی، وہاں جو حالات پیش آتے تھے ان سے نہ صرف مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن کام تھا۔

یہ کالم ایک ایسے ہم جو نے لکھا تھا جو وہاں پہنچنے میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن وہاں جو حالات پیش آئے انہوں نے اس کو بخوبی الحواس بنا دیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح زندہ واپس تو آ گیا لیکن ابتدائی حالت میں..... لمبے عرصے زیر علاج رہنے کے بعد وہ ٹھیک ہوا تھا اور پھر اس نے یہ کالم لکھا تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ جیسے ہی میں وادی میں داخل ہوا میں نے وہاں ہر طرف ہیروں سے بھرے دیکھے، وہاں کی لہروں میں بہتے ہوئے آتے اور آس پاس پھرتے جاتے، سورج کی روشنی میں وہ وادی تابناک مشرق میں کرتی، جس کی تاب لا ناممکن نہیں تھا۔

اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے بے چہنہ نہ رہا۔ وہاں کیسے پہنچا، اسے وہاں کیسے حالات سے گزرنا پڑا، کن مشکلات میں وہ پھنسا، کس چیز نے اسے اپنا دل کر دیا اور سب سے بڑی بات کہ وہ واپس کیسے آیا.....؟ یہ سب سوالات مجھے بے چین تو کر رہے تھے لیکن اخبار رکھنے سے پہلے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

اس وادی میں جانے کا فیصلہ.....

جو مجھے نہ جانے کتنا ہنگام پڑا لیکن مجھے ہر ماہ میں جانا تھا مجھے ہیروں کا لالچ نہیں تھا میں اس وادی کو دیکھنا چاہتا تھا وہ وادی برازیل میں ایسی جگہ واقع تھی جہاں جانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر کوئی جاتا بھی تو اپنی زندگی لٹا کے آتا تھا اور بعض کا تو کوئی نام نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ میں نے گھر جانے سے پہلے اور

ہاتھ پر دیا تھا کہ گھر جا کر اچھی طرح مطالعہ کر سکوں۔ رات کو مجھے پھر وہی خواب نظر آیا لیکن اس کی کیفیت تھوڑی مختلف تھی۔ میں ایسی پھیل میدانوں میں گھومتا تھا جہاں جیراگی سے دیکھ رہا تھا۔ وہی دیرانی، وہی سنا جھوٹا شروع سے ہی میں خواب دیکھتا آ رہا تھا۔ وہی میں دیکھ رہا تھا کہ اپنے پیچھے ہونے والی خونناک فریادیں سن کر کانپ گیا، جلدی سے مڑ کے دیکھا تو خوف سے وہیں ساکت ہو گیا۔

وہ بھیڑے تھے، سینکڑوں کی تعداد میں، جو اپنی ریح اور خونناک آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے، ان کے منہ سے نکلنے والی خونناک غرائشیں مجھے دہشت زدہ کر دے رہی تھیں، ان کی سفاکی دیکھ کر مجھے جھرجھری آئی، موت میرے سامنے تھی اور مجھے اپنی زندگی کو جانے کے لئے کچھ کرنا تھا اس سے پہلے کہ وہ میری طرف بڑھتے میں نے جلدی سے ایک سمت دوڑ لگا دی، مجھے اپنے پیچھے بھیڑیوں کی خونناک غرائشیں اپنے قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اچانک مجھے سامنے ایک کنواں نظر آیا، میں نے اس طرف دوڑ لگا دی، اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی اور.....

میری آنکھ کھلی تو میں پسینے سے شرابور تھا میرا دماغ دھوکے کی مانند چل رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ملبوں دوڑتا رہا ہوں۔ میں تھوڑی دیر یونہی بیٹھا رہا پھر میں نے اٹھ کر پانی یا تو میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ اسی خواب کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت میری آنکھ کھل گئی۔

دوسرے دن بیدار ہوتے ہی میں جانے کی تیاریوں میں لگ گیا، مانا پاپا نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی بہت سمجھایا لیکن میں اپنی خند پر ازار ہا جو بعد میں مجھے بہت مہنگی پڑی۔

میری خند کے سامنے انہیں ہار ماننا پڑی اور میں ان سے دعا میں لیتا ہوا پہلی ہی دستیاب فلاح سے غافل بن گیا۔ وہاں جا کے میں نے سب سے پہلے

ڈرڈائجسٹ کا مشہور و معروف سلسلہ

نمبر 15 اور 6

## رولوکا

پراسرار قوتوں کا مالک

مکمل اور طویل ترین داستان حیرت

کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قسط نمبر 47 سے قسط نمبر 58 تک

قسط نمبر 59 سے قسط نمبر 70 تک

تحریر: اے وحید قیمت فی کتاب = 150/-

نادیدہ قوتوں کی زور آزمائی، کالی دنیا کی بدروحوں کی شرانگیزی، جنات کی دیدہ دلیریاں، خونی آزمائشوں کی تحیر انگیز اور حیرت انگیز ناقابل فراموش ہاتھ پائی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے خونچکاں بھونچکاں معرکہ جیسے پڑھ کر پڑھنے والے مہبوت اور انگشت بدنداں رہ جائیں گے اور طویل ترین عرصہ تک یہ تمام کہانیاں ذہن کے پردے پر جھلکتی رہیں گی۔

ڈریک ای کیشنز

کتاب مارکیٹ نیواں بازار کراچی

Ph:32744391





میری اور تو کچھ کچھ میں نہ آیا۔ میں نے ایک طرف دوڑ لگا دی وہ سب بھی خوفناک غرائشیں خارج کرتے ہوئے میرے پیچھے آنے لگے، شیر جس کو میں "ٹوٹی" کہہ کر پکارنے لگا تھا اس نے جب دیکھا کہ بیٹھریے میری جان کے ور پہ ہیں تو وہ ان سے بھڑکیا۔ بہت سے بیٹھریے اپنی زندگی کی بازی ہار گئے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اکیلا ٹوٹی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بھاگتے بھاگتے پیچھے مڑ کے بھی دیکھ رہا تھا۔ کچھ میرے پیچھے بھاگ رہے تھے اور کچھ ٹوٹی سے لڑنے میں مصروف تھے وہ پہلی ہی زخمی تھا اور اس لڑائی میں پھر اس کا خون بہنا شروع ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ میں نے زور سے اسے آواز دی تو وہ اپنی طاقت سے دوڑتا ہوا میرے پیچھے آنے لگا میں بھی گرتا پڑتا بھاگتا جا رہا تھا۔

مجھے کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ موت لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آتی جا رہی تھی کہ اچانک میری نظر اس کنوئیں پر پڑی، ہو بہو خواب والا..... میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہے کیونکہ خواب میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں جلدی سے کنوئیں کے پاس پہنچا اور اندر جھانکا۔ وہ بالکل خالی تھا۔ اس کی گہرائی کا بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ بیٹھریے بس جگہ تک پہنچتے ہی واسلے تھے کہ مجھے اسی آدی کا خیال آیا جس نے مجھے اپنا نام گبراک بتایا تھا۔

میں نے زور زور سے اسے پکارا تو جواب میں اس آدی کی آواز آئی "آنکھیں بند کر کے اس کنوئیں میں چھلانگ لگا دو۔"

☆.....☆.....☆

عجیب قسم کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی، میں نے ارد گرد نظر دوڑائی، انتہائی دیران اور غیر آباد سا علاقہ تھا اونچے اونچے پہاڑ، جھاڑ جھکاڑ سے پر علاقہ شام ہونے کے قریب تھی اور میں نے جو کچھ دیکھا اس نے مجھے بہت زیادہ حیران کر دیا ٹوٹی میرے نزدیک ہی دیکھا بیٹھا تھا، ہمارے ارد گرد بہت سے لوگ تھے، عجیب و

غریب، اجاڑ حلیوں میں، انہوں نے اپنے چہروں، چھپایا ہوا تھا، اس لئے میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ ان کے چہرے کیسے ہونگے.....؟

ان کے منہ سے کچھ عجیب سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں اور انہی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی تھی ان کی چال و دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا، وہ بالکل متوازی چلتے تھے نہ اپنے سر کو حرکت دیتے تھے اور نہ اپنے بازوؤں کو، ان میں سے کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا یہ نہیں وہ ہماری آمد سے بے خبر تھے باخود کو ظاہر کر رہے تھے۔

مجھے ٹوٹی کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بالکل خاموش سا میرے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اس کی آنکھیں عجیب سا تاثر دے رہی تھیں جیسے جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ اس کے لئے بالکل غیر متوقع ہو۔ میں نے آہستہ سے اس کی پشت پر ہاتھ بھیرا تو اس نے ہلکی سی غرائش خارج کی..... اس کے منہ سے آواز نکلنے کی دیر بھی کہ جیسے ہمارے ارد گرد دھوئیں چال سا آگیا ہوا، وہ سب لوگ جو پہلے ہماری آمد کو کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے اچانک ہماری طرف دوڑ پڑے، ان کی رفتار بہت کم تھی لیکن وہ دوڑنے کے سے انداز سے ہماری طرف آرہے تھے، ان کے منہ سے بھیا تک اور غیر انسانی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ ہم تک پہنچنے میں ٹوٹی کو ساتھ لیتا ہوا ایک طرف دوڑ پڑا..... تیز دوڑنے کی وجہ سے میرا سانس بھولا ہوا تھا۔ مجھ میں مزید دوڑنے کی سکت نہیں تھی اس لئے میں نیچے گر پڑا وہ شور بہت دور سنائی دے رہا تھا کیونکہ ان کے دوڑنے کی رفتار بہت کم تھی، میں نیچے گرنا ہی رہا تھا ٹوٹی بھی پیچھے دیکھ اور کبھی میری طرف، اس کی حالت سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

میں نے گرے گرے مڑ کے دیکھا، وہ ہمارے بہت قریب پہنچنے والے تھے، میں نے آخری کوشش کے طور پر اٹھنے کی کوشش کی میں اٹھنے میں کامیاب تو ہو چکا تھا لیکن تھوڑا بہت دوڑنے کے بعد میں پھر گر پڑا۔

مجھے میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔

اچانک ٹوٹی میرے پاس بیٹھ گیا اس کے بیٹھنے کے انداز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پاؤں سے زمین کھرچنے لگا۔ اس کے منہ سے غرائشیں نکل رہی تھیں۔ جانے وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ پیچھے دیکھتا اور پھر میری طرف دیکھ کر غرائشیں لگا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں آگیا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ وہ خود بھی زخمی تھا ایسے میں میرا ذہن کیسے سہا سہا سکتا تھا؟

لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا میں کوشش کر کے اس پر سوار ہو گیا میرے اس کے اوپر بیٹھنے کی ذمہ داری کہ وہ ایک زوردار دوڑاڑے اٹھا اور سر پٹ دوڑنے لگا، اس کے بجائے کہ انداز سے کہیں بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ زخمی ہے.....!

میں نے خود کو بڑی مشکل سے قابو کیا ہوا تھا۔ بھاگتے بھاگتے نہ جانے کتنی دیر ہوئی کہ اچانک ٹوٹی رک گیا۔ جتنی تیزی سے وہ دوڑ رہا تھا اس کے بعد یکدم اس کے رکنے سے مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں اچھل کر نیچے گر گیا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد میرے حواس بحال آئے تو میں نے بڑی مشکل سے خود کو کھڑا کیا اور پھر سامنے دیکھ کر میرے ہوش و حواس بالکل ٹھنڈ ہو گئے۔

وہ سانپ تھے ہزاروں کی تعداد میں اور سب کے سب ایسا چمکنے والے تھے ہماری طرف بلکہ تیزی سے آ رہے تھے ان کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں، پہلے تو کچھ لمحے میری عقل نے کام کرنا بالکل ناممکن بنا دیا پھر موت کے خوف نے میرے جسم میں پھریری ڈھرائی، گو کہ آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی لیکن مجھے آخری بار اپنی زندگی کے لئے کچھ کرنا تھا۔

میں جلدی سے ٹوٹی پر سوار ہوا اور اسے ایک طرف بھاگنے کا اشارہ کیا اس سے پہلے کہ ٹوٹی بھاگتا دیکھ کر وہ آواز میری سماعت سے نکل گئی، لہجہ نہ جانے کتنا بے چینی کا تھا۔

"گوبرا کی دنیا میں خوش آمدید دوست.....!"

مجھے یقین تھا کہ تم ضرور یہاں تک پہنچو گے، جو کچھ تمہیں خواب میں نظر آتا تھا وہ سب سچ ہوا، ہو سکتا تھا کہ موت تمہیں چھوٹی لگتی لیکن تمہارے دوست ٹوٹی نے تمہاری جان بچائی، اس نے احسان کا بدلہ اتار دیا جو تم نے اس کی جان بچا کر کیا۔

اب تم چونکہ ہماری دنیا میں پہنچ چکے ہو اس لئے اب اس معاملے کی تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک معاملے میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اور تمہیں یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ صرف تم ہی ہو جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہو۔ "وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو میں نے فوراً پوچھا۔

"تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے.....؟"

یہ سوال پوچھتے ہی میرے ذہن میں ایک روشنی سی دوڑ گئی۔ مجھے یاد آگیا کہ وہ کون ہے.....؟ وہ وہی تھا جو مجھے راستے میں کئی بار ملتا رہا تھا، جس نے مجھے موت سے ڈرانے کی اور خواب کے سچ ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ میرا سوال سنتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "یہ تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ میرا نام گبراک ہے۔ میں گوبرا کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہوں، یہ ساری سلطنت میری ہے۔ بغیر کسی شرکت کے، لیکن کچھ ایسی مخلوق بھی ہے جو میری اس سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے، جس کو تم کچھ دیر پہلے دیکھ چکے ہو۔"

اس کا اشارہ یقیناً ان لوگوں کی طرف تھا جنہوں نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔

"تمہیں یہاں لانے کا مقصد یہی ہے کہ تم ان کو ختم کر دو تاکہ ہم پہلے کی طرح پرسکون زندگی گزار سکیں۔"

"لیکن تم انسانی روپ میں کیسے آئے.....؟"

میری الجھن بدستور برقرار تھی۔

"یہ بات سب جانتے ہیں کہ سو سال کی عمر سے گزرنے کے بعد سانپ جو چاہے شکل اختیار کر لیتا



ہے۔ میری عمر بھی سو سال سے اوپر ہے اس لئے مجھے بھی یہ اختیار حاصل ہے۔“  
لیکن یہ کون سی مخلوق ہے؟ جو تم کو اس سلطنت سے بے دخل کرنا چاہتی ہے اور تم سب اسے طاقتور ہونے کے باوجود ان کا کچھ نہیں لگاؤ سکتے۔“ میں نے ابھرنے لہجے میں پوچھا تو جواب دہ بولا۔

”اب سے بہت سال پہلے کی بات ہے اس وقت مجھے نیا دنیا روپ بدلنے کا اختیار ملا تھا۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سہا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ہماری بھی کچھ حدود ہوتی ہیں جن کو پار کرنے کی صورت میں ہمیں بہت نقصان ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ ہماری دنیا سے باہر جانے کے لئے کچھ حدود ہوتی ہیں۔ اگر کوئی باہر جانا چاہے تو اسے کچھ شرائط پوری کرنی پڑتی ہیں۔ مجھ سے یہی غلطی ہوگئی میں ان شرائط کو پورا کئے بغیر اپنی حدود سے باہر نکل گیا اور دوسری مخلوق کی حدود میں داخل ہو گیا۔ جیسے ہی میرے قدموں نے ان کی زمین کو چھوا انہیں اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ ہماری دنیا میں با آسانی آسکیں اور پھر اس دنیا کے قانون کے مطابق کچھ عرصہ بعد وہ مکمل طور پر ساری جگہ کے مالک بن جاتے اور ہمیں جن جن کرکٹ کر دیا جاتا۔ اور اس مدت کے مکمل ہونے میں کچھ ہی عرصہ رہ گیا ہے اس سے پہلے اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو پھر وہ سب ہو جائے گا جو ہم بالکل نہیں چاہتے۔

ہمارے یہاں گردنے ہمیں ایک عمل بتایا کہ اگر کوئی آدم زاد اس عمل کو کامیابی سے مکمل کر لے تو پھر ہمیں اس مخلوق سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے مل جائیں گے اور اس عمل کے لئے تمہارا نام سامنے آ یا تم میں ہر وہ خوبی ہے جو اس عمل کے لئے ضروری ہے ہم جانتے ہیں کہ تم ہیروں کی وادی میں جانا چاہتے ہو اس کا راستہ نہایت پرخطر ہے اگر تم نے وہ عمل آسانی سے کر لیا، تو ہم با آسانی تمہیں وہاں تک پہنچا دیں گے۔

اگر کسی بھی طرح کم اس عمل میں ناکامیاب ہوئے تو پھر ہمارے ساتھ تمہاری موت بھی یقینی ہے۔“

میں دم بخود اس کی باتیں سن رہا تھا جب چپ ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسا عمل ہے اور مجھے یہ کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔؟“  
وہ سب تمہیں پتہ چل جاتا ہے پہلے تم کو کھانا لو، یقیناً تمہیں اور تمہارے دوست کو بہت بھوک لگی ہوگی۔ آؤ میرے ساتھ۔“

یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل پڑا اور ہم بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس کی بات سن کر میری بھوک واقعی چمک اٹھی تھی اور توی بھی یقیناً بھوکا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو چاروں طرف سے مکمل طور پر بند تھی صرف وہی جگہ تھی جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے۔

سامنے عمدہ قسم کا کھانا موجود تھا اور ایک طرف ایک مردہ ہرن پڑا تھا جو توی کے لئے ہی تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کے کھایا اور اس کے بعد مجھے اتنی نیند آئی کہ پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ صبح جاگا تو ناشتہ پہلے سے موجود تھا، توی بھی میرے قریب ہی بیٹھا تھا، ناشتے کے بعد گبراک آگیا اور مجھے اس عمل کے متعلق بتانے لگا۔

اس کے مطابق مجھے اک ایسا عمل کرنا تھا جس میں مجھے دو دن بھوکا رہ کر ایک لفظ کو مسلسل دہراتے رہنا تھا۔ پھر دو دن کے بعد مجھے صبح کے وقت اس جگہ کی سرچہ یہ جانا تھا جہاں وہ مخلوق رہتی تھی وہاں پہنچ کر نیچے رہنوں ہاتھوں میں مٹی اٹھانی تھی اور آسمان کی طرف پھینک دیتی تھی اور اس کے بعد مجھے فوراً وہاں سے بھاگ آنا تھا اگر اوپر پھینکنے والی مٹی کا ذرا سا بھی ٹکڑا اچھ پڑا کرتا تو فوراً ہلاک ہو جاتا، پھر جیسے ہی میں وہاں سے بھاگتا وہ مخلوق فوراً بیدار ہو کے میرے پیچھے لگ جاتی تھی اس رفتار بہت تیز ہوتی اگر ان کے مجھ سے پہلے قدم کوڑاں سر زمین کو چھو جاتے تو پھر وہ سلطنت انہی کی ہو جاتی اور مجھے ساری زندگی ان کا غلام بن کے رہنا پڑتا، اور وہاں کے مالک بن جاتے اور گبراک کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو عموماً مفتوح قوموں کے ساتھ ہوتا ہے۔

بظاہر تو وہ عمل اتنا مشکل نہیں تھا لیکن اس کے نتائج بہت بھیاںک ہو سکتے تھے، مجھے تو ہر حال میں وہ مل کر رہا تھا کیونکہ انکاری صورت میں بھی موت میرا مقدر ہوتی، اور یوں بزدلوں کی طرح مرنے سے بہتر تھا کہ میں لڑ کر مرتا اور اگر مقدیر اس ساتھ دیتی تو میں بچ بھی سکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے وہ عمل شروع کر دیا، توی مسلسل میرے ساتھ موجود تھا۔ دو دن بھوکا رہنا اتنا آسان تو نہ تھا لیکن زندہ رہنے کی خواہش بہت سے ہمتوں کو ممکن بنا دیتی ہے۔ دو دن بعد جیسے ہی مکمل ہوا گبراک میرے پاس آگیا پھر اس نے مجھے کھانا پیش کیا دو دن بھوکا پیاسا رہنے کے بعد کھانے کو دیکھ کر میں رونہ لگا اور خوب سیر ہو کے کھایا۔

تھوڑی دیر بعد مجھ کو توی کے ہمراہ اسی جگہ پر موجود تھا جہاں مجھے کہا گیا تھا، میں نے جب کہ دونوں ہاتھوں سے مٹی اٹھائی۔ مٹی کیا تھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں تھی اور میں نے اللہ کا نام لے کر اوپر پھینک دی اس کے فوراً بعد میں بھاگ کے پیچھے بھاگ گیا۔

جیسے ہی وہ مٹی اوپر بلند ہوئی ایک کان بھاڑ دینے والا شور بلند ہوا اور میں نے دیکھا کہ وہی مخلوق ڈراؤنی آوازیں نکالتی ہوئی میری طرف بھاگی آ رہی ہے۔ میں جلدی سے توی سے سوار ہوا اسے بھاگنے کو کہا کیونکہ میں کسی طرح اس مخلوق کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا بھاگتے بھاگتے۔

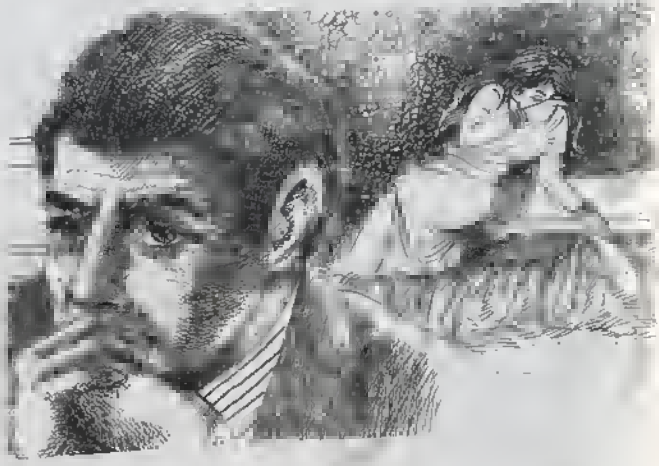
اچانک ایک اونچی جگہ دیکھ کر توی نے چھلانگ لگی اور میں اس کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک طرف گر گیا۔ وہ مخلوق ہم تک پہنچنے والی تھی کہ توی ایک زوردار دھماکے سے میری طرف بھاگا میں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا اور بہت پھرتی سے اس کے اوپر سوار ہو گیا اور ہم گبراک کی سرحد پہنچ ہی گئے جیسے ہی میرے قدموں نے اس زمین کو چھوا اس مخلوق کی بھیاںک آوازیں بلند ہوئیں اور آفاقانان کے جسم مٹی بن کر جھڑنے لگے اور

تھوڑی دیر بعد ان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ آخر کار میں موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ میں نے جیسے ہی پیچھے مڑ کے دیکھا تو حیران رہ گیا، ہزاروں کی تعداد میں گبرا میرے پیچھے موجود تھے ان کی سرسراہٹیں مجھے خوف زدہ کئے دے رہی تھیں۔ اچانک گبراک میرے سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے سے خوشی چھلک رہی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی مجھے مبارک باد دی اور پھر اپنے منہ سے ایک منکا نکال کے مجھے دیا اور ”یہ منکا دنیا کے چند خوش نصیب لوگوں کے پاس ہے، یہ جب تک تمہارے پاس ہے تم قسمت کے دشمن رہو گے تم نے ہم پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو ہم کسی صورت نہیں اتار سکتے لیکن اپنی سب سے قیمتی چیز تمہیں دے رہے ہیں، اگر کبھی بھی تم مشکل میں ہو گے تو مجھے آواز دے لینا میں فوراً تمہاری مدد کو آ جاؤں گا۔

اب تم جاؤ ہم تمہیں ہیروں کی وادی میں چھوڑ دیتے ہیں، وہاں سے کیسے لکھنا ہے یہ تمہیں خود سوچنا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل پڑا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہیروں کی وادی میں آسانی سے داخل ہوا جاسکتا تھا۔ یہاں پہنچ کر گبراک نے مجھے الوداع کہا اور میں توی کے ساتھ اس وادی کی طرف چل پڑا۔ اونچے نیچے راستے پر چلتے ہوئے ہم آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ پہاڑی علاقہ تھا اس لئے چلتے ہوئے بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی کیونکہ ذرا سا پیڑ پھسلنا تو بندہ سیدھا نیچے سخت زمین پر، اتنی اونچائی سے پتھریلی زمین پر گرنے کا ایک ہی حل نکلا۔۔۔۔۔۔ موت۔۔۔۔۔۔!

سہ پہر ڈھلنے کے قریب تھی اور میں سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے کسی مناسب جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں سے ہم گز رہے تھے وہ راستہ بل کھاتے ہوئے ایک غار میں داخل ہو رہا تھا۔ میں بھی اسی راستے پر آگے بڑھتا گیا۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے پانی کا شور سنائی دینے لگا پھر جیسے ہی میں ایک موڑ مڑا



## جادوگر

عبدالحمید ساگر - کنڈیاں

نوجوان بولا میں ہر صورت تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں، تمہاری موت کے بعد میں ساری دولت کا مالک بن جاؤں گا لیکن اچانک اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ کچھ ہو گیا جس کا وہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔

جرم و سزا کی ایک اچھوتی اور دل و دماغ کو بہوت کرتی حیرت انگیز خونی کہانی

”ہاں، میں واقعی جادوگر ہوں، اگر میں جادوگر نہ ہوتا تو تم جیسی امیر اور خوب صورت حسینہ کو اپنے جال میں کیسے پھنساتا۔“ فرانک نے جواب دیا۔

”ہاں..... ہاں..... اچھا مذاق کر لیتے ہو تم..... لیکن تم بتاؤ نہ مجھے جادو کے بارے میں۔“ جولی نے کہا۔ جولی ایک امیر لڑکی تھی۔ ٹوکیو شہر کے مہنگے علاقے میں اس کا شاندار بنگلہ تھا۔ ایک مرشدِ زخمی، جو ایک حادثے میں

”وہ جادو کے زور سے امیر بن گیا تھا۔“

”کیا تم واقعی جادو جانتے ہو؟ کیا تم واقعی ایک جادوگر ہو؟ فرانک، بتاؤ ناں، مجھے۔“ شہر کے ایک مہنگے سینئر نوٹس ایک گول میز کے گرد ایک تیس سالہ شخص جس کا نام فرانک تھا، ایک خوب صورت، سنہری بالوں والی لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ لڑکی جس کا نام جولی تھا، فرانک سے بات کر رہی تھی۔

میری آنکھیں روشنی کی وجہ سے چکا چوند ہو گئیں۔

جی ہاں..... وہ بیروں کا غارتھا اور وہ روشنی انہیں کی تھی۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پانی ان بیروں کو چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ پانی کی رفتار چونکہ بہت تیز تھی اس لئے جب وہ جوش سے غار کی دیواروں سے ٹکراتا تو میرے اپنی جگہ سے ٹوٹ کر پانی میں بہہ جاتے۔

جو کچھ میں نے سنا تھا اس کی حقیقت میرے سامنے تھی کچھ یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن وہ خواب نہیں تھا، میں دیوار کے قریب جا کے بیروں کو چیک کرنے لگا وہ مضبوطی سے چپکے ہوئے تھے میں نے ایک کو پکڑ کر زور سے کھینچا جس کے نتیجے میں میرا پاؤں پھسل گیا اور میں پانی میں بہتا جا رہا تھا۔ ٹوی بے چینی سے میرے ساتھ ساتھ ہی دوڑ رہا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب سی غرائشیں نکل رہی تھیں، اس لئے مجھے ٹوی بہت پیارا آیا، میرے اک احسان کے بدلے اس نے ان گنت احسان مجھ پر کر دیئے تھے، پانی بہت تیز تھا جس کی وجہ سے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا، ایک جگہ کچھ گہرائی تھی جہاں پانی گر رہا تھا، میں نے بہت کوشش کی کسی طرح خود کو قابو کر کے نیچے گرنے سے بچاؤں..... لیکن بے سود.....

میرا سر زور سے ایک پتھر سے ٹکرایا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا.....

سورج کی تیز چمبن کی وجہ سے میں نے ہشکل آنکھ کھولی، پہلے تو مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ میں کہاں ہوں پھر ٹوی کی موجودگی اور علاقہ غیر..... میرے سارے حواس یکثرت بیدار ہو گئے۔

میں آہستگی سے اٹھا۔ میرا سرا بھی بھی بہت درد کر رہا تھا۔ ارد گرد نظر دوڑائی تو میں حیران رہ گیا۔ سورج کی روشنی میں وہ داوی جنت کا منظر پیش کر رہی تھی، میں نہیں جانتا تھا کہ میں پانی سے کیسے نکلا لیکن اس وقت میں جس جگہ لیٹا تھا وہاں آس پاس میرے پھرے پڑے تھے اور پانی بھی اپنی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ سورج



تھوڑی سی چپک مٹی تھی، لیکن ابھی تک شاندار تھی، اس کا کروڑوں کا بزنس تھا، لیکن اس کا رشتہ دار کوئی نہیں تھا۔ ہر ایک نے چند روز پہلے جی جی سے شادی کر لی تھی۔ جوی اسے اسی کیسینو میں لے گئی اور پھر آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی ہو گئی۔ پھر بہت جلد ان دونوں نے شادی کر لی۔

فرائک بالکل موچھوں والا، ایک عام انسان تھا۔ اس کے سر کے بال کافی گر گئے تھے۔ لیکن اسے پانی تھے کس اس کا سر ڈھانپ سکیں۔ فرائک کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جادو جانتا ہے۔ جادو کے ذریعے جو اچھا ہے اور پسے کا ہے۔

”اے تھوڑا بہت جانتا ہوں۔“ فرائک نے کہا۔

”لیکن یہ بہت سمجھنا میں خود غائب ہو سکتا ہوں، یا کسی کو غائب کر سکتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ دراصل اس دنیا میں جو شخص بھی رہتا ہے وہ تھوڑا بہت جادو جانتا ہے۔ یہ دماغ..... یہ انسانی دماغ جادو ہے۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔“

جولی بولی: ”چھو!۔۔۔“ تب کو میں شام تک چکر لگولی۔ تم انجانے کرو، چھوڑا اپنی ایک فریڈ سے ملے جانا ہے۔“ ٹھیک ہے بے بی، جاؤ لو۔“ ”فرانک نے ہونٹوں کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے کہا۔ بدلے میں جولی نے بھی مخصوص اشارہ کیا اور ہنسنے ہوئے کیسیٹس باہر لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

”تم جانتے ہو کہ اس سرنگ پر پورے بیس منٹ بعد پولیس پٹرول آتی ہے جیسے ہی پولیس کی کار گزر جائے تم سامنے والے بنگلے میں کود جانا، دیوار چھوٹی ہے، تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تم نے اپنا کام بیس منٹ کے اندر اندر کرنا ہے۔ بنگلے کا تین گھنٹہ تمہیں کھلا ملے گا۔ مرشدین کی جانی بھی اس میں لگی ہوگی۔ تمہیں بس کم وقت میں اپنا مشن مکمل کرنا ہے۔“

یہ فرامیگ کے الفاظ تھے۔ اس کے سامنے، ایک گنچا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک میٹھے ہوٹل میں سینڈویچ اور کافی کا مزہ لے رہے تھے۔ ہوٹل کی اس منزل سے شہر کے وسط میں بنا ہوا وہ جگہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ارد گرد ایک گھومتی ہوئی سڑک تھی، جوۂ خراب

”فراک“ ”محبذا آدی بولا۔ “کون گزیر تو نہیں ہوگی۔“ ”تم فکر مت کر دیاؤ۔“ ”فراک نے کہا۔ “تم اس اپنے مشن کے بارے میں سوچو، اس کے بعد ملے دانی دولت کے بارے میں۔“ ”اسی کے بارے میں تو سوچ رہا ہوں فراک“ ”ایڈی نے کافی کا گھونٹ چلن میں ڈالنے ہوئے کہا۔ “لیکن فراک میں بھی اسی شہر میں رہنا ہوں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم اتنی اہم معلومات کیسے اٹھس کر لیتے ہو؟“ ”تمہیں یہ بات آہستہ آہستہ سمجھ میں آئے گی، ایڈی۔“ ”فراک نے اپنا جیشہ اتارتے ہوئے کہا۔ ”ابھی بچے ہو، عقل کے کچے ہوا بھی تم کیسے کے مراحل میں ہو مجھ جیسے جادوگر کے ساتھ رہو گے تو بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔“ ”آپ بات یاد رکھنا، جتنا میں نے سمجھا ہے صرف اتنا کہ اسی عقل لڑانے کی کوشش مت کرنا اور دیر لمبی میں تمہیں آزاد چکا ہوں، تب جب ہمیشہ اپنا ذہن استعمال کرتے ہو۔“ ”مصیبت میں پھنس جاتے ہو۔“ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ”ایڈی نے گردن جھکاؤی۔ “میں ہمیشہ تمہارا کہنا مانوں گا کہ فراک مجھے اگر کچھ رقم دے دے تو۔“

”کیا مطلب۔ کیسی رقم..... کیا تم نے پھر شراب پینی شروع کر دی ہے۔“ فرانک نے بھونٹ اچکا کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں.....“ ایڈی بولا۔ ”دراصل ایک نئی کال گرل دیکھی ہے۔ کل اس نے مجھ سے بات بھی کی۔ وہ مجھے ایک رات کے لئے پانچ سو یوروں ملے گی، اگر تم کچھ مدد کرو، آج کل ایسا نام خراب چل رہا ہے۔“ فرانک ”اوھو..... تو تم لڑکی کا مزہ لینا چاہتے ہو۔“ فرانک نے کہا۔ ”نھیک ہے میں تمہیں پورے ایک ہزار یوروں کا، کیونکہ میں لڑکی کے بالکل خلاف نہیں ہوں، لڑکی جیسی لہی ہے، اس کے بعد وہ دوں کچھ دیر تک بیٹھے رہے، پھر اٹھ کر چلے گئے۔“

☆.....☆.....☆

ایڈی پاچ منٹ سے پولیس پٹرول کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا۔ جس کا ساہ رنگ تھا۔ اس نے احتیاط کے طور

پرائیک چاقو بھی اپنی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے معمول کے کپڑوں پر کالے رنگ کے کپڑے جو ڈاگری کی طرح تھے پہن رکھے تھے۔ وہ سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس نے دیکھا پولیس پٹرول کی گاڑی گزر گئی۔ سفید رنگ کی یہ کار بہت آہستہ سے گزری تھی۔ کار کے جاتے ہی ایڈی نے سڑک بائیں اور مختلف کیاریوں میں سے گزرتا ہوا بنگلے کی دیوار تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا، پھر جلدی سے بنگلے کی دیوار بھلا لگ کر کود گیا۔ ایڈی کو کمرے میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا، وہ اندھیرے میں احتیاط سے چلتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کچھ روشنی نظر آئی۔ اس کمرے میں دروازے پر ایک مردانہ سویا ہوا تھا۔ اس کا منہ نیچے کی طرف تھا۔ اس کے ساتھ ہی پلنگ پر ایک خوب صورت لڑکی سوئی ہوئی تھی۔ اس کے سنہری بال اس کے کندھوں پر پکھڑے ہوئے تھے۔

ایڈی کچھ دیر کا رہا یہ تسلی کرنے کے لئے کہ وہ دونوں کہیں جاگ تو نہیں رہے۔ پھر وہ تیزی سے حرکت میں آیا، اس نے الماری سے دھڑاڑ چوڑی نکالی شروع کر دی۔ الماری پہلے سے ہی کھلی ہوئی تھی۔ جس سائیز پر لڑکی سوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر ایک ٹیکس پڑا ہوا تھا جو کہ خالص ہیروں کا تھا۔ ایڈی نے اسے بھی اپنے بیک میں ڈالا، پھر اس نے کچھ درازیں چیک کیں، جن میں کچھ خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں تھیں، ایڈی نے انہیں اپنی جیب میں ٹھونس لیا، پھر وہ دوسرے لاکر کی طرف بڑھا، اس میں اسے نوٹوں کی بہت سی گڈیاں ملیں، دوسرے ہی لمحے وہ بیک کی ریونت بن گئیں، ایڈی اس دوران پلنگ پر سوتے ہوئے مرد اور عورت کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا، کہیں وہ جاگ نہ جائیں، چھوٹی پھیل کی ایک دراز میں اسے کچھ کریڈٹ کارڈ، سونے کے کچھ سکے، اور کچھ نقدی ملی، اس نے وہ بھی بیک میں ڈال لی، پھر وہ جب جانے کے لئے مڑا، تو اچانک اس کی نظر میز پر پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے نیپ ریکارڈ پر پڑی، ایڈی سکرایا اور اسے بھی اٹھا کر اپنی جیب میں ٹھونس لیا، وہ کمرے سے باہر نکل کر بنگلے کی چار دیواری میں کھڑی مرشدین کے قریب

آیا، اس نے گیت کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحوں بعد اس کی کار گیٹ سے باہر نکلے۔

جیسے ہی اس کی کار سڑک پر پہنچی، پٹرولنگ پولیس کی کار اس کی کار کے قریب آ کر رکی، ایک پولیس والا ڈرائیونگ گیٹ کے قریب آ کر بولا۔ ”سر، آپ اس ناظم اتنی رات کو کہاں جا رہے ہیں۔“

”ایڈی سنہیلے ہوئے بولا۔ ”میرا نام ڈاکٹر ایڈی ہے، یہ سامنے والا بنگلہ میرا ہے، ہاسپٹل سے فون آیا ہے، کوئی ایمرجنسی ہے شاید اس لئے مجھے جانا ہوگا بہت جلد۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ اوکے ڈاکٹر ایڈی۔ لیکن کونسا آئی ایم سوری۔“ پولیس والا بولا۔ اور ایڈی کی کار سڑک پر آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

جونہی مرشدین کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی، جولی اٹھ بیٹھی، وہ بیٹھی اور اگلے ہی لمحے اس نے فرائک کو بھی جگا دیا۔ ”فرائک۔۔۔۔۔ ڈرائنگ۔۔۔۔۔ اٹھو کوئی ہماری کار لے جا رہا ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ فرائک جوں اٹھا سو اٹھا تھا اچانک اٹھ بیٹھا۔ ”کون۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ جولی۔“ پھر وہ تیزی سے بھاگا، جولی اٹھ بیٹھی، وہ بھی اس کے پیچھے باہر جانے لگی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی، فرائک ہاتھ میں پھل لئے اندر داخل ہوا، اس نے جولی پر پھل تان لی۔ ”آج تم مرد گی، جولی آئی ایم سوری۔“

”کک۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم فرائک، یہ کیا مذاق ہے۔“ جولی کا منہ پتے ہوئے بولی۔

”مذاق نہیں ہے۔“ فرائک غرایا۔ ”آج میں تمہیں واقعی مار دوں گا، پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ میں واقعی جادوگر ہوں۔“

”فرائک۔۔۔۔۔ مگر ڈرائنگ، میں تمہاری بیوی ہوں۔“ جولی نے احتجاج کیا کیونکہ وہ فرائک کی آنکھوں میں خون دیکھ چکی تھی، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو، میں تو تم سے بڑا

کرتی ہوں۔“

”تم لو تار پیار کا۔“ فرائک غرایا۔ ”پیار نام کی کوئی چیز پر میں یقین نہیں کرتا، میں دولت کمانا چاہتا ہوں۔ صرف دولت، میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ میں آج نہیں مار دوں گا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مرنے سے پہلے ضرور جان لو کہ میرا بیان کیا ہے اور تم پر ضرور جاننا چاہو گی۔“ جولی خاموش رہی تھی۔ لیکن وہ موت کا خوف محسوس کر چکی تھی۔ وہ ہمیشہ جولی کی باتوں سے ڈرتی رہی تھی۔ اس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دی جو اشارہ تھا کہ وہ واقعی جانا چاہتی ہے کہ فرائک اسے کیوں مارنا چاہتا ہے۔

”تم نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔“ فرائک بولا۔

چور واقعی تمہاری مرشدین لے گیا ہے، صرف گاڑی ہی نہیں وہ تمام نقلی چیزیں بھی جو میں نے اس کے لئے الماری میں رکھی تھیں۔“

”نقلی۔“ جولی مشکل سے بولی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ نقلی۔“ فرائک نے پھل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ پھل اصلی ہے، میں تمہیں مار دوں گا اور پولیس کو بتاؤں گا کہ چور نے تمہیں گولی مار دی، کیونکہ تم نے اس کی بات نہیں مانی، تم نے مزاحمت کی تھی۔ اصلی زیورات بھی میں نے سنبھال لئے ہیں اور زیورات کی انشورنس کی رقم بھی میں لے لوں گا۔ یہی نہیں، گاڑی کی بھی بیمہ کی رقم مجھے ملے گی اور یہی گاڑی بھی۔ وہ چکی ہوئی گاڑی تھی، کئی بار تمہیں کہا کہ اسے بیچ دو لیکن تم نے میری بات نہیں مانی لیتا، مجھے پرانی چیزوں سے بہت لگاؤ تھا۔“

”تم۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا۔“ جولی نے کہا۔

”کس بات پر۔۔۔۔۔ کہ میں سب سے بڑا جادوگر ہوں۔ لیکن تمہارے مرنے کے بعد تمہیں یقین آ جائے گا کہ میں نے کس طرح جالا کی سے بے پناہ دولت اکٹھی کر لی۔ تمہارے مرنے کے بعد کسی خوب صورت سی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔ ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“

”فرائک کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟“

جولی نے کہا۔

”تم واقعی خوب صورت ہو جان۔۔۔۔۔ لیکن میں

زندگی بھر تمہارے احسانوں سے دب کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں کسی غریب خوب صورت لڑکی سے شادی کروں گا جسے صرف میں نظر آؤں، لیکن تم ایسی نہیں تھی۔“ فرائک نے کہا۔

”فرائک۔“ جولی بولی۔ ”وکیو ایسا ظلم مت کرو۔ میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا جیسے تم سوچ رہے ہو اور اگر اس چور نے بھی پولیس کو بتادیا کہ اس نے تمہارے کہنے پر چوری کی تھی تو۔۔۔۔۔ تم جی نہیں پاؤ گے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ فرائک نے تہقید لگایا۔ ”تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ مجھے کیا کھلاڑی سمجھتی ہے۔ وہ چور تب پولیس کو بتائے گا، جب وہ زندہ بچ پائے گا مجھے معلوم تھا کہ اسے مغربی سیوزک بہت پسند ہے۔ میں نے ایک چھوٹے نیپ ریکارڈ میں، ہم فٹ کر دیا تھا اور میز پر رکھ دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اسے ضرور اٹھائے گا۔ اور وہ واقعی اسے لے گیا، پتیارا جیسے ہی آن کرے گا، ہمیشہ کے لئے اوپر چلا جائے گا۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ لیکن فرائک۔۔۔۔۔ جولی بھلائی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس رک گئی ہو۔“ تم مجھے چھوڑ دو، تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو، میری دولت تو تم لے ہی رہے ہو مجھے چھوڑ دو۔“

”تم بھول رہی ہو شاید۔“ فرائک نے کہا۔ ”ہم نے تمہاری بھی تو انشورنس کرائی تھی۔ وہ بے بسی مجھے مل جائیں گے اور ویسے بھی میں تمہیں زندہ چھوڑ کر کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا۔ گڈ بائی میڈم جولی مجھے افسوس رہے گا کہ تم بے موت مر رہی ہو لیکن کیا کروں تم نے مجھ پر بھر دے کر کے دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی کی تھی۔ ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی دھماکے کی آواز آئی اور جولی فرش پر لوٹنے سے منہ گر پڑی، جبکہ فرائک کپڑے تبدیل کرنے والی روم میں داخل ہو گیا۔

واش روم سے چند منٹ میں فرائک باہر نکلا اچانک دروازے کو کسی نے زور زور سے کھٹکھٹایا۔

دروازے پر ایک پولیس والا کھڑا تھا۔





دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لوزیدہ لوزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بٹھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

بجس اور سپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

**میری** شادی بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہوئی تھی جس کو پریس میڈیا نے زبردست کوریج دیا تھا۔ کون سے اخبارات اور جرائد تھے جس میں ہماری شادی کی تکین تصاویر نہیں چھپی تھیں اور کون سا چینل ایسا تھا جس نے شادی کی تقریب کی فلم نہ دکھائی ہو۔ میں ایک عامی لہن کے بناؤ سنگار میں تھی۔ ہماری شادی ایسی تھی جیسے ہندوستان کے راجا رانی کی..... ہماری شادی اور ساجن کے جذبے عقادت کو خوب سراہا گیا تھا..... کیوں کہ اس روز شہر کے دو ہزار مساکین کو نہ صرف کھانا کھلایا گیا بلکہ کپڑے اور ملبوسات تقسیم کئے گئے۔ اس کے علاوہ پانچ سو ایسی لڑکیوں کا بیاہ کیا گیا جو جہیز نہ ہونے کے سبب گھر بیٹھی تھیں۔ انہیں اتنا جہیز دیا گیا تھا کہ کل سسرال واسلے انہیں کم جہیز نہ لانے کی پاداش میں نہ طعنے دیں اور انہیں جلا دیں اور ان کی زندگی اجیرن اور حرام کر دیں۔

اس کے علاوہ اس شادی کی تقریب میں نہ صرف فلمی دنیا کی سرکردہ شخصیتیں بلکہ صنعت کار اور بزنس مین اور عام ملازمین اور صحافت کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس یادگار شادی کے بارے میں ایک عام خیال تھا آج تک ممبئی شہر کیا بلکہ پورے ہندوستان میں

ایسی شادی کسی کی بھی نہیں ہوئی..... کئی دنوں تک اس شادی کا چرچا رہا۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ میں جس سادگی میں تھی اس نے میرے حسن و شباب کو ایسا نمایاں اور اجاگر کیا کہ اس میں چار چاند لگ گئے.....

مئی مومن ہم نے اپنے ہی دیں میں منایا۔ پونا میں آبشار تال کے پاس اس کی ایک کٹھنی تھی۔ اس نے سہاگ کی پہلی رات مجھ سے کہا۔

”سرد جا.....! میں نے تم سے اس لئے شادی کہ کہ تم حسن و جمال کی دولت سے مالا مال ہو اور تم نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر جیسے جادو کر دیا تھا..... اور پھر میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ تم نہ صرف بہترین بیوی سہاگ کی ثابت ہوگی بلکہ پر خلوص بھی..... تم میں ہر جانی پن نہیں ہوگا۔ تم باوقار ثابت ہوگی۔

میں تمہاری محبت اور رفاقت کا بھوکا ہوں مجھے کبھی عورت کے گداز بدن کی طلب اور ہوس نہیں رہی..... اگر ہوتی تو میں فلمی اداکارہ، ماڈلنگز اور نوجوان حسین سے حسین لڑکیوں کو بستر کی زینت بنا سکتا تھا۔ اس لئے کہ میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں..... دولت میں اتنی کشش اور طاقت ہے کہ میں

جس پتی، بہن اور بیٹی کو خریدنا چاہتا تھا خرید سکتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔۔۔۔۔ میں بے دارغ رہا۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اپنی ساری محبت میری جھولی میں ڈال دو۔۔۔۔۔ تمہاری رفاقت اور جذبے کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ تم ہر ماہ جیب خرچ کے لئے جتنی رقم کی ضرورت ہے مجھ سے لے سکتی ہو۔۔۔۔۔ تمہارے اکاؤنٹ میں ہر ماہ پانچ لاکھ روپے جمع ہوتے رہیں گے۔۔۔۔۔ تم اس کی مالک ہوگی۔۔۔۔۔ میں تم سے حساب نہیں لوں گا نہ یہ پوچھوں گا کہ تم اپنی رقم کس طرح خرچ کرتی ہو۔ اس کے علاوہ مزید رقم چاہئے تو وہ بھی مل جایا کرے گی۔۔۔۔۔ لیکن ایک یا دو رکھو۔۔۔۔۔ اگر میں نے تم میں ہر جگہ اپنی کی بوجھیں محسوس کی تو تمہیں درد دھ کی طرح نکال پھینک دوں گا۔

میں نے بھی جن کے بارے میں بھولے سے بھی نہیں سوچا اور نہ ہی اس کا خیال آیا۔ آخر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ لیکن اس کے خلاف میرے دل کے کسی کونے میں جو نفرت تھی وہ بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس لئے کہ اس نے مجھے فریب دیا تھا۔ میری محبت اور عزت کو پامال کیا تھا۔ اس طرح دو برس کا عرصہ بیت گیا میں اور ساجن اپنی اپنی دنیا میں گم رہے۔ میں واقعی ساجن سے بچی اور بے حد محبت کرنے لگی۔ ہم دونوں کتنے گن، خوش اور سرشار تھے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

دو برس کے بعد میں نے سنا کہ شو بھا اور جن میں علیحدگی ہوگئی۔ اس بات سے حیرت تو نہ ہوئی البتہ خوشی ضرور ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس لئے جن کی متعدد فلمیں بری طرح فلاپ ہوئیں۔ اس جوڑی پر زوال آ گیا تھا۔ پھر اس جوڑی کو فلم سازوں نے اپنی فلموں میں لینا بند کر دیا۔ وہ ایک طوائف مرد تھا لیکن یہ دھند ابھی متاثر ہو گیا جس نے اس کا مستقبل تاریک کر دیا تھا۔ اس کی جگہ نئے اور ابھرتے ہوئے نوجوان ہیروں نے لے لی تھی۔۔۔۔۔ ادھر شو بھا کا سحر ماند پڑنے لگا تو اس نے ایک مارواڑی بڑھے سے شادی کر لی جو

برس میں تھا اور وہ اس کی حصہ دار بن گئی تھی۔

پھر ایک روز میری اس سے اتفاقہ ملاقات ہو گئی۔ میں ایک ریسٹورنٹ میں شام کے وقت اکیلی بیٹھی آکس کریم کھا رہی تھی کہ جن ایک ایسی عورت کے ساتھ داخل ہوا جو عمر میں اس سے دس بارہ برس بڑی تھی۔ جن نے مجھے نہیں دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے اندر نفرت کی لہر اٹھی اور تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہتی تھی لیکن چوں کہ وہ بیرونی دروازے کے پاس جو میز تھی اس پر بیٹھا تھا اور مجھ پر اس کی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ میں اس سے سامنا کرنا اور اس کی شکل دیکھنا نہیں بلکہ اس کے منہ پر تھوکانا چاہتی تھی۔ وہ پوری طرح اس عورت کی طرف متوجہ تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں پیوست کئے باہم کئے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی پھر بے کے تاثرات اور آنکھوں کے دالہاندین، وارڈن اور خود بہرہ دی سے ہو رہی تھی۔ اس ریسٹورنٹ کے ہال میں لڑکیاں لڑکے۔۔۔۔۔ مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے اسے دیکھا تھا لیکن ان میں سے اسے کسی نے لفت نہیں دی تھی اور ایک سر نظر انداز کر دیا تھا۔۔۔۔۔ جب اس کا عروج تھا وہ کسی تقریب اور ریسٹورنٹ میں گھستا تو مرد اور عورتیں کیا لڑکے اور لڑکیاں اس پر پراندہ بن کر نثار ہوتی تھیں۔ میں نے اس کا عروج دیکھا اور آج اب زوال دیکھ رہی تھی۔ ایک ستارہ تھا جو ڈوب گیا تھا۔ لوگ بھی چہ چہ سورج کی ہی تو بوجھ کر تے ہیں۔

دوران گفتگو اس عورت نے اپنے برس سے ایک لفاظ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ عورت اپنی منہ قطع اور چہرے مہرے سے مال دار معلوم ہوئی تھی۔ اس کی تین انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگ مگاری تھیں۔ اس عورت نے ناشتے کا بل ادا کیا تھا۔ اٹھتے وقت معا اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ بڑے زور سے چونکا۔ اس نے ان میزوں کی طرف جن پر مرد بیٹھے تھے اشارہ کرتے

ہوئے شاید اس عورت سے کہا تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہے۔ عورت نے اس سے گرم جوشی سے معافی مانگ لیا۔ پھر وہ اسے دھت کر کے باہر گیا۔ دوسرے لمحے میں واپس آ گیا۔ پھر میری میز پر آ گیا۔

اسے دیکھ کر میری سوئی ہوئی جیب محبت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ نفرت اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”او سرد جا۔۔۔۔۔!“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم کسی ہو۔۔۔۔۔؟ آسمان پر چاند ہر ماہ نظر آ جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی یہ چاند دوسرے کے بعد نظر آیا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے رکی انداز میں کہا۔ ”یہ محض اتفاق ہے۔ آدی قریب رہ کر بھی دور ہو جاتا ہے۔“

اس نے مجھے اوپر سے نیچے دیکھا۔ پھر بولا۔

”ان دو برسوں میں تم پہلے سے کتنیں حسین، پر شباب، گداؤ بدن کی اور سولہ برس کی دیشیزہ ہو گئی ہو۔۔۔۔۔ عمر بڑھنے کے بجائے کم ہو گئی ہے۔ تم بڑی خوش قسمت ہو۔ تم نے ایک کھرب پتی سے شادی کر کے گھر بسالیا۔“

”یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔“ میں نے لٹی سے کہا۔ ”تم نے محبت مجھ سے کی اور شادی کسی اور سے کر لی۔ آخر مجھے تو اپنا گھر بسانا تھا۔۔۔۔۔ جیون گزارنے کے لئے کسی نہ کسی کا ہاتھ تھا مانتا تھا سو میں نے ساجن کا ہاتھ حتم لیا۔۔۔۔۔ اس نے مجھے جو محبت اور آسودگی دی تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ سے۔۔۔۔۔ میں نے اسے اتنی محبت دی ہے کہ اپنی زندگی میں کسی کو نہیں دی۔ وہ میری محبت کی بڑی قدر کرتا ہے۔“

ان فردگی سے کہنے لگا۔ ”میں ناکای اور مالی مشکلات کے دلدل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی دھنستا چلا جا رہا ہوں۔ اب بہت برے دن آ گئے ہیں۔ مالی حالت بڑی ابتر ہے۔ تنگ دچی اور قرضوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ پہلے فلم ساز

اپنی فلموں میں لینے کے لئے گفتگوں میری دہلیز پر کتوں کی طرح دم ہلاتے رہتے تھے۔ اب وہ میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔ اب جب میں ان کی خنیں اور ساجنیں کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ایک وقت ہم بھی تمہاری فٹیں ساجنیں کرتے تھے تم گھاس بھی نہیں ڈالتے تھے۔۔۔۔۔ لہذا اب تم ہم سے کوئی امید نہ رکھو۔۔۔۔۔ اور پھر تمہاری مانگ اور مقبولیت صفر کے برابر بھی نہیں رہی۔ تم سے کہیں اچھے سنے ہو یاد آ گئے ہیں جن کا طوٹا ہوا رہا ہے۔۔۔۔۔ بہتر ہے کہ اب تم تخت مزدوری کر کے زندگی گزارو۔“

جب وہ اپنا ردنا رو چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہاری شو بھاسے علیحدگی کیوں ہو گئی؟“

”ہم دونوں میں ایک معاہدہ شادی سے قبل ہوا تھا کہ ہم دونوں شادی کے بعد ایک دوسرے کی ذاتی زندگی اور معاملات میں نہیں جھانکیں گے۔ نہ ہی آمدنی سے سرکار رکھیں گے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”جانتی ہو ہندوستانی اداکارائیں دینی، کناڈا اور دوسرے غیر ممالک میں کیوں جاتی ہیں۔ وہاں ان کی بڑی مانگ ہوتی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہیردکس سے ان سرمایہ داروں کی پوئیاں۔۔۔۔۔ ہم میں اس لئے مجھ نہ سکی کہ وہ بیک وقت اداکارہ اور کال گرل تھی۔ پیو نہیں تھی۔۔۔۔۔ میں نے جو پونجی بچا کر رکھی تھی اسے بڑی احتیاط اور کفایت شکاری اور قناعت سے خرچ کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا یہ کب تک ساتھ دے گی۔۔۔۔۔ کاش! میں نے شو بھاسے شادی کی بھول نہ کی ہوتی اور ہم دونوں نے گھر بسالیا ہوتا۔“

”بھگوان جو کرتا ہے وہ اچھا ہی کرتا ہے۔۔۔۔۔ اس نے بڑے دیا کی جو میں غلاعت کے دلدل میں گرنے سے بچ گئی۔“

”سنو سرد جا۔۔۔۔۔!“ اس نے بڑے جذبہ بانی لہجہ میں کہا۔ ”پران پاؤں کو بھول کر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی محبت کی تجدید کرتے رہیں۔۔۔۔۔ میں آج تک تمہاری محبت نہیں بھولا ہوں نہ کسی بھول سکا ہوں۔ شو بھانے



مجھے بڑے سبز باغ دکھائے کہ میں اس کے قریب کے جال میں پھنس گیا۔ سارا تصور میرا اپنا ہے۔ مجھے کتنا دکھ، افسوس اور شرمندگی ہے میں بتا نہیں سکتا۔ میری جان..... میری سرود جا.....! میری محبت میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے چروں میں گر جاؤں۔“

”سنو بچن.....!“ میں نے سپاٹ لہجے میں غیر جذباتی انداز سے کہا۔ ”میری وہ بچی محبت جس پر میں نے اپنا تن من سب کچھ بچھا کر دیا یہ جانتے ہوئے بھی تم ایک بھونرا ہو..... مجھے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا..... زعم اور گھمنڈ تھا..... غرور اور مان تھا کہ میری محبت میں ڈوب کر کسی اور پر ٹوٹ نہیں پڑو گے۔ یہ میری بھول تھی..... تم نے شو بھا سے شادی کر لی جس کا مجھے بڑا صدمہ اور دکھ ہوا..... حالاں کہ ساجن کا رشتہ آیا تو میں نے ٹھکرادیا۔ جب میں نے تمہاری شو بھا سے شادی کی خبر سنی تو میں نے اتفاقاً ساجن سے شادی کر لی..... ساجن نے مجھے جو محبت کی دولت دی تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے..... اب میں نہ صرف ساجن کی بچی بلکہ محبوبہ بھی ہوں۔ اس کی عزت میں..... لہذا اب تم مجھے اور میری محبت کو بھول جاؤ اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا..... مجھے تمہاری صورت تک دیکھنا گوارا نہیں۔“

”میری جان.....! یہ فلمی مکالمے رہتے دو.....“ وہ بڑی بے غیرتی سے بولا۔ ”تم کہتے دنوں تک میرے سنگ رہی ہو..... ایک بچی کی طرح..... کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ میں تمہاری سدا کے لئے بچی بن چکی ہوں۔“

”اب تم پرانے دنوں اور باتوں کو بھول جاؤ..... اب ماضی حال نہیں بن سکتا۔“ میں نے زہر خند کہا۔

”تم چاہو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا.....؟“ وہ ہنس کر بولا۔ ”تمہارا پتی بے حد مصروف ترین آدمی ہے۔ لہذا اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کچھ مشکل نہیں ہے اور پھر وہ ان دنوں شہر میں نہیں ہے۔ وہ سات دنوں کے لئے ملک سے باہر ہے۔ ہم اس غیر حاضری میں محبت کی

تجدید کر سکتے ہیں۔“

یہ تمہیں کس نے بتایا کہ میرے پتی سات دنوں کے لئے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں..... اس لئے کہ یہ ان کا خفیہ کاروبار ہے۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”دفتر والوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا وہ میرے دنوں کے دورے پر ہیں۔“

اس نے میری اس بات کا جواب نہیں دیا۔ بچن کہنے لگا۔ ”میں چار دنوں سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ خوار ہو رہا ہوں۔ میرے جوتے ٹھس گئے ہیں۔ آج اتفاق سے تم مل گئیں تو لگا کہ مجھے میرا اپنا مل گیا ہے۔ تم اتنی بے رحم، ظالم اور سنگ دل نہ ہو۔ کیا سنہرا موقع ملا ہے ملن کا..... وہ فلیٹ جو میرے دوست کا ہے اب بھی میرے پاس ہے جہاں ہم نے یادگار اور ناقابل فراموش گھڑیاں گزاریں..... کیا سنہرا موقع ملا ہے ملن کا.....“

”بچن.....“ میں بچھکاری۔ ”بہتر ہے تم میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ..... ایسا نہ ہو کہ میرا ہاتھ اٹھ جائے اور تم متاثر شاہن جاؤ۔ تم میرے سینڈل دیکھ رہے ہو کہتے مضبوط ہیں۔“

”دیری گڈ سوئیٹ ہارٹ.....“ وہ ہنسا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں کبھی جی گولیاں نہیں کھیلیں..... میری زندگی اور اس غلیظ میں جتنی بھی لڑکیاں اور عورتیں آئیں وہ آج بھی پہنچی ہوئی ہیں..... جن کی بدولت میں ایک حسین اور رنگین زندگی گزار رہا ہوں..... وہ پنجرہ ایسا مضبوط ہے کہ تو نہیں کھینچ سکتیں..... میری کئی فلمیں فلاب ہو گئیں لیکن میں نے جو فلم بنائی وہ کبھی فلاب نہ ہوئی اور نہ ہوگی..... نہ ہو سکتی ہے..... روز اول کی طرح باکس آفس پر ہٹ جا رہی ہے..... یا یوں سمجھ لو کہ مجھے ایک طرح سے پیش مل رہی ہے..... وہ بچے ان سب میں ہر لحاظ سے تم ٹکڑا شکار ہو..... مولیٰ مرغی..... سونے کا انڈا دینے والی.....“ وہ پھر کہنے پر تیار نہ تھا۔ ”میں نے جب سے ایک لفظ نکال کر میری طرف بڑھایا..... خیر اب تم ایسا کرو کہ یہ لفافہ لے جا کر گھر

میں آرام سے دیکھنا..... اس میں تمہارے وہ جذباتی اور رومانی تین خط جو تم نے میرے نام پر لکھے تھے ان کے فوٹو اسٹٹ ہیں..... ملن کی راتوں میں ہونے والی گفتگو جنہیں تم نے سہاگ رات کا نام دیا..... اس کا ٹیپ..... اور پھر جشن کی عکس بندی..... اس کی ڈیر بھی ہے..... میں نے تمہارے لئے کوئی مقرر کیا ہے..... ہر سات دن میں دو دن..... اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ماہانہ پانچ لاکھ روپے کا نذرانہ پیش کرو گی..... اگر تم نے ادائیگی میں تاخیر کی تو جرمانہ پھرنا پڑے گا.....“

میرے جی میں آیا کہ پیر سے جوتی نکال کر اس کے چرے کا جغرافیہ گاڑ دوں..... پھر خیال آیا کہ بات کا جتنی بڑھ جائے گا..... ایک اسکینڈل بن جائے گا..... اس لئے کہ میں نہ صرف ایک حسین و جمیل عورت ہوں بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت کی بچی ہوں۔ رسوائی اور بدنامی ہوگی..... میں نے برا ضبط و تحمل کیا۔ پھر اس سے پوچھا۔

”کیا یہ ساری غلاطی تمہارے پاس ہے.....؟“

”نہیں.....“ اس نے سر ہلایا۔ ”میرے پاس صرف ٹیپ اور ڈیوٹیو فلم ہے۔ تمہارے تینوں خط و نوڈ شرا کے پاس ہیں۔“

”کیا میں وہ خط خریدنا چاہوں تو تم اس کے لئے تیار ہو.....؟“

”ان میں سے کوئی ایک چیز بھی قابل فروخت نہیں ہے؟“ وہ استہزاء سے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں خط کے لئے نوڈ شرا سے رابطہ کرنا ہوگا..... وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا ہے.....“

میں ہری طرح ان دونوں شیطانوں کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ میرا سر گھوم گیا۔ مجھے ان دونوں کو خوش کرنا ہوگا..... او بھگوان..... میں نے سر ہٹا لیا۔

مجھے خاموش اور بے بس پا کر مسکرایا۔ پھر اس کیلئے نے بڑی بے غیرتی سے کہا۔

”آج کیم تاریخ ہے۔ میں تمہیں سات دنوں کی مہلت دے رہا ہوں۔ تم سات تاریخ کی شام نوڈ شرا کے فلیٹ پر آؤ گی اور ساتھ میں پانچ لاکھ کی رقم بھی لیتی آؤ گی..... پھر صبح جاؤ گی..... پھر دوسرے دن آٹھ تاریخ ہے..... دوپہر کے وقت نوڈ شرا تمہارے اور ایک لاکھ روپے کے انتظار میں ہوگا۔ تم وہاں سے سات بجے شام کنگو اور اس کی ہر بات مانو گی..... تم نوڈ شرا سے واقف ہو..... اس سے دو ایک مرتبہ مل بھی چکی ہو.....“

اتنا کہہ کر اٹھا اور مجھے ایک لفظ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا۔ جاتے جاتے بولا۔

”دو برسوں کے بعد نہ صرف سینا پورا ہو گیا اور دل کے ارمان سارے ٹکلیں گے۔“

اگر میں ساجن کی بچی نہ ہوتی تو میں اپنے دل کے سارے ارمان پورے کر لیتی..... ایک خون خوار بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑتی نہ صرف اس کا چہرہ نوچ لیتی بلکہ آنکھیں بھی پھوڑ کر اسے جینائی سے محروم کر دیتی۔

میں گھرائی۔ بیدارم کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹنی لگا دی۔ میں نے ملازمہ سے کہہ دیا کہ چوکیدار سے کہو کہ گاڑی گیراج میں بند کر دے۔ کوئی بھی آئے تو اس سے کہہ دو کہ بیگم صاحبہ پونا گئی ہوئی ہیں۔ دو دن بعد آئیں گی۔ کوئی بھی ٹیلی فون آئے تو اس سے یہی کہہ دیتا..... میں نے اپنا فون بند کر دیا اور موبائل بھی..... میں نے ملازمہ سے کہہ دیا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

میں نے لفافے میں سے تمام چیزیں نکالیں۔ سب سے پہلے میں نے تین خط پڑھے تو سر پیٹ لیا..... ہائے رام..... یہ خط میں نے لکھے ہیں..... میں نے اپنا سر پیٹ لیا..... کیا ایک شریف لڑکی ایسے بے ہودہ، فحش اور نفو خط بھی لکھ سکتی ہے.....؟ کوئی یقین نہیں کرے گا..... یہ مجھے کیا ہو گیا تھا.....؟ میں نے اپنے آپ کو جھٹلانا چاہا..... نہیں..... نہیں..... ہرگز نہیں..... یہ خط میں نے نہیں لکھے.....؟ یہ کسی اور کی کارستانی ہے.....







”ایک منٹ.....“ دونو شرابو لاء۔ ”شکنتلا میں تمہاری تصویریں لاکروے رہا ہوں..... تم دونوں ساتھ چلی جانا..... جانے کیوں مجھے تم دونوں پر رحم آ رہا ہے..... میں اب اپنے سارے باپ دھو دینا چاہتا ہوں۔“

اتنا کہ کرو دو شرابا کمرے سے تیزی سے نکلا اور سامنے والے بیڈروم میں گیا۔ بیڈروم کا دروازہ بند کرنا بھول گیا یا جگت کے باعث اسے خیال ہی نہیں رہا..... دیوار پر ایک عورت کی پورٹریٹ آویزاں تھی۔ اسے اتارنا تو دیوار میں ایک تجوری نصب تھی۔ پھر اس نے تجوری کھول کر ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خنجر چمک رہا تھا۔ پھر وہ لپک کر آ۔ وہ بیڈر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک خنجر دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے۔

”شکنتلا.....! تم اس واش روم میں جاؤ..... اس وقت تک بند رہو گی جب تک اس سے سارے ارمان پورے نہ کر لوں۔ یہ مجھے خوش کئے اور مہربان ہوئے بنا جا رہی تھی..... چلو..... واش روم میں چلو..... میں تم سے بعد میں منٹوں گا..... ہاں شور مچانے کی حماقت نہ کرنا.....“

دونو شرابا کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر شکنتلا کا بدن لرزنے لگا۔ وہ غش کھا کر فرش پر گر گئی۔ دونو شرابا کو شکنتلا پر زہرہ برابر بھی رحم نہیں آیا۔ واش روم دہلیز کے قریب دائیں ہاتھ پر تھا۔ اس نے ٹوکڑ کھگایا تو دروازہ کھل گیا۔ پھر اس نے سرو جاسے کہا کہ وہ چند قدم پیچھے ہٹ جائے۔ جب وہ پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ چوں کھٹوڑا سا کھلا ہوا تھا اور لات مار کر پورا کھول دیا۔ پھر اس کی چوٹی پکڑ کر واش روم میں گھسٹ کر فرش پر ڈال دیا۔ پھر دروازہ بند کر کے باہر سے چٹنی لگا دی۔

اگر دو شرابا کے ہاتھ میں خوف ناک قسم کا خنجر نہ ہوتا تو وہ اسے دکھاوے کر یا ٹیبل سیس پر مار کر نکل جاتی اور نیچے جا کر دربان کو بتا دیتی۔ خنجر کی دھار ایسی تیز تھی کہ اس کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ ایک فٹ سے زیادہ

لمبا تھا۔ اس نے خود کو قابو میں برسکون رکھا۔ پھر اس پرس میں سے ایک پڑیا نکال کر منٹھی میں دبائی۔ اس کی حرکت دونو شرابا کی نظروں سے پوشیدہ رہی۔ پھر اس نے سرو جاسے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”میری آرزو پوری ہے کہنا جا رہی ہو..... اب تم شرافت سے بیڈروم میں چلو..... پرس اور لباس نکال کر ایک طرف ڈال دو..... ایک بات سن لو..... تم جتنی محبت، خود پسندی اور فیاضی سے پیش آؤ گی تو میں بھی ایسا ہی پیش آؤں گا۔ میں غلطوں کے جھمن جانے کا کام مٹانا چاہتا ہوں..... لیکن وہ کیسے مٹ سکتا ہے۔ میں نے جن کو پاؤں لاکھ کی رقم دی ہے۔ میں تمہاری تصویریں اتاروں گا۔ تم قرض نہیں کرو گی اس لئے کہ وہ غلطوں کا نعم البدل ہوگی..... غلطوں کے جانے کا اب مال نہیں ہوگا..... چلو..... اگر تم نے تعاون نہ کیا تو تمہارے جسم پر خنجر کی نوک سے خراشیں ڈال دوں گا۔“

اس نے بائیں ہاتھ میں خنجر تمام لیا اور دایاں ہاتھ سرو جاسے کی کمر میں ڈال کر اسے قریب کر لیا تو خنجر زون میں سرد جانے وہ پڑیا جس میں سفید سنوف تھا اس کی دونوں آنکھوں میں جھونک کر اس کا سر اسے زور سے دہلیز کو چوٹ سے ٹکرایا کہ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے گالیاں دینے لگا اور دھمکیاں بھی..... پہلے تو سرو جانے خنجر اٹھایا۔ پھر لپک کر میز پر رکھا ہوا ٹیبل کا لیپ اٹھایا اور دونو شرابا کے سر پر ایک زور دار ضرب لگائی..... وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکا اور لڑکھڑایا۔ فرش پر گر کر رہے ہوش ہو گیا۔ اس کے سر میں گومز نکل آیا۔ سرو جانے جا کر دیکھا۔ اسے خوب ہلایا۔ چوں کہ لیپ کی ضرب زبردست تھی وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ دو ایک گھنٹے سے پہلے اس کا ہوش میں آنا مشکل تھا۔

سرو جانے سب سے پہلے باہر کا دروازہ بند کیا دونو شرابا کو کوئی درست جنم بھی آسکتا تھا۔ پھر اس نے خنجر کو گچن میں لاکر ایک کینٹن میں چھپا دیا۔ پھر وہ اس

واش روم میں آئی جس میں شکنتلا کو دونو شرابا نے بند کیا ہوا تھا۔ وہ غشی کی حالت میں کراہ رہی تھی۔ پھر وہ شکنتلا کو کسی نہ کسی طرح سہارا دے کر بیڈروم میں لائی۔ پھر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں آئی۔ پھر اسے پانی پلایا تو اس کے حواس بحال ہوئے۔ لیکن وہ خوف زدہ تھی۔

سرو جانے اسے بتایا کہ دونو شرابا بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ اس نے وہ خنجر گچن میں چھپا دیا ہے۔ وہ دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتا..... اور پھر اس نے یوسف اس شیطان کی آنکھوں میں ڈالا ہے وہ پندرہ سے بیس دن تک دیکھ نہیں سکتا..... یہ سنوف ٹائیگر نے دبا تھا کہ اگر دونو شرابا اس پر قابو پا کر بے بس کر دے تو تب وہ اس کی آنکھوں میں جھونک دے۔ وہ اندھے کی طرح ہو جائے گا۔

شکنتلا نے یہ سنا تو اس کی جان میں جان آئی۔ ان دونوں نے مل کر دہری اور ٹیپ تلاش کیا۔ اس کی مشکیں کس کمرے پر ٹیپ چپکا دیا۔

ایک دم سے سرو جاسے کی نظر بیڈروم کی تجوری پر پڑی جو کھلی ہوئی تھی جس میں سے دونو شرابا نے خنجر نکالا تھا۔ سرو جاسے کی گوتی شکنتلا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس میں جتنی چیزیں تھیں وہ نکال کر بستر پر رکھ دی گئیں۔ دس بارہ عدد ولفا نے تھے جن میں تصویریں اور ان کے نام پتے اور موبائل نمبر تھے۔ ایک فہرست میں لڑکیوں اور عورتوں کے ناموں کے آگے ان سے ہر ماہ وفات کی وصولی لکھی ہوئی تھی۔ ہر ماہ وہ ڈیڑھ لاکھ بلک بلیک سے وصول کر رہا تھا۔ اور سات لاکھ نیا لیس ہزار کی رقم بھی تھی۔ ویڈیو فلمیں بھی.....

سب سے پہلے سرو جانے شکنتلا کو ایک لاکھ کی رقم دی۔ پھر اس کی تصویر نذر آتش کر دیں۔ دونو شرابا کو جلد ہی ہوش آ گیا تو سرو جانے اس کے منہ سے ٹیپ نکال دیا۔ پھر وہ پانی لہجے میں چیخ کر بولا۔

”یہ مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے..... میرا کردار کے مارے پھٹا جا رہا ہے..... سرو جاسے.....“

شکنتلا..... تم دونوں نے میرے ساتھ جو حرکت کی ہے میں بخشوں گا نہیں..... جن تم سے بدلہ لے گا۔“

”تمہیں بیس دن تک کچھ دکھائی نہیں دے گا..... تم اندھوں کی حالت میں رہو گے..... دوسری بات یہ ہے کہ تمہاری تجوری میں جو غلاطت تھی وہ میں نے نکال لی ہے..... سات لاکھ سے زیادہ جو رقم تھی وہ بھی..... اس کے علاوہ زیورات بھی ہیں جو تم نے معصوم لڑکیوں کو بلیک میل کر کے حاصل کئے تھے..... تمہاری ٹکار لڑکیوں کو فون کر دیا ہے کہ وہ تصویریں اور زیورات لے جائیں..... وہ سب کچھ دیر میں پہنچ رہی ہیں..... وہ تمہارا کیا حشر نشر کرے گی یہ بھگوان جانے.....“

”سرو جاسے! کینٹن..... پڑیل..... حرام زادی.....“ وہ غش گالیاں بکنا ہوا بولا۔ ”ایک لفافہ اور ایک پانی بھی تم نے کسی کو دی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ بخشوں گا نہیں..... تمہارے پتی کو سب کچھ بتا دوں گا..... شکنتلا کی بھی جان لے لوں گا.....“

نفرت اور غصے سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کی بکواس سن کر سرو جاسے بولا۔

”تمہارا خنجر اب میرے قبضے میں ہے..... تم تعاون نہ کرنے کی صورت میں میرے بدن پر اس کی نوک سے خراشیں ڈالنے والے تھے..... اب بتاؤ.....؟ میں کیا کروں..... کیا تم نے سائنیں کہ خون کا بدلہ خون ہوتا ہے..... کیوں نہ تمہارے جسم پر خراشیں ڈال دی جائیں..... میں بہترین ڈیزائنرز ہوں..... تمہیں کون سا ڈیزائن پسند ہے؟“

دونو شرابا دہشت زدہ ہو کر جھپٹیں مارنے لگا کہ اڑوس بڑوس کے لوگ سن کر اس کی مدد کو آجائیں۔ شکنتلا نے فوراً ہی اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ وہ خنجر کر بے بس ہو گیا۔ اس نے بہت خوشی کی۔ لیکن نا کام رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تمام لڑکیاں اور عورتیں یہ خوش خبری سنتے ہی ایک ایک کر کے آگئیں۔ وہ سرو جاسے کے بے پناہ ممنون تھیں۔ ان میں سے ہر ایک لڑکی اور عورت نے خوب اس کی خاطر عداوت کی..... لالوں گھونٹوں



اور جوتوں سے دل کی حسرت نکالی۔ منہ پر تھوکا بھی.....  
ان میں ایک بھی ایسی نہ تھی جس نے جی بھر کے اس کی  
سیوانہ کی ہو..... وہ حرام زادہ جوں کہ بہت ڈھیٹ تھا۔  
تو اتنا جسم کا تھا۔ مرائیں۔ لیکن بے ہوش ہو گیا۔ سب  
ایک ایک کر کے ٹپکس تو سنا سنا سنا چھا گیا۔  
اتفاق سے دوسرے دن صبح جین کسی کام سے آیا۔  
اس وقت دودو دھرا مائی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ان  
لڑکیوں نے اس کے شان دار فلیٹ کی جیسے اینٹ سے  
اینٹ بنادی..... ایک ایک کمرے، کچن اور ڈرائنگ روم  
کا جغرافیہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ کسی چیز کو سلامت نہ پایا۔ وہ بڑا  
حیران بھونچکاں سا ہو گیا۔ اسے یقین نہ آیا۔

بخشوں کا نہیں..... میں نے اس سے پانچ لاکھ کا خطابہ  
کیا تھا اب رقم پندرہ لاکھ کا ہو گا.....  
”تم براہ راست ساجن سے بات کیوں نہیں  
کرتے.....؟“ دودو دھرا بولا۔ ”وہ ہر ماہ میں لاکھ بھی  
دے سکتا ہے۔“  
”لیکن اس میں ایک بات کا نقصان اور اندر  
ہے۔“ جین نے کہا۔ ”وہ فوراً ہی سرود جا کو طلاق دے  
دے گا۔ وہ میں لاکھ کا کیا نہیں روپے بھی نہیں ملیں  
گے..... لہذا سرود جا کو بلیک میل کرنے میں ہی فائدہ  
رہے گا۔“

☆.....☆.....☆

جین نے سرود جا سے رابطہ کیا تو وہ بہت برہم تھا۔  
اس نے سرود جا سے کہا کہ میں میں لاکھ سے تیس روپے کم  
نہیں لوں گا..... کیوں کہ تم..... لڑکیوں عورتوں نے کل  
کر دودو دھرا کے فلیٹ کا ستیاناس کر دیا۔ اس کا نقصان  
پورا کرنا ہو گا۔

سرود جا نے اس سے کہا کہ تم جس شپ اور فلم کے  
اور تصویروں کے عوض میں لاکھ وصول کرنا چاہتے ہو میں  
اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں..... کیوں کہ یہ ساری  
غلاقت دو تین برس پہلے کی ہے۔ تم نے یہ سب کچھ  
جعل سازی کی ہے۔ لاکھوں ہتھیار لینا چاہتے ہو۔ یہ  
اصلی ہوئے تو میں تمہیں میں لاکھ کیا چھپیں لاکھ دینے کو  
تیار ہوں اور رات تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم پونا کی  
کوٹھی پر آ جانا..... ایک مہمان کی حیثیت سے۔ وہاں ہم  
دونوں سکون اور اطمینان سے وقت گزاری کریں گے۔

دوسرے دن جین شام کے وقت سرود جا کی کوٹھی  
پر ساری غلاقت لے کر پہنچا۔ اس نے پہلے میں لاکھ  
روپے وصول کئے..... پھر اس نے ساری غلاقت سرود جا  
کو چیک کر کے تسلی کرا دی..... پھر وہ بریف کیس لے  
کر یہ کہہ کر نکلا کہ وہ رقم اپنے دوست کے ہاں رکھ کر ایک  
گھنٹے بعد آئے گا۔ اس نے بریف کیس گاڑی کی ڈی  
میں رکھا۔ جب وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھولنے والا تھا  
تب اندر سے لازم نے آکر کہا کہ اس کے دوست دودو

نہا کا فون مبین سے آیا ہے..... اس کی طبیعت خراب  
ہے..... جن فون پر بات کرنے اندر آیا۔ دوسری طرف  
دودو دھرا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس کی آواز  
تک سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ یہ مشکل اتنا کہہ پایا کہ  
پہری طبیعت ٹھیک نہیں..... جین نے کہا کہ میں ابھی نکل  
پاؤں۔ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔ تم ایسا کرو اور جا کو  
لے کر جے جے اسپتال چلے جاؤ۔

گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے اس نے سرود جا سے  
کہا۔ ”ڈرائنگ میں مبین جا کر دودو دھرا کو اسپتال میں  
لے کر رات نو بجے تک واپس آ جاؤں گا۔ تم میرا  
انتظار کرنا.....“

تھوڑی دیر بعد جین کی گاڑی سڑک پر تیزی سے  
روڑ رہی تھی۔ سرود جا اندر ہی بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔  
ٹانگیر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا تو اسے خبر نہ ہوئی۔  
اس کی آنکھوں سے دھشت جھانک رہی تھی۔  
”سرود جا! کیا سوچ رہی ہو.....؟“ ٹانگیر  
نے کہا۔

سرود جا ایک دم سے چونک کر خیالوں کی دنیا سے  
باہر آئی۔ ”تم.....؟ کہاں تھے.....؟ وہ کمینہ.....  
..... نہ صرف میں لاکھ روپے لے گیا بلکہ یہ بھی کہہ  
گیا میں بنی سنوری اس کے انتظار میں راہ ہتھی  
رہوں..... وہ اس حرام زادے دودو دھرا کی عیادت  
کرنے کے بعد رات نو بجے واپس آ رہا ہے..... وہ  
نٹوٹیل بھرنے لہجے میں بولی۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ٹانگیر  
نے بے پردائی سے کہا۔

”کیا پریشانی کی کوئی بات نہیں.....؟“ سرود جا  
نے تنک کر کہا۔ ”اس کی ہر بات ماننا پڑے گی۔“

”تم صاف انکار کرو.....؟“ ٹانگیر نے کہا۔  
”تم اس کی غلام نہیں ہو..... تو کوئی یا باندی نہیں ہو۔“

”اس کی پیچھی تو ہوں.....؟“ سرود جا کہنے لگی۔  
”میری ڈر اس کے ہاتھ میں ہے۔ کھ چکی ہوں۔  
ماری چیزیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ میں کیا

کروں.....؟ کہاں جاؤں.....؟ تم نے مجھے بڑا ولا سا  
دیا۔ لیکن تم اس کہنے سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔“  
”تم نے کیا کیسٹ فلم اور تصویریں چیک  
کیں.....؟“ ٹانگیر نے پوچھا۔ ”جعل سازی تو نہیں  
تھی؟“

”نہیں.....؟“ سرود جا بولی۔ ”اس نے مجھے یہ  
ساری چیزیں چیک کرنے کو دیں تو میری کٹنی پر ریو اور  
رکھ کر کھڑا رہا۔ اب ورنہ..... گلدہ..... خون آشام  
بھیڑ یا مجھے درنگ کی نشانہ بناتا رہے گا۔“

ٹانگیر اٹھا اور اس نے بریف کیس لاکر اس کے  
سامنے رکھ دیا اور کھول دیا۔

”یہ وہ لفافہ ہے جس میں تمہاری وی ہوئی تھی  
لاکھ کی رقم اور وہ تمام غلاقت سے بھری چیزیں.....  
جنہیں تم نے چیک کیا..... اور یہ ریو اور جو اس نے  
تمہاری کٹنی پر رکھا تھا.....“ ٹانگیر مسکرایا۔ ”تم اس کے  
لے پریشان ہو رہی تھیں.....؟“

”کیا.....؟“ سرود جا حیرت اور خوشی سے اچھل  
پڑی۔ ”اسے ساعت اور آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ  
بریف کیس تمہارے ہاتھ لگ گیا۔ وہ تو اپنے ساتھ باہر  
لے گیا تھا..... تم کہاں تھے.....؟ کب آئے تھے؟“

”میں دوسرے کمرے میں موجود تھا..... میں  
نے ملازم کو منع کر دیا تھا کہ میری آمد اور کمرے میں  
موجود ہونے کے بارے میں تمہیں نہ بتائے..... میں  
نے تم دونوں کی ساری گفتگو سنی..... جب اس نے  
بریف کیس گاڑی کی ڈی میں رکھا تب میں نے ملازم کو  
دوڑایا۔ میرا ایک صدا کار دوست جو بالائی منزل کے  
کمرے میں موجود ہے اس نے کمرے سے نشست گاہ  
کے کمرے میں فون کیا۔ اس دوران میں گاڑی کے  
پاس گیا۔ پھر میں نے ایک ماسٹر کی سے ڈی کھولی اور  
سروٹ کو اس میں چلا گیا تھا۔“

”اوہ دیو کیا.....!“ سرود جا نے بے اختیار ہو کر  
اس کا رخسار چوم لیا۔ ”اوہ..... میں تمہارا کیسے شکر یہ ادا  
کروں.....“

”سنو۔۔۔ آگے نہ بڑھو۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا بچہ پھسل جائے اور میں بدیانت بن جاؤں۔“ ٹائیگر نے اسے لٹکا۔

”بتاؤ۔۔۔ تمہارے اس عظیم کارنامے پر تمہاری کیا سیوا کروں۔۔۔“ وہ سرشاری سے بولی۔

”میں یہ رقم اور ساری غلامت لئے جا رہا ہوں۔“ ٹائیگر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”وہ کس لئے۔۔۔؟“

”اس لئے کہ تمہیں بلیک میل کر سکوں؟“

”تم نے جو ایک بڑے عذاب، ذلت و رسوائی اور بدنامی سے نجات دی ہے اس کے عوض میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“

”الحق عورت۔۔۔! رقم تو میری نہیں ہوئی۔۔۔ باقی چیزیں اس لئے میرے پاس حفاظت اور امانت کے طور پر ہیں گی تم اپنے شوہر سے بدیانتی کرو اور فلم کے خواب دیکھنے لگو۔۔۔ اگر تم بھبک گئیں میں یہ ساری چیزیں ساجن کو لے جا کر دے دوں گا۔۔۔ ان لئے بلیک میل کے لئے یہ تپ کاڑ میرے پاس ہوگا۔“

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

اس روز کے بعد سے اس نے سرو جاسے رابطہ منقطع کر دیا تھا اور اس سے بھی کہا تھا کہ وہ اسے بھول جائے۔۔۔ ساجن آ گیا تھا۔ اب وہ اپنے بچے کو زیادہ وقت دینے لگی تھی۔ وہ اس لئے بھی سرو جاسے کوئی تعلق اور رابطہ رکھنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں بچہ نہ پھسل جائے۔ اس نے گھر لاکر وہ غلامت دیکھی تو وہ ڈانوا ڈال ہونے لگا۔ اس کی نیت میں فتو پیدا ہونے لگا۔ وہ مٹی کا تودہ نہیں تھا۔ زاہد بھی ہو بھبک جائے اور غلامت کے دلدل میں گر جائے۔۔۔ سرو جا کو چوں کہ بڑی اذیت، ذلالت اور رسوائی کے عذاب سے نجات ملی تھی اس لئے وہ اس کی ہر خواہش اور حسرت پوری کرنے کے لئے تیار تھی۔ مگر وہ آدمی تھا۔ اس کے اندر جو آدمی زندہ تھا اسے ہر برائی سے باز رکھتا تھا۔ بالفرض خیال وہ سرو جا کو بستر کی ذینت بنا کر اور اس کا تن میا کر دیتا تو پھر

اس کی عزت کیا رہتی۔۔۔ جس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اس نے یہ رقم سرو جا کو سبق دینے کے لئے بلیک فیس وصول کی تھی جب کہ بچن اسے کئی بار آلودہ کر رہا تھا۔ اسے بھی بہتی لنگھا میں ہاتھ دھوئے گا اور چکا رہا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ بچن پر بڑی زبردست چوٹ پڑی تھی۔ کیوں کہ اس کے بریف کیس بھی اتفاق سے وہ تمام لفافے اور قوتات جیس جن میں ان لڑکیوں اور اداکاراؤں اور عورتوں کی شخصیتیں وہ بلیک میل کر رہا تھا۔۔۔ ان میں شو بھا کی تصاویر بھی تھیں جو اس نے دھوکا دے کر دو برسوں کی ازدواجی زندگی میں مستقبل میں اسے بلیک میل کرنے کے خیال سے بچ کر رکھی ہوئی تھیں۔ بلیک میل لاکھ تھی۔۔۔ ٹائیگر نے بڑا اونچا ہاتھ مارا تھا۔ یہ رقم اس کے لئے بولی تھی۔

قدرت ہر برائی کا بدلہ دیتی ہے۔ جب بچن کی پہچان تو اسے پتا چلا کہ وہ دشر مانے اسے کوئی ٹکڑی نہیں کیا اور نہ ہی اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ اسے غصہ آیا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنے فلیٹ آ کر سوچا کہ وہ بریف کیس کی چیزیں اور رقم لاکر زمیں رکھ کر واپس پونا جائے جہاں سرو جا اس کے انتظار میں لیکن نئی بیٹی ہوگی۔ دو برس کی جدائی نے اسے بڑا رکھا تھا۔ اس کی زندگی میں جتنی لڑکیاں عورتیں آئی تھیں ان میں ایک بھی ایسی نہیں تھی جس نے سرو جا کا غلا پورا کیا ہو۔۔۔ جب اس نے بلیک کے سامنے گاڑی روک کر ڈکی کھولی تو اس کے پیروں تلے سے زمین ٹھنکی۔ اس کا سر جھک ایا تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بریف کیس نہیں تھا۔۔۔ وہ سمجھ گیا کہ جب وہ گاڑی میں بریف کیس رکھ کر گاڑی اشارت کرنے والا تھا تب ملازم نے اسے بتایا تھا کہ ممی کے اس کی کال آئی ہے۔ شاید سرو جا نے پلاننگ کر کے بریف کیس غائب کر دیا۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ بریف کیس میں کئی ساٹھ لاکھ کی رقم تھی۔ چالیس لاکھ جو اس نے آج وصول کئے تھے اور میں لاکھ سرو جا کے۔۔۔ اس کے علاوہ وہ تمام چیزیں جن سے وہ بلیک میل کر کے کما رہا تھا۔۔۔ اس نے

راجہ اور اس لئے رکھا تھا کہ راستے میں رہزنی کے واقعات عام تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر سرو جا نے رقم واپس نہیں کی تو وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ وہ غصے سے ہمارا ہوا جا رہا تھا۔ اندھا دھند تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی کاربندی کے سبب سے ٹکرانی۔ وہ مرا نہیں۔ کیوں کہ قدرت کو کفر کر دار تک پہنچانا تھا۔ وہ معذور ہو گیا تھا۔ پھر اسے سرکاری اسپتال کے جرنل وارڈ میں علاج کے لئے داخل کر دیا گیا۔ جیسا کہ اسے تین ماہ بعد پتا چلا کہ وہ پلٹے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔ اپنے قلب کے نیچے دھنک چیر پر بیٹھا بھبک مانتا ہے۔

اس نے ان لڑکیوں عورتوں کو جو بلیک میل ہو رہی تھیں فون کر کے بلایا۔ وہ اپنی گندگی واپس لینے کے لئے اس کی ہر خواہش اور ہر بات پوری کرنے کو تیار تھیں۔ انہوں نے اس بات کا سچے دل سے اعتراف کیا انہیں قدرت نے ان کے کئے کی سزا دی ہے۔ اس میں ان کا ہٹاؤ دس ہے۔ اس نے ان کی تمام غلامت بغیر کسی رقم کے اس شرط پر دے دی کہ اب وہ انگریز، موبائل فون اور خواتین کے پیچھے اندھا دھند نہیں بھاگیں گی۔ اسے اس سبکی سے ایک سرشاری اور روح کو طمانیت بھی ملی تھی۔ اگر وہ ان حسین نوجوان لڑکیوں اور عورتوں سے مرفراز ہوتا تو اسے ایسا کیف و سرور نصیب نہ ہوتا۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

ٹائیگر ریڈ روز بار میں آیا تھا جس کی نہ صرف شراب بلکہ دیگر جوس اور دیگر مشروبات بہت مشہور تھے۔ وہ کبھی بکھارا جاتا تھا۔ ٹائیگر کے سنتروں کا جوس جس نے نہ صرف اس شہر میں بلکہ ناگ پور میں دھوم مچائی ہوئی تھی۔ اس بار کا مالک نہ صرف اس بار کا مالک تھا بلکہ اس کا ناگ پور میں سنتروں کا باغ تھا اس کے باغ کے جیسے سنترے کسی اور کے باغ میں لگتے نہیں تھے۔ وہ سنترے نہ صرف ایکس پورٹ بلکہ اپنے بار میں ان کا جوس بنا رہا تھا۔ ایک بات ذرا دعا بھی تھی کہ وہ قاف کی پریاں اس کے باغ میں چاندنی راتوں کو سنترے کھانے آتی تھیں۔

ٹائیگر نے اس عورت کو بار کے اونچے اسٹول پر ایک ادا کے ساتھ بیٹھ دیکھا۔ وہ بڑی زنا کرت سے مارینی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ ہندوستان میں شراب نوشی عام تھی بلکہ روز بروز ہوتی جا رہی تھی۔ نہ صرف جواں سال عورتوں میں نوجوان لڑکیوں میں جو طالبات میں تھیں اور ملازمت کرتی تھیں۔ ایک طرح سے یہ فیشن بن گیا تھا۔ دوسری طرف اتنے گھریلو اور سماجی مسائل تھے کہ ان کے نزدیک سے نوشی سے ان کی پریشانیاں، تنگیاں اور غم مٹ جاتے تھے۔ دل دو ماخ کو ایک سکون سے ملتا تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا یہ سب کچھ آدمی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ جب آدمی مذہب سے دور اور خوابوں کے پیچھے بھاگتا تو اس کی یہ سزا ملتی تھی۔ مسائل کا حل شراب نوشی نہیں تھا۔

اس نے اس عورت کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا وہ جواں سال تھی اور آنکھوں کے لئے اسے تراوت کہا جاسکتا تھا۔۔۔ اس کا لباس جدید طرز کا تھا اور اس نے اپنے انداز بے پروائی سے لباس میں جا بجا جھروکے بنا رکھے تھے جس میں سے اس کا گورا گورا بدن چھانک رہا تھا جس میں شہد کی آمیزش سی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت کی سڈول ہاتھوں کے خنجر کھلے پڑے تھے۔

اس کے قریب خالی اسٹول پر ایک ادھیز عمر کی کرچن عورت بیٹھی دھنکی پی رہی تھی۔ اپنا پیگ ختم کرنے کے بعد وہ اپنا پرس اور سر اپا سمیٹ کر اٹھی تو وہ اسٹول خالی ہو گیا تو وہ تیزی سے بڑھ گیا کہ کہیں کوئی اور شخص اس پر قابض نہ ہو جائے۔ قریب سے اس کا جائزہ لینے پر ٹائیگر کو اس کے خوب صورت سینے پر بھونرا اچھسی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں اور اس کی خفیف سی مڑی ہوئی سبک ٹانگ کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ وہ باوجود کوشش کے اس بت ٹھانڈا کو پہچان نہ سکا۔ اس لئے کہ اسے نہ جانے کتنی عورتوں لڑکیوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا۔ اس لئے اس نے شناسائی کے احساس کا اظہار نامناسب جان کر وہ خاموش رہا۔ عورتیں لڑکیاں غلط فہمی کا شکار ہو جاتی تھیں اور اس کا غلط مطلب لیتی تھیں۔ یوں بھی یہ بار





جیسے نہیں ہو سکتے اور نہ ہوتے ہیں۔

”یہ تو ہے۔ تبدیلی تو بہر حال ملتی ہے۔ ابھی میں نے یہاں مٹی میں ایک خوش گوار مہینہ گزارا ہے۔“ وہ مسکرائی اور ایک گھونٹ لے کر اپنا جام خالی کر دیا۔ میں نے ویٹر کو بلا کر اپنے لئے جوس اور اس کے لئے ایک پیگ لانے کے لئے کہا۔

”ہر برس میں ایک ماہ کے لئے مٹی ضرور آتی ہوں۔“ وہ گفتگو لہجے میں بولی۔

”میرا خیال ہے۔۔۔ تم کمر فنیسی سے کام لے رہی ہو۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

ویٹر آڈر لے آیا تھا۔ اس نے مارٹنی کا پیگ اس عورت کی طرف بڑھا دیا۔ ”لو یہ جام پیو۔“ سیکرٹ سروس والوں کے نام۔۔۔ پھر اس نے اپنا جوس گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ ”میرا بس چلے تو سارا ون سنٹر وال کا جوس پیتا رہوں۔“

سیکرٹ سروس والوں کا انتساب عورت کے لئے جیسے قابل قبول نہیں تھا۔ اس نے اپنا جام رکھا اور ٹائیگر کے قریب سرک آئی۔ ”تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کس قدر خوف زدہ ہوں۔ ویٹر کا عرف ٹائیگر۔!“ اس کی آواز سرگوشی سے بلند ہرگز نہیں تھی۔ حالانکہ لاؤنج میں کوئی ان سے اتنا قریب نہیں تھا کہ نازل آواز میں کی جانے والی گفتگو کوئی سن سکے۔

اس کی حالت سن کر ٹائیگر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اسے متوقع نظروں سے دیکھتا رہا۔

”میری تعلیمات کے پچھلے دو دن بہت پریشان کن ثابت ہوئے ہیں۔“ رائی نے کہا۔ ”مشکل دینی ہے۔۔۔ پرانی والی۔۔۔“ اس نے گہرا سانس لیا تو سینے میں سانسوں کا متوجح کا سا غما۔

وہ ایک دم سے اس طرح اچھلا جیسے اسے ٹھڑے نے کاٹ لیا۔ پھر اس نے سنبھلے ہوئے رائی کی طرف دیکھا۔

”تمہیں۔۔۔؟“

وہ شدت سے فنیسی میں سر ہلانے لگی۔ ”نہیں۔۔۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں نے فنیسی دہرائی ہے۔ آدی البتہ مختلف ہے۔“

”رائی۔!“ مجھے یہ سن کر نہ صرف ہلکا سا بلکہ مایوس ہوئی۔ ”ٹائیگر نے سرنش کے انداز میں کہا۔ ”اس لئے کہ تم ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہو۔ تمہارے سخت گیر بچے نے ہر طرح کا نہیں سکھ دیا ہوا ہے۔“

”یقین مانو میں اس کی ذات سے ذرا دباؤ بھی خوش نہیں ہوں۔“ اس نے تکرار کے لہجے میں کہا۔ ”میں سونے کے چنبرے میں چٹپٹی کی طرح ہوں۔ یکسانیت نے مجھے بے زار کر دیا ہے۔“

ایسے میں ذرا سی آزادی ملتی ہے تو وہ میرے دماغ پر کسی نئے کی طرح چڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ کوئی افیئر۔۔۔ اور اب میرے عاشق محبوب۔۔۔ دوست میری حماقت کو کیش کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

”تمہاری ذہنی حالت درست نہیں رہی ہوگی۔۔۔ ورنہ تم گفتگوں میں بیٹھنے کے بجائے ان سے دور رہتیں۔“ ٹائیگر نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کوئی اپنے بیڑوں پر کھلاڑی مارے تو کیا کہا جاسکتا ہے؟“

”تم نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ یہ بات کوئی عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔۔۔ کسی نے مجھے اس سے متعارف کرایا تھا۔۔۔ پھر اس کا طرز عمل اور طور طریقے ہمیشہ اچھے اور مہذبانہ رہے۔“

”یہ تو کوئی اچھا ہونے کی دلیل نہ ہوئی؟“

ٹائیگر نے معترضانہ انداز میں ٹوکا۔

”میں نے اپنا گلاس خالی کیا اور ویٹر کو بلایا۔ وہ نے گلاس میں جوس پی رہا تھا اور رائی بھی چھوٹے پھراسے ٹائیگر نے آڈر دیا تو وہ آڈر لے کر پھر ٹائیگر کہنے لگا۔“

”رائی۔!“ مجھے تم پر نہ صرف حیرت ہے بلکہ حیرت ہے کہ میرا خیال ہے کہ تم بہت ہوشیار ہو اور بے کار عورت ہو۔ تم نے مجھے ہمیشہ یہ تاثر دیا کہ تم ہاں کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو کہ شاید ہی کوئی لڑکی جانتی ہو۔۔۔ خاص طور پر لیبرے مردوں کے بارے میں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ تم ذاتی طور پر ذہنی پختگی میں جاگری ہو؟

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ٹائیگر۔! یہی بات اس نے اعتراف کیا اور اس کی آنکھوں میں کی پریچھائیاں پھیل گئیں۔ شادی کے بعد دنیا کی کئی کچھ چیزیں۔۔۔ مردوں سے میرا رابطہ نہیں مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میری ایک شہنشاہی کی سی ہو کر رہ گئی۔“

ٹائیگر نے اس کا سراپا توجہ سے دیکھا۔ ”تم نے قیامت خیزی ذرا بھی کم نہیں کی۔ شادی کے بعد تم ایک ایسا گداز پن آ گیا جس سے لگتا ہے کہ تم نے اپنی دنیا استعمال کی ہوں۔“

”ہر عورت کی طرح میری بھی یہ کمزوری رہی کہ جینس سے حسین ہوتی رہوں۔۔۔“ وہ بولی۔ ”یہ ایک نیا ٹھکانہ ہے میری اس وقت سے ہالی رہی کہ میں نے نوجوانی کی دلہیز پر قدم رکھا۔“

”اور اسے استعمال کرنے میں بھی تمہاری دلچسپی نہیں ہوئی۔۔۔ یہ پھر شروع ہوتے ہی تم نے مجھ سے ایک کون نہیں کیا۔۔۔ میں سر جھل کر کہہ دیتا۔“ ٹائیگر کہتا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ تم سے ملوں۔۔۔ مجھے اس کا علم تھا کہ تم مٹی میں ہی ہو۔ تمہارا آفس تلاش کرنا میں کام نہ تھا۔ پتا کچھ کچھ یاد تھا۔ جانے کیوں یہ بات

مجھے اچھی نہیں لگی۔ تم ایک بار میری مدد کر چکے تھے۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ تمہیں بتاؤں کہ اس مشکل میں پھنس گئی ہوں جس سے تم نے پانچ برس پہلے نکالا تھا۔۔۔ میرا خیال تھا کہ تم دوسری مرتبہ میری مدد کرنے سے انکاری ہو جاؤ گے۔ مگر بعد میں۔۔۔ میں نے سوچا کہ کاش میں نے تم سے رابطہ کر لیا ہوتا۔۔۔ یہ احساس مجھے کل شام ہوا۔۔۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔۔۔ مجھ پر نظر رکھی جا رہی ہے۔۔۔ کڑی نگرانی میں ہوں۔۔۔ اب میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔۔۔ میں تو اب اپنے ہونٹ بھی نہیں جاسکتی کہ جا کر اپنا سامان لے آؤں۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”پچھیا کرنے والوں میں سے ایک مستقل طور پر دیاں موجود ہے۔ ذہن سے پہلے میں نے بہت کوشش کی تھی لیکن میں اپنے کمرے تک نہیں پہنچ سکی۔ میں کچھ پینے کے ارادے سے یہاں آگئی تاکہ بیٹھ کر غور کر سکوں کہ اب کیا کیا جائے۔۔۔ کوئی تدبیر ذہن میں بھی ہی نہیں آ رہی تھی۔ حسن اتفاق سے تم سے اچانک اور غیر متوقع ملاقات ہوگئی۔ مجھے اپنی اس خوشی پر دیر تک یقین نہیں آیا۔ ایسا لگا کہ میں کوئی سپنا دیکھ رہی ہوں۔“

تو تم سامان پر لعنت بھیج کر گھر واپس جاسکتی ہو۔۔۔ وہاں سے ہونٹ والوں کو پے آڈر کے ذریعے ادائیگی کر دیتا۔ پھر وہ تمہارا سامان ارسال کر دیں گے۔“

”لیکن سوکھ کیس میں تو میرا سب کچھ رکھا ہوا تھا۔ میرا کٹ۔۔۔ لے لی ایم کارڈ۔۔۔ کریڈٹ کارڈ اور رقم۔۔۔ لیکن میں زیادہ رقم دستی یک میں نہیں رکھتی لیکن میک اپ کی لوازمات تمام رکھتی ہوں۔“

یہ کہتے کہتے وہ خطرناک حد تک میری طرف جھک گئی۔ جمرکوں سے ہوش اڑانے والی خوشبو کے جموٹے آنے لگے۔ پھر وہ بولی۔

”لیکن اب میری مشکل آسان ہوگئی ہے کیوں

۔۔۔





اس نے تالے میں چابی لگائی اور ہینڈل گھماتے ہوئے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ اس کا سواگت بڑا پر تپاک ہوگا۔ کمرے میں شاید قاتل ہوگا۔ وہ اس تاک اور گھات میں ہوگا کہ راکھی سے کمرے کی تنہائی میں خوب فائدہ اٹھا کر پھر اسے قتل کر کے اس کا سامان لے کر فرار ہو جائے۔ وہ بھی ہر طرح سے تیار تھا کہ قاتل کی کوئی حسرت پوری کرنے نہیں دے گا۔ لیکن کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اس نے دانش روم جھانک لیا۔ الماری اور پینک کے نیچے اس خیال سے بھی دیکھ لیا کہ شاید اس میں چھپا ہوا ہو۔ خیر یہ تھی۔ اس کا سایہ تک نہ تھا۔ شاید نیچے ہی اس کا تعاقب کرنے کے لئے کوئی بد معاش ہوگا۔ بہر حال اس نے اندر سے کبرا مقفل کروا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

ٹیکسی نے اسے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ گاڑی کے جانے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ اس نے دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو

کر کر سگریٹ پینے اور مسافروں کو دیکھنے میں اکتانہ پھر ٹھیک وقت پر وہ بیک ہاتھ میں لئے ہال کی طرف بڑھ گیا۔ اسی لمحے لیڈیز وینگ روم سے راحی آئی اور پھر اس نے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

”تم جانتی ہو میں اس قماش کا آدمی نہیں ہوں۔“ ٹائیکر نے اسے وہ بیگ تھما دیا جو زیادہ بھاری نہیں تھا اور کہنے لگا۔ ”کوئی دشواری نہیں ہوئی تھے جے دہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ البتہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی تمہارے بارے میں دو تین فرج پوچھ چکا ہے اور دہاں تمہارے انتظار میں کہیں موجود بھی تھا۔ دے دے میرا خیال ہے کہ تم اپنا پیچھا کرنے والے کو فاذن دبے میں کا سب ہو گئی ہو۔“

”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تم نے جیسا کہا کر لیا۔ ٹرین آچکی ہے اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ میں اپنا پلیٹ فارم اور تمہارا انکٹ لیتا آؤں اور ریزرویشن بھی کرا لوں۔ لمبا سفر ہے۔ تمہیں بھی چاہیے۔“

Dar Digest **198** February 2013

رہی لے رہا تھا۔ اس نے بوتھ سے ٹیک لگائے اجنبی کو  
بے تعاقب میں آتے دیکھا۔ وہ دونوں اچانک ہی  
مچے۔ راکھی نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

ٹائیگر مسکرا دیا۔ ”ارے یہ تو خفیہ پولیس کے  
بائسکپز مسٹر دیال ہیں۔۔۔۔۔“

”ہاں..... کیوں نہیں جانتا۔ بہت اچھی طرح

جانتا ہوں۔ اس لئے کہ میری اس سے بھی بڑی نہیں.....  
 کہیں جناب.....! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“ اس  
 نے سب انہیکڑ سے پوچھا۔

سب انہیں ہکا بکا کر گیا۔ ”کیا ٹھیک لہجے میں کہہ رہے ہو۔۔۔؟“ اس نے تنہ لہجے میں پوچھا۔  
 دوسرے لہجے میں اس نے ٹانگیں کھینچ کر پہچان لیا۔ ”ہلو دیوا  
 کل۔۔۔! مجھے یہاں تم سے ملاقات کی ہرگز توقع نہیں  
 تھی۔“

”یہ بات تو میں آپ سے بھی کہہ سکتا ہوں۔“  
اس نے کہا۔ ”آپ سنائیں۔۔۔ کہاں تک جانے کا  
ملازمہ ہے؟“

”امید تو یہی ہے کہ اب اور آگے نہیں جانا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ مجھے راکھی نامی شریستی کی تلاش تھی۔“

”آپ نے تو مجھے حیران کر دیا..... میرا خیال تھا کہ شاید شدہ لوگ سیدھے گھر جاتے ہیں کیوں کہ دیر سے گھر آنے پر بیتیاں نہ صرف ناراض ہوتی ہیں بلکہ سخت سے باز پرس کرتی ہیں۔“ اس نے چوٹ کی۔ ”بہر حال اسے ایک خوش گوار اتفاق سمجھ لیا کہ یہ مس راکھی جی ہیں جن کی آپ کو تلاش ہے۔“

”نیر ابھی یہی خیال تھا۔“ سب انسپٹر رام دیال نے خنک لہجے میں کہا۔ ”اور یہ کوئی اتفاق نہیں..... تم بتاؤ کہ یہ شریکتی جی تمہاری دوست جس؟“

”بہت پرانی دوست ہیں جن سے برسوں بعد

ملاقات ہوئی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آج اتفاقاً ہماری ملاقات ہو گئی۔“

”پھر تب تو تم ان کی تازہ سرگرمیوں سے واقف نہیں ہو گے؟“ سب انسپکٹر رام دیاں نے کہا اور پھر وہ راگھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں سختی اور چہرے پر سرد مہری ابھر آئی۔ ”تو آپ ہی مس راگھی ہیں.....؟“ اس نے خالص رسمی انداز میں دریافت کیا۔ جس کی پشت پر طنز تھا۔

”جی ہاں۔“

”میں سب انسپکٹر رام دیال ہوں۔“ اس نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر راکھی کو دکھایا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ مرس راکھی۔۔۔! آپ میرے ساتھ چلیں اور چند سوالات کا جواب دیں۔“

ٹائیگر نے سب اسپیکر کو دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور پھر وہ اپنا کردار کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔

وہ اسٹین ماسٹر کے کمرے کی طرف بڑھے۔  
مجھے اندازہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس لئے آفس  
سے تعلق چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس  
نے اپنے اخبارات کا رول جس پر ریڈر بیٹڈ چڑھا تھا  
ڈسٹ بن میں ڈال دیا جسے وہ دیر سے اٹھا رکھا تھا۔  
چونکہ وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس لئے اس  
کی حرکت کوئی دیکھ نہ سکا۔

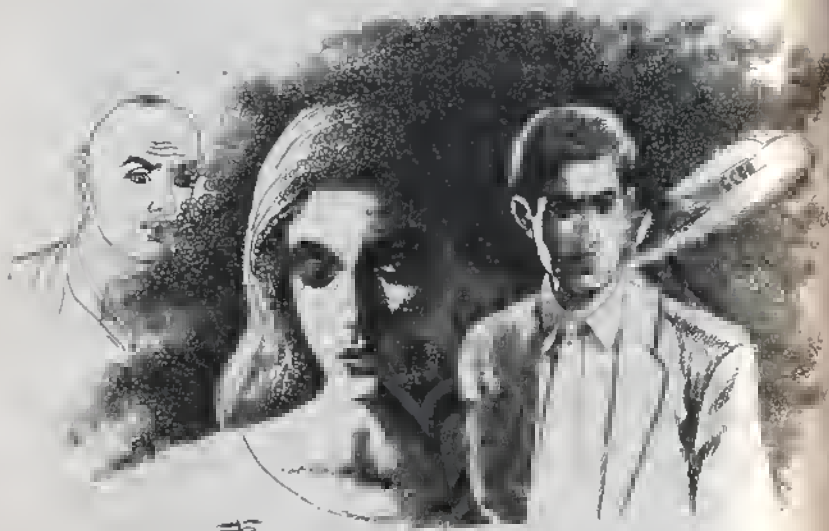
اندر پہنچ کر سب انسپکٹر رام دیال کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ اب وہ محض ایک مستعد پولیس افسر تھا۔

آپ مسز راگھی راجیش کمار ہیں اور آپ کے  
 بیٹی کا نام شایدا رو بھی ہے۔ ”اس نے راگھی سے پوچھا۔  
 ”آپ شاید اپنے بیٹی کے ساتھ نہیں رہ رہی ہیں.....  
 لیکن آپ اس وقت بنگلور جا رہی ہیں مڈر لوجسٹن.....

وہ بے ہوا کی جہاز سے بھی جا سکتی تھیں۔۔۔۔۔ شاید اس میں کوئی مصلحت ہے جسے آپ بہتر سمجھتی ہیں۔ کیا آپ اسے دوست مانتی ہیں۔“

”جزوی طور پر.....“ راکھی نے نہایت اعتماد





## خلاء سے واپسی

ہنری ہٹس - انتخاب: عابد علی لاہور

رات کے گھٹا شوپ اندھیرے میں ملک کا نامور سائنسدان اغوا کر لیا گیا اور پلک جھپکتے ہی ایک اور سیارے میں پہنچا دیا گیا، اس سیارے پر وہ کوئی چار ماہ رہا اور جب پراسرار حالت میں واپس آیا تو.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ دوسرے سیارے والے زمینی سائنسدانوں سے آگے ہیں، ایک انجی کہانی

میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مریخ سیارے میں انسان سے ملنے جلتی ایک نسل آباد ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سامنے کوئی شخص کھڑا ہے۔ یہ بات بہت حیران کن تھی، کیونکہ سرشام ہی اس نے سب دروازے بند کر دیے تھے اور چابیاں اس کی جیب میں تھیں اس نے سرائی کر دیکھا، ایک طویل قامت شخص سیاہ لبادے میں چھپا ہوا

رات کا ایک بجا تھا، مشہور سائنس دان، سائنس دان اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار خلا باز بھی تھا اور مختلف انسانی نسلوں کے علوم کا ماہر تھا۔ اس وقت جب کہ سارا شہر مٹی غند سوراہا تھا، وہ ایک طویل رپورت مرتب کرنے میں مشغول تھا۔ صبح کے بعد رپورت اعلیٰ سطح کی ایک سائنسی کانفرنس میں پیش کرنے کی ماہ کی مسلسل محنت سے وہ یہ ثابت کرنے

کچھ بتا سکو۔

”ضرور بتاؤں گا۔“ ٹائیگر نے لہجہ میں مدد سے بڑے بڑے کہا۔ ”چند برس ایک سالے پرانی غصہ ہوتے ہوئے کہا۔“ ”تجربہ سے پیشہ ورانہ مدد ملی تھی۔“ ”تجربہ سے ہم نے کبھی نہیں۔“ ہاں کبھی کبھی ٹیلی فون پر بات ہوتی رہی۔ اتفاق سے آج سلور بار میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے پھر ایک بار مجھ سے مدد طلب کی۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ ان کے کچھ خراب لوگوں نے روایت رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اب انہیں بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ ان کے ہونے کے گرد وہ لوگ منڈلا رہے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ وہ لوگ ہونے جا رہے ہیں۔

ٹائیگر نے توقف کیا۔ انپکٹر کے ہونٹوں پر مسخرانہ مسکراہٹ تھری رہی تھی۔ ”ان کے ہونے کے گرد منڈلانے والوں میں پولیس کا ایک آدمی سادے لباس میں بھی تھا۔“ ”وہ بولا۔“ ”ممکن ہے۔“ لیکن راگھی کے علم میں یہ بات نہیں تھی۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ اس صورت حال میں کیا جائے۔ چنانچہ میں ہونے چلا گیا۔ وہاں میں نے ان کا مل ادا کیا۔ ان کے کمرے سے بیک نکالا اور یہاں چلا آیا۔ یہ طے تھا کہ یہ رات کی ٹرین..... کے کے ایکسپریس سے جنگور جا رہی تھی۔ لہذا ہمارے ملنے کے لئے یہ مناسب ترین مقام تھا۔ ”اگر ان کے بیک سے الماس ہیروں کا بار نکالو مجھے ذرا برابر بھی حیرت نہیں ہوگی۔“ سب انپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹائیگر نے راگھی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں اس بات کی چٹکی کھاتی رہی تھیں۔ الماس ہیروں کا بار اس نے چھپا لیا ہے اور وہ خلائی لینے پر برآمد ہوگا۔ راگھی اپنے ساتھ اسے بھی لے مری تھی۔ اسے لینے کے وقت میں دینے چاہتے تھے۔ (جاری ہے)

سے جواب دیا۔ ”چوں کہ میرے بچی سے صلح ہو گئی ہے۔ اس لئے جنگور جا رہی ہوں۔“

”آپ گزشتہ کئی ہفتوں سے لندن میں مقیم ہیں اور آپ کا میل جول ایسے لوگوں سے رہا ہے جنہیں پولیس عادی مجرم کی حیثیت سے جانتی ہے اور ان کے خلاف سنگین جرائم کے مقدمات عدالتوں میں چل رہے ہیں۔..... ہماری معلومات اور مشاہدے کے مطابق گزشتہ رات سابقہ ملکہ حسن کی کوٹھی میں جو کچھ ہوا اس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ آپ کی سرگرمیاں نہ صرف بے حد پراسرار بلکہ مٹھکوں ہیں۔“ وہ کہتے کہتے رکا اور راگھی کے بیک کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔

ٹائیگر میز کے سرے پر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگائی۔ ”آپ اس شریعتی پر کوئی الزام عائد کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ ”ایک معزز ہستی پر۔“ اس نے پلٹ کر بڑی سمجھ بھرا نظروں سے ٹائیگر کو دیکھا۔ ”کیا آپ نے اخبارات نہیں دیکھے جن میں یہ خبر شریعتیوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے کہ رات ملکہ حسن کا الماس ہیروں کا بار چوری ہوا ہے جس کی مالیت پچاس لاکھ روپے کی تھی۔ یہ بار جب وہ ملکہ حسن بنی تھی دہائی کے ایک سچ نے بحیثیت میزبان دس دنوں تک مہمان داری کرنے کے بعد دیا تھا۔“

”تو آپ کے خیال میں چور یہ شریعتی ہیں۔؟“ وہ بگڑ گیا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔“ سب انپکٹر نے دامن بجاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ہماری معلومات کے مطابق آپہیں استعمال کیا گیا ہے اس جرم میں۔“ ”وہ کیسے۔؟“

”واردات رتن کمار کے طرز کے انداز کی ہے۔ ہم نے تفتیش کے سلسلے میں رتن کمار کو سلور بار سے پکڑا تو یہ شریعتی اس کے ساتھ موجود تھیں۔ ہم نے ان کی نگرانی کا فیصلہ کیا۔ ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے۔ یہاں دیکھا کہ تم ہونے سے ان کا بیک لئے چلے آ رہے ہو۔ اب تم بھی کچھ کہو..... ممکن ہے..... تم ہمیں

اُسے گھور ہاتھ۔ اس کی پیشانی کشادہ آنکھیں بہت چھوٹی اور ناک تقریباً غائب تھی۔ سارا جسم ایک طرف کو جھکا ہوا تھا کندھے اتنے اونچے کہ سر ان میں چھپ گیا تھا ڈاکٹر ایلین کی پہلی نظر میں سمجھ گیا کہ وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے۔ انجینی ایک قدم آگے بڑھا اور انگریزی میں بولا۔

”کیا آپ ڈاکٹر ایلین ہیں؟“

”جی، جی ہاں۔“ ڈاکٹر نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ ”اور آپ کی تعریف؟“

”میں آپ سے ملنے ایک سیارے سے آیا ہوں۔“

”کس سیارے سے؟ ضرور بیان کیجیے۔ تشریف رکھیے نا۔“

انجینی بیٹھ گیا اور پرتو قاری لہجے میں بولا۔

”میں ایسے سیارے کا رہنے والا ہوں جو آپ کے نظام شمسی سے باہر ہے۔ آپ ہزاروں سال بعد بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ ایک نظام شمسی سے دوسرے نظام شمسی تک پہنچنا آپ کے بس میں نہیں۔ آپ نے اب تک جو سیارے دریافت کئے ہیں، وہ آپ کے اپنے نظام شمسی میں ہیں، میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔“

”آپ کہتے جاییے، میں سن رہا ہوں۔“

”ہم چاہتے ہیں آپ کی دنیا کے کسی فرد کو اپنے ہاں کی سیر کرائیں اور اس مقصد کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہے۔ آپ کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ علوم انسانی کے ماہر ہیں اور ہم لوگ دنیا ہی کے رہنے والے ہیں۔ یوں سمجھئے، ہمارے ہاں کا انسان آپ کا چچرا بھائی ہے، میرا مطلب ہے نسل کے اعتبار سے۔۔۔ ہمارے ہاں سائنس اور ٹیکنالوجی آپ کی سائنس سے کوئی چار لاکھ گنا ترقی یافتہ ہے۔ آپ لوگ ہماری صلاحیتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ صرف ایک مثال دیکھیے۔ ہم جاپان تو کرہ ارض کو پانچ دن میں مکمل طور پر تباہ کر سکتے ہیں، نسل انسانی کے خاتمے

کے لئے ہمیں تیرہ گھنٹے کی ضرورت ہے اور نظام شمسی کو درہم برہم کرنے میں صرف چند دن کا عرصہ درکار ہے تاہم ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے، کیونکہ یہ ہمارے لئے بے فائدہ ہے ہمیں آپ سے کوئی نقص نہیں پہنچ سکتا ہم دنیا والوں میں سے ایک شخص کو منتخب کر کے اپنے ہاں لے جاتے ہیں اور اسے اپنی دنیا کی سیر کراتے ہیں ہر کے دوران میں اسے ہمارے لئے تھوڑا بہت کام کرنا پڑتا ہے یوں سمجھئے، یہ ایک طرح کا کاروبار ہے ہم آپ کو خلاؤں میں معلق وسیع و عریض سیاروں کی سیر کرائیں گے، اپنے سائنسی آلات دکھائیں گے اور آپ کے علم میں اضافہ کریں گے اس کے بدلے اگر آپ تھوڑا بہت کام ہمارے لئے بھی کریں، تو کیا مضائقہ ہے۔“

”میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”سمجھئے کی کوشش کیجیے۔ ہر چوبیس سال بعد آپ کی دنیا میں سے ہم ایک شخص کو اپنے ہاں لے جاتے ہیں اور چار ماہ بعد میاں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس مرتبہ آپ کو لینے آئے ہیں۔“

”اگر میں جانے سے انکار کر دوں تو۔۔۔؟“

”ہم زبردستی لے جائیں گے۔“

”لیکن مجھے صبح ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جانا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، آپ صبح ہونے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔“

”یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ مجھے چار ماہ ہاں رہنا ہوگا۔“

”ڈاکٹر ایلین، میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں آپ سے بہت آگے ہیں۔ گوہم پوری طرح وقت کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتے، لیکن یہ قدرت ضرور رکھتے ہیں کہ اسے چھ ماہ کے لئے اتنا میں رکھ سکیں چار ماہ بعد آپ واپس آئیں گے تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے ابھی ابھی میز پر سے اٹھ کر چلے ہو۔“

”میرے محسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرے ساتھی اور دوست بھی یہی محسوس کریں ورنہ وہ میری تلاش میں زمین کا چپہ چپہ چھان ماریں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں وعدہ کرتا ہوں آپ کی واپسی تک یہ چیزیں اسی طرح میز پر پڑی رہیں گی اور آپ صبح ہونے سے پہلے اپنا مقالہ مکمل کر سکیں گے۔ بہت سیدھی بات ہے، دنیا والوں کی نظر میں آپ ایک لمبے کے لئے غائب ہوں گے اور اپنی دانست میں چار ماہ کے لئے، امید ہے اب آپ کو تامل نہ ہوگا۔“

”بہت اچھا لیکن جانے سے پہلے میں آپ کے ہاں ضرور دیکھوں گا۔“

انجینی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ گیا، آپ سمجھتے ہیں شاید میں سرخ سے آیا ہوں۔ لیجئے دیکھئے اور تصدیق کر لیجئے۔“

ڈاکٹر ایلین نے انجینی کے پاؤں دیکھے وہ سرخ کی مخلوق کے پیروں سے قطعی طور پر مختلف اور کسی حیوانی بچے سے مشابہ تھے۔ ایلین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انجینی ٹھیک کہہ رہا ہے اور واقعی کسی دوسرے سیارے سے آیا ہے۔ علم کی پیاس نے اسے بے چین کر دیا وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور انجینی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”مجھے آپ کی دعوت منظور ہے، چلئے۔“

”بہت خوب، آپ نے ہاں کہہ کر غلطی کا ثبوت دیا ہے مجھے پہلے ہی امید تھی، آپ ایسا سنہری موتی ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔“

”مسٹر۔۔۔ معاف کیجئے، آپ کا نام؟“

”نام تو آپ سمجھ نہیں سکیں گے۔ دیئے آپ مجھے جواز کہہ سکتے ہیں میں اسی نام سے آپ کی ہر بات کا جواب دوں گا۔“

”تو مسٹر جونز، ہمیں کب چلنا ہوگا؟“ ڈاکٹر ایلین نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ابھی اور اسی وقت۔“

یہ کہہ کر انجینی نے اپنا ہاتھ ایلین کی طرف بڑھایا۔ ایلین نے یہ ہاتھ چھوا ہی تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی پٹیلی میں تیز سوئی چھبودی ہو۔ اگلے ہی لمحے اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی ہاں کی آنکھ کھلی غالباً وہ نم بے ہوشی کے عالم میں تھا اس کے دائیں بائیں ستارے تھے اور وہ نہایت تیزی سے خلا میں پرواز کر رہا تھا پھر اسے چھوٹے چھوٹے چہرے نظر آئے اس نے غور سے دیکھا یہ اس کے اپنے چہرے تھے جی ہاں، ان سب کی شکل ڈاکٹر ایلین سے مشابہ تھی، پھر تارکی نے اسے ڈھانپ لیا چاروں طرف اتھاہ تارکی تھیں۔ وہ دھند میں نیچے ہی نیچے جا رہا تھا اس کا ہر گھونگہ لگا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا باجرا کیا ہے کسی سردی کے مارے اس کے دانت بچتے تو کبھی گرم سے جسم جھلنے لگتا۔ یہ ایک طویل سفر تھا۔ غنودگی میں اسے ایک لڑکی بھی دکھائی دی پھر رے ہالوں اور نیلی آنکھوں والی معصوم صورت دو شیئر۔ وہ اس پر تھکی ہوئی تھی اور بار بار اسے جگانے کی کوشش کر رہی تھی پھر اسے ایک طویل خود فراموشی نے آیا۔

ڈاکٹر ایلین کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ اس کے لئے بالکل نیا تھا، دیواریں گول اور پکٹی تھیں اور نظر ان پر پڑھ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی اس کے باوجود چاروں طرف دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اسے کوئی بلب یا شیب دکھائی نہ آیا وہ آہستہ سے اٹھا اور دروازے تک گیا۔ زور لگا کر دیکھا تو معلوم ہوا دروازہ باہر سے بند ہے اس نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ”مسٹر جونز، دروازہ کھولو۔“ وہ زور سے چلایا مگر بے سود۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دور دور تک کسی جاندار کا وجود نہ ہو۔ وہ دیر تک چیخا رہا لیکن دروازہ نہ کھلا تو تھک بار کر اس نے دوبارہ سونے کا فیصلہ کر لیا اور بستر میں لیٹ گیا۔ گزری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں تجربہ گاہ میں انجینی کی آمد، عجیب و غریب سیارے کا ذکر اور پھر چار ماہ کے لئے سیر کی دعوت، تاہم وہ راستے



کے واقعات اچھی طرح ذہن میں نہ لاسکا۔ غالباً اسے کوئی نشر آور چیز دی گئی تھی اچانک دروازے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر ایک کھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ جوزس کے سامنے کھڑا تھا وہی انجینی جو اسے یہاں لایا تھا۔

”ہیلو ڈاکٹر ایلی سن، مجھے امید ہے آپ کی تھکن دور ہوگئی ہوگی۔ واقعی یہ ایک طویل سفر تھا بہر کیف آپ منزل تک پہنچ گئے۔“

”جی ہاں، مگر یہ کیا حرکت ہے، آپ نے مجھے قید کیوں کر رکھا ہے؟“

”اس قید میں آپ کو تکلیف محسوس ہوگی ہو، تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ جونہی مجھے آپ کی بیداری کی اطلاع ملی میں یہاں پہنچ گیا میں آپ کی خدمت کے لئے ایک خوبصورت نرس ساتھ لایا ہوں۔“

”نرس! وہ کس لئے، کیا میں بیمار ہوں؟“

”جی نہیں، بیمار تو نہیں، مگر آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے، ایسے ساتھی کی جو دکھ سکھ میں آپ کا ساتھ دے سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کو یہاں کی دنیا میں گھما پھرا سکے۔“

”آپ کا مطلب کسی گائڈ سے ہے؟“

”جی نہیں، بیوی کہئے۔“

”بیوی؟ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“

”ہم آپ کی شادی نہایت دھوم دھام سے کریں گے، اس ٹھاٹھ سے جیسے آپ کے ہاں شزاؤں کی ہوتی ہے۔“

”بکواس بند کرو، تم نہایت دھوکے

بازدار چالاک معلوم ہوتے ہو مجھے اپنے جال میں پھنسا کر یہاں لے آئے اور اب نہ جانے کیا انٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔ یاد رکھو میں تمہارے کسی فریب میں آنے کے لئے تیار نہیں۔“

یہ سن کر انجینی نرم لہجے میں بولا۔

”ڈاکٹر ایلی سن، میں نے وعدہ کیا تھا کہ چار ماہ

بعد آپ کو صحیح سلامت زمین پر پہنچاؤں گا، میں اس وعدے پر قائم ہوں، مگر آپ تعاون پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ بہر حال میں کسی بی سی 301 کو یہاں چھوڑ جا رہا ہوں، باقی باتیں آپ اس سے دریافت کر لیجیے۔“

دروازہ کھول کر اس نے ایک لڑکی کو اندر بلا دیا۔ ایلی سن حیران رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔ خدا خد خد! سے پتہ چلا تھا وہ بھی زمین ہی کی رہنے والی ہے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جوز بولا۔

”مجھے اجازت دیجیے چند ضروری کام ہیں ورنہ

میں آپ سے ضرور گفتگو کرتا۔ مس بی سی 301 آپ کی زبان بخوبی جانتی ہے۔ امید ہے آپ اس کی موجودگی میں اس کرنے کو ذلیل خانہ تصور نہیں کریں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ ایلی سن خاموشی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ شروع سے ہی آخر تک سائنس دان تھا اور سائنسی تجربات کے سوا اسے کسی بات سے دلچسپی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ سینتیس برس کا ہونے کے باوجود اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ اب وہ بستر پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے کیا گفتگو کرے۔ لڑکی بلاشبہ خوبصورت تھی، لیکن اسے ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ بالآخر لڑکی خود ہی بولی۔

”ڈاکٹر ایلی سن، غالباً آپ کا بھی نام ہے، میں بہت خوش ہوں کہ آپ سے ملاقات ہوئی۔“

اچانک ایلی سن کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے کہا:

”مس، کیا میں آپ کے پاؤں دیکھ سکتا ہوں؟“

”میرے پاؤں بہت بد نما ہیں اور مجھے شرم بھی آ رہی ہے۔ میرا مطلب ہے میرے پاؤں کچھ زیادہ خوبصورت نہیں۔“

”جیسے بھی ہوں، میں ایک نظر انہیں دیکھنا

چاہتا ہوں۔ آپ شاید نہیں جانتیں، میں انسانی نسلوں کے علم میں بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے، مسٹر جوز نے آپ کا تفصیلی تعارف کرایا تھا۔“ لڑکی ہنپکاتے ہوئے بولی، پھر اس نے جوتے اتار دیے۔ ایلی سن نے دیکھا اس کے پاؤں بالکل دیسے ہی تھے جیسے دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی چیز غیر انسانی نہ تھی۔

”کیا آپ بھی دنیا سے آئی ہیں؟“ ایلی نے بے اختیار سوال کیا۔

”اوہ! میں کچھ نہیں جانتی۔ سروسٹ صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ میں فوراً شادی کر لینی چاہئے۔“

”شادی، کیا فضول بات ہے کیا میں دنیا سے یہاں اس لئے آیا ہوں کہ شادی رچا تاں پھرں۔ بھلی مانس، مجھے دنیا میں شادی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، یہاں کیونکر ہو سکتی ہے۔“

لڑکی اپنے گھٹنوں پر جھکی اور تقریباً روتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر، خدا کے لئے مجھے ان بد نما خشیوں سے بچائیے۔ میں یہاں کے مقامی باشندوں سے کسی قیمت پر شادی نہیں کر سکتی۔ وہ بھوت ہیں۔ جی ہاں، وہ یقیناً بھوت ہیں۔ انکے پاؤں لمبی کے بچوں کی طرح اور ناک چہرے میں وحشی ہوئی ہے۔ آپ انہیں دیکھ لیں تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں۔ یقیناً چاہئے اگر آپ نے مجھ سے شادی نہ کی، تو آپ کو ان میں سے کسی بھتنی سے بیاہ کرنا پڑے گا۔“

”کیا شادی کرنا ایسا ہی ضروری ہے۔ فرض کیجئے، میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ جو چاہتے ہیں، وہی ہوگا۔“

”تمہاری مراد جوز سے ہے؟“

”ہاں، جوز اور اس کے ساتھی جو اس سیارے کے اصل باشندے ہیں، یہی چاہتے ہیں اگر آپ نے انکار کیا تو وہ آپ کو کشین میں ڈال دیں گے اور وہاں سے اور ہال ہو کر باہر نکلیں گے تو فوراً ان بھتنیوں میں

سے کسی ایک سے شادی کر لیں گے اور اچھے برے کی تمیز کھودیں گے خدا کے لئے ڈاکٹر، میری بات مان لیجیے۔ ان کے پاس ایک مشین ہے جو کشین کے مالک چاہتے ہیں۔“

”معلوم ہوتا ہے تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اچھا، ان باتوں کو ذہن سے نکال دو اور سیارے کے باشندوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔ کیا وہ سب تمہاری طرح ہیں یا ان بھوتوں کی طرح جن کا تم ابھی ذکر کر رہی تھیں۔“

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میں اس سیارے میں تمہاری لڑکی ہوں، لیکن آپ ان باتوں میں وقت ضائع کیوں کر رہے ہیں جلدی سے ہاں بھر لیجئے ورنہ ابھی وہ جوز آ کر آپ کو کشین کی طرف لے جائے گا۔“

”پھر وہی مشین، عجیب، بیکسی، بیکسی باتیں کر رہی ہو تم۔“

لڑکی نے زچ ہو کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس کی کلائی پر گھڑی سے ملتی جلتی کوئی چیز بندھی تھی ڈائل بالکل سفید تھا۔ اور ایک کے بجائے چابی ویسے کی پانچ سوئیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایلی سن نے جھک کر دیکھا، پھر بولا۔

”یہ کیا ہے؟“

لڑکی نے ایک چابی گھمائی اور ڈائل پر چھوٹی چھوٹی تصویریں ابھرنے لگیں سیاہ کپڑوں میں چھ رسات عورتیں اور مرد ایک میز پر بیٹھے ہوئے تھے ان کی شکلیں غیر انسانی تھیں۔ ڈاکٹر ایلی سن نے کہا۔

”گویا یہ ٹیلی ویژن ہے۔“

”جی نہیں، اسے یہ لوگ ”سرجیم“ کہتے ہیں۔ اس کی مدد سے میں جہاں چاہوں دیکھ سکتی ہوں وہیں میں کے دائرے میں ہر شے بآسانی دیکھ جاسکتی ہے تصویر میں آپ کو جو لوگ نظر آ رہے ہیں، وہ آپ ہی کے منتظر ہیں۔“

”میرے منتظر وہ کس لئے؟“

”وہ آپ کی کھوپڑی کھول کر اس میں نیا وماغ ڈالیں گے۔ پھر آپ وہی کریں گے جو وہ چاہیں گے۔“  
 ”ایسا ہرگز نہیں ہو سکا، میں جواز سے شکایت کروں گا اس نے وعدہ کیا تھا مجھے سالم زمین تک پہنچایا جائے گا کہاں ہے وہ؟“  
 یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن لڑکی نے اسے پکڑ لیا۔

”آپ کا باہر جانا ٹھیک نہیں ہے، میں خود جا کر اسے بلاتی ہوں۔“  
 وہ دروازے کی طرف بڑھی، ایلی سن نے جلدی سے اس کی ٹکائی پکڑ لی اور مانتیانیہ لہجے میں بولا۔  
 ”مس، کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے ”سرج تیم“ وے سکتی ہیں وہاں آ کر لے لیجئے گا۔“

لڑکی نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر گھڑی نما آلہ اس کے حوالے کر دیا جب وہ چلی گئی تو ایلی سن بنے اسے غور سے دیکھا اور پھر ایک سوئی دہائی۔ ڈائل پر چند تصویریں ابھریں بق وق میدان جنگ اور پھر ایک وسیع و عریض جمیل دور دور تک پانی پھر ٹیز سے میز سے مکان تصویریں مسلسل بدل رہی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ وہ خود حرکت کر رہا ہے اس نے ”سرج تیم“ بستر پر رکھ دی تصویریں ساکن ہو گئیں۔ ڈائل پر ایک طویل برآمدے کی تصویر ابھرائی مختلف سوئیاں و باکرہ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ایک تصویر دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا یہ اس کی اپنی تصویر تھی جی ہاں، وہ خود یعنی ڈاکٹر ایلی سن ایک مقامی عورت کے ساتھ سرک پر چلا جا رہا تھا جلد ہی وہ منظر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دوسری تصویریں ابھرائیں اسی لمحے دروازہ کھلا اور جواز مسکراتا ہوا اندر آیا۔ ایلی سن نے جلدی سے سرج تیم بستر کے نیچے رکھ دی اور جواز کی طرف دیکھنے لگا اس کے پیچھے سفید کپڑوں میں ایک شخص سرج ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا وہ ڈاکٹر ایلی سن نے کچھ کہنا چاہا لیکن جواز نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اسے سوئی کی جبین محسوس ہوئی اور وہ

فرش پر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک بہت بڑے ہال میں کرسی پر بیٹھا تھا سامنے اسٹج پر کچھ لوگ نظر آ رہے تھے کسی نے اس کی آنکھوں پر پردہ پٹن لگا دی۔ اب آسانی سے ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا اسٹج کے درمیان ایک بہت بڑی مشین نصب تھی دائیں جانب سے پیردار ایک جینٹنی جلاتی لڑکی کو کھینٹ کر لائے اور ایک کرسی پر بٹکر دیا ایلی سن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ مسی نی 301 تھی وہی لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے اس کے کمرے میں موجود تھی ایلی سن نے اٹھنا چاہا مگر وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا، ناچار کسمار کر رہ گیا تھوڑی دیر بعد وہ ایک مقامی نوجوان کو پکڑ لائے نوجوان بہت غصے میں تھا اور بار بار خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا چہریداروں نے اسے بھی ایک کرسی کے ساتھ جکڑ دیا اور چیچے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

مشین کے قریب ایک شخص جی لباس پہنے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک بن بن وایا اور دوپٹے کی مشین حرکت میں آ گئی۔ وہ دونوں کرسیاں جن میں سے ایک پرمسی نی 301 اور دوسرے پرمقامی نوجوان بیٹھا تھا، ایک جھٹکے سے مشین کے اندر چلی گئیں ایلی سن نے بت بنائی منظر دیکھتا رہا چنانچہ مشین کی دوسری جانب سے ایک دروازہ کھلا اور دونوں کرسیاں باہر آ گئیں چند پیرداروں نے آگے بڑھ کر کرسیاں کھولیں اور مسی نی 301 اور وہ نوجوان آزاد ہو گئے اور بڑی سہ تابی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت مدت کے بعد ملے ہوں ڈاکٹر ایلی سن بلیکٹن جھپکا تارہ گیا اور وہ ہاتھوں میں پانٹیں ڈالے اسٹج سے نیچے اتر کر نظروں سے غائب ہو گئے ادھر پیرداروں نے ایک مقامی لڑکی کو اسٹج پر لاکھڑا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے کرسی سے باندھ دیا گیا پھر وہ ایک اور آدمی لائے۔ ایلی سن ہلکا گیا۔ آئے والا شخص وہ خود تھا۔ پیرداروں نے آنے والے ایلی سن کو دوسری کرسی کے ساتھ جکڑ دیا اور مشین

ایک بار پھر حرکت میں آ گئی دونوں کرسیاں مشین کے اندر غائب ہو گئیں اور تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے لٹلیں تو کرسی پر بیٹھے ہوئے ایلی سن کا دماغ مکمل طور پر بدلا جا چکا تھا وہ اٹھا اور اس کا یہ بہ صورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر مسکراتا ہوا ہال سے باہر چلا گیا غصے اور بے چارگی کے شدید احساس سے ڈاکٹر ایلی سن کا ذہن مازوف ہوئے لگا۔ کچھ میں نہ تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔

• اچانک اسٹج پر پھر کچھ لوگ دکھائی دیئے۔ اس بار مسی نی 301 اسٹج پر لائی گئی۔ ایک مقامی نوجوان اس کے ساتھ تھا وہ دونوں مشین کے اندر سے ہو کر آئے تو مہیاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے کو قبول کر چکے تھے اگلے ہی لمحے ایک اور ایلی سن مقامی لڑکی کے ساتھ اسٹج پر آیا پھر وہی عمل ڈاکٹر ایلی سن کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں وہ کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوری قوت سے چیخا۔

”بند کرو یہ ناپاک کھیل۔“  
 کسی نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ سوئی کی جبین محسوس ہوئی اور وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اب تک وہ صحیح سالم تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا اور گزشتہ باتیں اس کے ذہن سے بخوند ہوئی تھیں۔ وہ زہنی باشندہ تھا اور جواز کے ساتھ چار ماہ کے لئے اس سیارے پر رہنے کے لئے آیا تھا۔ مسی نی 301 کی دی ہوئی ”سرج تیم“ ابھی تک بستر کے نیچے پڑی تھی اور اسے یقین تھا وہ زمینی لڑکی اس کی ہمدرد اور نیک خواہ ہے ابھی ابھی اس نے جو منظر دیکھا اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جواز اور اس کے ساتھی کسی خطرناک کھیل میں مصروف ہیں اور وہ عقرب ان کا آلہ کار بننے والا ہے۔ اس نے سوچا جو بھی ہو، وہ ان کے ناپاک عزائم پورے نہ ہونے دے گا۔ اس نے ”سرج تیم“ کی کئی ایک سوئیاں گھمائیں لیکن جواز یاد لڑکی دکھائی نہ دی۔

شاید اسے سمت کا ٹھیک اندازہ نہ تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور لڑکی اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں سیب سے مشابہہ کوئی پھل تھا۔ ”ڈاکٹر ایلی سن، معلوم ہوتا ہے آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا، لیجئے، یہ پھل بہت لذیذ ہے۔“ ایلی سن نے اس کے ہاتھ سے پھل لے لیا اور سرج تیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”بس براؤنڈ، کیا آپ بتا سکتی ہیں یہ عمارت کہاں ہے؟“  
 ”ڈاکٹر میرا نام سی نی 301 ہے، مس براؤنڈ نہیں۔“  
 ”جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“  
 ”میں کچھ نہیں کہہ سکتی، مجھے اس سے ڈر لگا ہے۔“  
 ”کس سے؟ کیا جواز سے؟“

”جی ہاں“  
 یہ کہہ کر لڑکی جلدی سے ہاتھ بڑھا کر وہ سرج تیم اٹھانے لگی، ایلی سن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ڈانٹ کر کہا۔

”بیاد، وہ سب لوگ اس عمارت میں کیا کر رہے تھے؟“  
 ”میں کچھ نہیں کہہ سکتی، مجھے ان سے خوف آتا ہے، میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ آپ مجھ سے شادی کر رہے ہیں یا نہیں؟“

”پھر وہی شادی کی رٹ میں پوچھتا ہوں وہ لوگ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے تم کون ہو اور یہاں کیسے پہنچیں؟ میرے سوالوں کا صاف صاف جواب دو، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“  
 جواب دینے کے بجائے لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، ایلی سن سمجھ گیا کہ اس سے مزید افسار فضول ہے۔ اس نے دروازے کے قریب جا کر اسے باہر کی طرف دھکیلا لیکن وہ بند تھا۔ وہ دروازے سے اندازہ کھٹکنا لگا۔ دروازہ کھلا اور جواز اندر آ گیا۔ ایلی سن



موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے پہلے ہی سے طے کر لیا تھا کہ اس مرتبہ جہاز کی زہریلی سوئی سے بچے گا۔ جونہی جہاز اس کے قریب ہوا، اس نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی اور بازو مروڑ کر اسے فرش پر گرادیا۔ ابھی جہاز سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایلی سن نے اس کی پتھلی پر لگی ہوئی ایک لمبی سی نیوب اور زہریلی سوئی اتار لی اور اگلے ہی لمحے سوئی جہاز کے جسم میں داخل کر دی جہاز فوراً بے ہوش ہو گیا۔ ایلی سن نے اس کی تلاشی لی، لیکن اور کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ اس نے جہاز کو پٹنگ کے نیچے دھکیل دیا اور نیوب اور زہریلی سوئی اپنی دائیں پتھلی پر چڑھائی۔ وہ خوفناک ہتھیار اس کے قابو میں آچکا تھا جس کی مدد سے جہاز نے اسے تین بار بے ہوش کیا تھا۔ لڑکی ابھی تک کمرے کے ایک کونے میں کھڑی خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

”میں ان کے ہاتھ نہیں آسکتا۔ شاید تم نہیں جانتیں، میں ایک باہر خلا باز ہوں اور کئی بار زحل سیارے تک جا چکا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں نہیں، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے، میں کہیں نہیں جاسکتی۔۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ایلی سن نے جلدی سے سوال کیا۔ ”کیا تم جانتی ہو خلائی جہازوں کا اڈہ کہاں ہے؟“

”شہر سے باہر، اس طرف۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا یہاں اڑن مشینیں بھی ہیں؟“

”جی ہاں، وہ۔۔۔ وہاں چھت پر ہیں۔“ وہ ابھی تک ہچکیاں لے رہی تھی۔

”دروازے پر کوئی پیر ہیرا تو نہیں؟“

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایلی سن دروازے کے قریب گیا اور ایک طرف ہٹ کر دستک دی، دروازہ کھلا اور سفید کپڑوں میں ایک شخص اندر داخل ہوا۔ ایلی سن نے وقت ضائع کئے بغیر اپنی پتھلی میں لگی ہوئی سوئی اس کے جسم میں داخل کر دی جونہی وہ شخص بے حس

و حرکت ہوا، ایلی سن اس کا لباس اتارنے لگا لڑکی پریشان ہو کر باہر بھاگی۔ ایلی سن نے اسے آواز دی مگر وہ جا بھئی تھی۔ ایلی سن نے جلدی سے اس شخص کے کپڑے بچے اور دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ وہ چاہتا تھا لڑکی مل جائے تاکہ اسے خلائی جہازوں کا اڈہ تلاش کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ وہ خطرناک ہتھیار یعنی زہریلی سوئی اب تک اس کے پاس تھی۔ اس نے برابر اڈے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر بھاگا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ فرش پر ایک لاش پڑی تھی۔ ایلی سن نے قریب جا کر دیکھا خوف سے اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ وہ ایلی سن تھا یعنی وہ خود۔ وہ اٹنے پاؤں بھاگا اور دوبارہ برآمدے میں آ گیا طویل برآمدے کے دوران اطراف میں دیے سی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جس انداز کے کمرے میں وہ اب تک قید تھا۔ اتفاق سے کوئی شخص وہاں موجود نہ تھا۔ ایلی سن تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہیں نہ کہیں زینہ نظر آ جائے گا۔ ایک موڑ پر چاچک دروازہ کھلا اور سفید کپڑوں میں ایک مقامی شخص برآمدے میں آیا۔ ایلی سن نے اپنی ٹوٹی ماتھے پر جھکا لی اور بے پروائی سے اس کے سامنے سے گزر گیا۔

چونکہ اس نے خود بھی سفید کپڑے پہن رکھے تھے، اس لئے اس شخص نے مطلق توبہ نہ دی اور اس پر ایک اچھٹی سی نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ برآمدے کے آخر میں ایلی سن کو اوپر جانے والا زینہ دکھائی دیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک ہی سانس میں چھت پر پہنچ گیا۔ دن کا وقت تھا ایک چھوٹا سا سورج سر پر چمک رہا تھا۔ دور دور تک زینے ہی زینے نظر آ رہے تھے۔ یہ بہت بڑی عمارت تھی چھت پر کئی فضا کی کاریں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی شکل بہت بڑی گیند کی طرح تھی۔ نیچے ایک چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا ایلی سن نے اب تک ایسی کار نہیں دیکھی تھی پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے اڑانے کی کوشش کرے گا۔ وہ دوڑ کر ایک قریبی کاریں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس

کار میں صرف دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، سامنے بہت سے ڈائل تھے اور تین لیور۔ ایک لیور پر تیر کا نشان اور دوسری طرف تھا دوسرے پر نیچے کی طرف تیسرے لیور پر کوئی نشان نہ تھا۔ ایلی سن سمجھ گیا کہ پہلا لیور کار کو ہوا میں اٹھانے کے لئے ہے اور دوسرا نیچے لانے کے لئے تیسرا لیور غالباً آئین اسٹارٹ کرنے کے لئے تھا۔ اس نے تیسرے لیور کو ذرا سی حرکت دی۔ ڈائل پر ہبز بتی روشن ہوئی۔ ایلی سن نے پہلا لیور دیا اور کار بغیر کسی شور کے فضا میں بلند ہوئی لڑکی کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ خلائی جہازوں کا اڈہ کس طرف ہے لیکن فضا کی کار کو اس طرف موڑنے کی ترکیب سمجھ میں نہ آتی تھی اس نے تینوں لیوروں کو دائیں بائیں حرکت دینے کی کوشش کی اور بالآخر اسے معلوم ہو گیا کہ تیسرے لیور سے وہ سمت بدل سکتا ہے ان نے فضا کی کار کا رخ لڑکی کے بتائے ہوئے خلائی اڈے کی طرف موڑ دیا اور کھڑکیوں سے نیچے دیکھنے لگا جہاں تک نظر کام کرتی تھی ایک وسیع و عریض شہر نظر آ رہا تھا۔ لمبی لمبی سفید گلیاں، گنبد نما عمارتیں اور عجیب و غریب درخت جن کا رنگ ہبز نہیں، سرخ تھا کہیں کہیں پراسرار مشینیں اور بڑے بڑے ڈرم بھی نظر آئے۔

ایلی سن سمجھ گیا یہ ان کی سامنسی تجربہ گاہ ہیں۔ جلد ہی اسے خلائی جہازوں کا اڈہ نظر آ گیا۔ اڈہ خالی تھا لیکن کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا جہاز کھڑا تھا۔ اف خدا یا! ایلی سن نے سوچا اتنا بڑا خلائی جہاز اس نے ساری عمر میں نہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا زحل والوں نے بنایا ہے کیونکہ ان کے قد زمینی انسانوں سے کئی سو گنا بڑے تھے اور اسی نسبت سے ان کی ہر چیز بڑی تھی۔ اور کوئی جہاز اڈے پر موجود نہ تھا، اس لئے ایلی سن نے سوچا اگر وہ کسی طرح اس جہاز کے اندر پہنچ جائے تو اسے اڑانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

زحل سیارے میں وہ ایک سے زائد مرتبہ جا چکا تھا اور وہاں کی سائنس اور ٹیکنالوجی سے بخوبی واقف تھا لیکن اس جہاز تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس کا

دروازہ زمین سے کئی ہزار فٹ اونچا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ ایلی سن فضا کی کار کی مدد سے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائے عام حالات میں ایسا کرنا موت کو گودت دینے کے مترادف تھا لیکن اس وقت ایلی سن کی جان پر بنی ہوئی تھی اور وہ ہر قیمت پر اس شخص سیارے سے نکل جانا چاہتا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ فضا کی کار کھنڈوں سے فاصلے پر لے گیا۔ اور وہاں سے راستہ متعین کر کے نہایت پھرتی کے ساتھ دروازے کے پاس پہنچ گیا یہاں اس نے لیور کو نیٹرل کیا اور کار کا دروازہ کھول کر خلائی جہاز کے ہینڈل پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا فضا کی کار ہوا میں معلق تھی لیکن کسی وقت بھی اس کے ہٹنے کا خدشہ تھا۔ ادھر خلائی جہاز کے دروازے کا ہینڈل اٹا ہوا تھا کہ اسے ایک ہاتھ سے کھولنے کی طاقت نہ تھی بالآخر اس نے ہاتھ اندر کھینچ لیا، فضا کی کار کا دروازہ بند کیا اور لیور دبا کر اسے پیچھے لے گیا۔ اس بار وہ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے فضا کی کار اٹا ہوا دروازے کے ہینڈل کے قریب آیا اور کار کے ہینڈل سے ٹکرائی قسمت اچھی تھی دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور وہ کار سمیت جہاز کے اندر چلا گیا۔ اس کے اندر جاتے ہی خلائی جہاز کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

ایلی سن اتنے بڑے خلائی جہاز میں جہا تھا۔ پہلے تو اسے خوف آیا۔ کہیں جہاز میں زل کا کوئی باشندہ نہ ہو، لیکن فضا کی کار کی مدد سے جہاز کے سب کمروں میں پرواز کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں کٹرول روم میں جہاز کے لیور اتنی اونچائی پر تھے کہ فضا کی کار کی مدد کے بغیر ان تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ اس نے نشان لیا اور فضا کی کار لیور تک لے گیا انہیں دبانے کی طاقت سے باہر تھا۔ لہذا یہاں بھی اسے وہی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے فضا کی کار کو لیوروں سے ٹکرا دیا اور جہاز آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ کٹرول ڈیسک پر اور کوئی بن موجود نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا جہاز کا رخ پہلے سے متعین کر دیا گیا ہے اور وہ اسے تبدیل

نہیں کر سکتا۔ نقشے اور چارٹ اتنے بڑے تھے کہ ایک نفر میں انہیں دیکھنا بہت مشکل تھا۔

بہر حال وہ کار کی مدد سے چوتھوڑا بہت اندازہ کر سکا، جہاز کا رخ زمین ہی کی طرف تھا۔ یہ بات حیران کن تھی، تاہم ایلی سن سمجھ گیا کہ زحل والے اس سیارے سے لوٹ کر زمین پر جانا چاہتے ہوں گے۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس سیارے تک پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہو گئے، جب کہ وہ ابھی اسی نظام شمسی میں تھے جس میں زمین واقع تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس سیارے والوں سے کوئی ساز باز کر رہے ہیں اور زمین پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ وہ جہاز ایلی سن کے قبضے میں آ گیا۔ وہ صحیح سلامت زمین تک پہنچے یا نہ پہنچے، زحل والے تو واپس نہ آ سکیں گے۔ اسے یقین تھا جو زور اور اس کے ساتھیوں کے پاس انتظار اجاز ہو ہی نہیں سکتا جس میں زحل کی دیوتا قامت مخلوق سما سکے۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھا اور جہاز نہایت تیزی سے اپنے سفر طے کر رہا تھا۔

کنٹرول روم سے پرواز کر کے ایلی سن ایک بار پھر نشست گاہ میں پہنچا اور فضائی کار سے اتر کر ایک وسیع و عریض صوفے پر لیٹ گیا۔ اس کی سوچیں جوں کے سیارے تک جا پہنچیں جو شاید ہوش میں آ چکا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ہر قیمت پر اسے پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خلائی جہاز پر راکٹ پھینکے، یا کسی تیز رفتار جہاز میں سوار ہو کر اس کا پیچھا کرے۔ بہر حال ایلی سن کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ جوں اور اس کے ساتھی اسے جان سے نہیں ماریں گے اور زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ ان کے نزدیک بہت ”قیمتی“ تھا۔ ایلی سن کے لئے دوسرا بڑا خطرہ یہ تھا کہ زمین پر کس طرح اترے۔ اتنے بڑے جہاز کے لئے ایک وسیع و عریض اڈے کی ضرورت تھی۔ وہ دل ہی دل میں وینا کے بڑے بڑے ہوائی اڈوں کے متعلق سوچنے لگا ان میں سے کوئی بھی انتظار نہ تھا کہ اس جہاز کو اتار سکے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ زمین والے اس عفریت کو دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جائیں گے اب وہ کسی طرح

انہیں یہ بتانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا کہ اس جہاز کے اندران کا ایک بھائی بند موجود ہے۔ ممکن ہے یہ خلائی جہاز دیکھتے ہی وہ اس پر حملہ آور ہوں اور اسے جس جس کر دیں، اس صورت میں اس کی ساری کوششیں رائیج جا سکیں گی۔ وہ نہ صرف اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے بلکہ ایک نئے سیارے کے بارے میں دنیا والوں کو کچھ بتانے کے قابل نہ رہے گا۔

جہاز میں سوار ہونے وقت وہ جلدی میں خوراک اور پانی کے ذخائر کا اندازہ نہ کر سکا تھا جو بھی جہاز نے پرواز کی، اسے یہ خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں ایندھن ختم نہ ہو جائے بلکہ بھی زور درں پر بھی، وہ اٹھا اور فضائی کار میں بیٹھ کر اسٹور کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اسٹور کا دروازہ کھولنے میں اسے بہت دقت ہوئی تاہم جیسے جیسے وہ کامیاب ہو گیا۔ اسٹور میں پانی بھی موجود تھا اور خوراک کے ڈبے بھی لیکن ان تک رسائی ممکن نہ تھی پانی کا ہر ڈبا اس کے قد سے پارہ فٹ اونچا تھا اور مضبوط دھات کا بنا ہوا تھا خوراک بھی ٹین کے سخت ڈبوں میں تھی اور دھات کی اچھے اچھے موٹی چادر کاٹنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ دوبارہ انجن روم میں گیا اور ساتھ والے کمپن میں اسے ویلڈنگ کا سامان مل گیا۔ اس نے گیس کا سلنڈر ایک رے کی مدد سے فضائی کار سے بانڈھا اور پرواز کرتا ہوا اسٹور میں پہنچا۔ بڑی مشکلوں سے صحیح نشانہ لیا اور ویلڈر کی مدد سے پانی اور خوراک کے ڈبے پکھلا دیئے پانی فرش پر پھیلنے لگا وہ جلدی سے ایک خالی بوتل کا ڈھکنا اٹھالیا جس نے اچھا خاصا پانی کا کام دیا۔ اس نے باقی پانی سے بھری اور اسے سخت گاہ میں لے گیا واپس آ کر وہ خوراک کے ڈبے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ایک لیس دار گاڑھا مادہ ڈبے کے سوراخ میں سے نکل رہا تھا۔ اس نے ذرا سا پکھلکا بہت خوش ذائقہ تھا، وہ فرش پر بیٹھ گیا اور خوب سیر ہو کر کھایا، پھر فضائی کار میں بیٹھ کر نشست گاہ میں رکھے ہوئے صوفے تک پہنچا اور بیٹھ بیٹھ کے مزے لوٹنے لگا۔

جب وہ اٹھا تو دیکھا کہ جہاز ٹھیک پرواز

کر رہا تھا۔ فضائی کار قریب ہی تھی لیکن اسے خدشہ تھا کہیں اس کا ایندھن ختم نہ ہو جائے، اس لئے وہ پیدل ہی اسٹور کی طرف چل کھرا ہوا۔ وہاں سے دوبارہ پیٹ پھرنے کے بعد انجن روم میں گیا۔ اچھی خاصی ورزش ہوئی تھی اسٹور سے انجن روم تک کوئی ایک فرلانگ کا فاصلہ ہو گا نقشوں کی مدد سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ نصف فاصلہ طے کر چکا ہے۔

دن اور رات گزرتے گئے وہ صبح شام ڈٹ کر کھانا کھاتا اور صحت برقرار رکھنے کے لئے پیدل گھومتا۔ خلائی جہاز میں آسکین کے پیچے موجود تھے لیکن ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی، جہاز کے اندر جتنی آسکین تھی، وہ اس کے لئے بیٹیوں کا کام دے سکتی تھی۔ کبھی کبھار وہ تھکائی سے گھبرا جاتا۔ اس کا بچی چاہتا کسی سے باتیں کرے، لیکن وہاں کون تھا جو اس کی خواہش پوری کرتا۔

ایک بار اس نے اسٹور روم میں سے کوئی کتاب تلاش کرنے کی کوشش کی مگر زحل کی پیچھی ہوئی کتاب پڑھنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ کتاب کو انگریزی میں بھی اور معلوم ہوتا تھا انہوں نے کسی زمینی کتاب کا خاص ایڈیشن شائع کیا ہے لیکن اس کی لمبائی چورائی اتنی زیادہ تھی کہ ایلی سن کی آنکھ ان حروف کو پوری طرح نہ دیکھ سکتی تھی۔ کتاب کے ایک صفحے سے دوسرے صفحے تک سفر کرنے کے لئے اسے چندہ بیس منٹ درکار تھے بہر کیف وقت جوں توں گزرتا رہا اور ایلی سن اپنی کوششوں میں مصروف رہا کہ کسی طرح خود کو مایوس نہ ہونے دیا۔ وہ ہر روز دو تین میل پیدل چلتا، ورزش کرتا، ڈٹ کر کھاتا اور پھر لمبی تان کر سوتا۔

ایک روز جب وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک خلائی جہاز میں ایک زلزلہ سا آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اسے سمجھوڑ رہی ہے۔ ہر چیز تہہ وبالا ہو گئی۔ ایلی سن بھی صوفے پر گر آ اور اسے خاصی چوٹ آئی۔ اگلے ہی لمحے انجن روم سے آواز آنی بند ہو گئی۔ سارے انجن رک گئے تھے وہ فضائی کار کی طرف بھاگا اور اسے تیزی سے اڑاتا ہوا انجن روم میں پہنچا یہ

دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ڈائل کے مطابق وہ منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا انجن خود بخود بند ہو گیا تھا اور ہزرتیاں جل اٹھی تھیں اس نے کار کا رخ حیرانی دروازے کی طرف موڑ دیا۔ خلائی جہاز کا یہ دروازہ کھولنے وقت اسے خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، تاہم اس نے وہی پہلے والا طریقہ استعمال کیا اور کار کو ٹھیک نشانے پر پینڈل کے ساتھ ٹکرا دیا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور وہ کار مست باہر آ گیا۔

”جیب دروازہ ہے، اندر کی طرف سے بھی کھلتا ہے اور باہر کی طرف بھی۔“ وہ بڑبڑایا، جہاز سے باہر تخت تاریکی میں اسی اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس فضائی کار میں لوگوں کے سروں پر سے گزر جائے گا اور وہ حیرت سے اسے دیکھتے رہ جائیں گے لیکن اس کی ساری امیدیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ جو بھی وہ فضا میں بلند ہوا، ایک دیوتا قامت بیولا آگے بڑھا اور ایک بہت بڑے ہاتھ نے جس کی چوڑائی کم بیش آٹھ فٹ کے لگ بھگ تھی پکڑ کر اس کی کار کو مٹی میں لے لیا۔ لمبی لمبی انگلیوں نے کار کا دروازہ کھولا اسے کھینچ کر باہر نکالا اور پھر شاید اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی مگر قہر سے لڑتا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ جس دیو کے قبضے میں تھا وہ اسے چنگیوں میں مسل سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کی سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو گئیں۔ لیکن آہستہ آہستہ حقیقت حال اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے سوچا زحل والوں کا خلائی جہاز زمین پر کیسے جا سکتا تھا۔ وہ یقیناً زحل پر پہنچ گیا ہے اور وہ دیوتا انسان زحل کی مخلوق ہے شدید بے بسی اور لاچارگی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے معلوم ہوتا تھا زحل والوں کو پہلے سے اپنے جہاز کی دایمی کا علم ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شدید تاریکی کے باوجود وہ فوراً پکڑا گیا۔

بہر کیف اب وہ دشمن کے قبضے میں تھا اور یہاں سے بچ نکلنا ناممکن نظر آتا تھا۔ تاہم وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو جلد ہمت ہار جاتے ہیں وہ آخر دم تک لڑنے



کا تاج تھا چنانچہ اس نے بڑی سنجیدگی سے غور شروع کیا کہ اس دیوے سے کیونکر نجات حاصل کر سکتا ہے اور پھر دفعہ اسے وہ زہریلی سوئی یاد آئی جس کی مدد سے اس نے جونز کو بے ہوش کیا تھا۔ وہ جیب میں اچھلتے اور کودنے لگا۔ جلد ہی ایک ہاتھ جیب میں آیا اور اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ پہلے سے موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے جلدی سے زہریلی سوئی اس شخص کی وسیع و عریض ہتھیلی میں گھونپ دی۔ نتائج بہت حوصلہ افزا نکلے وہ شخص لڑکھڑایا اور پھر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ایلی سن جیب سے نکلا اور پوری قوت سے دوڑنے لگا۔ وہ جلد از جلد اس شخص سے دور جانا چاہتا تھا۔ راستے میں کئی کھڑے آئے اور وہ اس میں گرتے گرتے بھاگتا۔ آخر اسے ایک گلی دکھائی دی اور وہ اس گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی بڑے موٹر گاڑی کی چوٹی اور فٹ پاتھ کی چوڑائی پچاس فٹ سے کم نہ تھی وہ بڑی مشکل سے فٹ پاتھ پر چڑھنے میں کامیاب ہو سکا۔ اکا دکا رانگہر آ جا رہے تھے اور اسے دھڑکا کہ وہ اسے پیروں تلے نہ چل دیں اس لئے وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اچانک سامنے ایک چوک آ گیا یہاں ٹریفک کا زور تھا دھڑل والے اپنی طویل و عریض گاڑیوں میں سوار تھے اور یہ گاڑیاں قیامت کا شور مچاتی ہوئی قریب سے گزرتیں تو اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ آخر ایک جگہ اسے تھوڑی سی روٹی مل گئی۔ اسے وہ روٹی اٹھائی اور دونوں کانوں میں اڑی۔ اب وہ شور سے محفوظ ہو گیا تھا۔ سڑک پار کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا وہ دیر تک انتظار کرتا رہا اور آخر جب گاڑیاں گزرتیں اور سڑک تقریباً خالی ہو گئی تو وہ دوڑ کر سڑک پار کرنے لگا۔ ابھی وہ آدھا راستہ طے کر سکا تھا کہ دور سے ایک دیو قیامت سڑک آتا ہوا دکھائی دیا۔ ٹرک لمحہ بے لمحہ قریب آ رہا تھا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ واپس جانے کی کوشش بے سود تھی ٹرک سر پر آ پہنچا اچانک اسے ایک گڑھا دکھائی دیا سڑک یہاں سے ٹوٹ گئی تھی اور جا بجا گڑھے بن گئے تھے۔ وہ ایک ہی جست میں گڑھے میں پہنچ گیا اور چٹ

لیٹ گیا۔ ٹرک اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اٹھا اور گرد و غبار کی وہ تہہ ہٹانے لگا جس نے اسے ڈھانپ لیا تھا ایک اور دوڑ کے بعد وہ سڑک کی دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک بات جس سے وہ بہت پریشان تھا ان گلیوں اور سڑکوں کی حیرت انگیز حد تک زمینی گلیوں سے مشابہت تھی چند سال پہلے جب زمینی لوگوں کے دخل والوں سے تعلقات اچھے تھے تو وہ ایک خبر سنا لی وہ فند کے ساتھ یہاں آیا تھا لیکن بعد میں تعلقات گھڑ گئے اور دخل والے زمین کے خلاف نت نئی سازشیں کرنے لگے کبھی وہ مرغ اور مشتری کے باشندوں کو ساتھ ملا کر زمین پر چڑھائی کرنے کا منصوبہ بناتے تو کبھی خود کار گاڑیوں سے زمین کے کسی حصے کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے لیکن زمینی باشندے سائنس میں ان سے کہیں آگے تھے اور اپنے عظیم حلیے اور دیو قیامت اعضا کے باوجود دخل والے زمین والوں کا کچھ نہ لگاڑ سکتے تھے۔ بہر کیف اب جو وہ چاروں طرف دیکھتا تو ہر شے بدلی ہوئی نظر آتی۔ معلوم ہوتا تھا دخل والوں نے گلیاں، مکان، گاڑیاں، لباس غرض ہر شے میں زمینی باشندوں کی نقل کی تھی۔ اب ہر چیز بڑے پیانے پر ہونے کے باوجود شکل و صورت میں زمینی چیزوں سے مشابہت تھی۔ وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ اس کی نظر ایک پتھر پر اٹھی۔ اس نے جھک کر دیکھا یہ لندن ٹائٹل کا ایک صفحہ تھا اس کا سر گھومنے لگا لندن ٹائٹل دھڑل سے بھی شائع ہوتا ہے لیکن اس صفحے پر ایک جگہ جلی حروف میں لکھا تھا، نیویارک، خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی کیا یہ ممکن ہے کہ یہ واقعی اس کی اپنی زمین جہاں سے وہ جونز کے ساتھ سیارے کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے ہر چیز اتنی بڑی تھی کہ وہ دیکھ رہا تھا لندن ٹائٹل کا پتھر ہوا ورق دیکھنے کے بعد اسے کچھ شک سا ہو گیا۔

گلی ایک وسیع و عریض بازار میں داخل ہوتی تھی۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کانوں کے سامنے بورڈ دیکھنے لگا اور پھر ایک بار اسے اپنی بے بسی کا شدت

سے احساس ہوا یہ سب دکائیں اس کی دیکھی بھالی تھیں۔ وہ یہاں بیٹوں بار آ چکا تھا۔ گرین ریٹورنٹ میں وہ بیٹوں چائے پیتا رہا تھا۔ موٹر پر جوڑ پارٹیکل اسٹور تھا وہاں سے خریدے ہوئے کپڑے وہ ابھی تک پہنے ہوئے تھے۔ اپنی حیران کن بات تھی وہ دوبارہ زمین پر تھا ہر چیز وہی تھی۔ لیکن جسامت میں بڑی ہو گئی تھی لیکن نہیں۔ وہ خود بہت چھوٹا ہوا گیا تھا جونز نے اس کے ساتھ یقیناً مذاق کیا تھا اسے اپنی سائنس سے کام لے کر اسے اتنا مختصر کر دیا تھا کہ وہ دوبارہ دنیا میں پہنچنے پر بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اس بھری پری دنیا میں تھا اپنی جسامت کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک مکوڑے سے زیادہ نہ تھی۔ لوگوں کی باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں، کیونکہ وہ زور سے بولتے تھے کہ سوائے بے لگم شور کے کچھ اس کے بولنے پر نہ تھا کاش، اسے جونز مل جائے وہ اس سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ساری تباہی ویربادی کا ذمہ دار تھا۔ اس نے جونز پر اعتبار کیا تھا لیکن یہ اعتبار اسے بہت بوجھ لگا۔ اب وہ کیا کرے کہاں جائے۔

وہ اپنی رائے سے روٹنے لگا۔ خاصی دیر تک وہ اپنی قسمت پر آنسو بہاتا رہا، اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایک حقیر چوہے کی طرح دیوار کے ایک شکاف میں دھکا بیٹھا رہا۔ رد و حرکت جب اس کا جی ہلکا ہوا تو وہ اٹھا اور کچھ سوچ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ سڑکیں اور گلیاں پہچاننے میں اسے بڑی مشکل پیش آتی تھی اس کے باوجود وہ نام نہاد تھا اس کی نہ کسی طرح گھر کی سمت سفر کرتا رہا۔ کئی دن گزر گئے چند میل کا فاصلہ اس کے لئے کئی سوئیل بن گیا تھا دن بھر وہ کسی تاریک کونے میں چھپا رہتا کیونکہ اسے خوف تھا کہ کوئی اسے دیکھ کر پکڑ لے گا اور جو بے سمجھ کر پکڑا کر میں بیچ دے گا۔

دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ رانگہروں کے پاؤں تلے نہ آ جائے۔ جب رات خاصی گزر جاتی اور سڑکوں پر بھیڑ کم ہو جاتی تو وہ اپنی عارضی "پناہ گاہ" سے نکلتا اور دیواروں کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف بڑھنے لگتا۔ کئی دفعہ گزر گئے۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے چہرہ اور ہاتھ

پاؤں زخمی ہو گئے سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے اور وہ اچھا خاصا جانور نظر آنے لگا۔ بھوک اور پیاس مٹانے کے لئے وہ مکانوں اور گھروں کے سامنے بنے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈبوں میں سے کچھ تلاش کر لیتا۔ بسکٹوں کے خالی ڈبوں میں بھی اسے اتنا کچھ مل جاتا کہ وہ خوب پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ ایک دو بار اس نے دووہ کی خالی بوتلوں میں بچا کھیا دووہ بھی پیا معلوم ہوتا تھا اسے گھر تک پہنچنے کے لئے کئی ماہ و کار رہوں گے لیکن قسمت اچھی تھی جو اسے کڑی نظر آ گیا۔ کڑی اس کے پڑوسی کا بیٹا تھا چار پانچ سال عمر کی بہت ہی کھلڑا اور شوخ، اکثر اوقات وہ اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھیلا کرتا تھا جس میں بیٹھ کر ایلی سن اپنی سائنسی رپورٹیں مکمل کرتا تھا کڑی کے باپ کے پاس ایک پرانی سی موٹر گاڑی اور وہ کبھی کبھی اسے وجود صلا کر کڑی کے ساتھ محلے بھر کے بچوں کو سیر کرانے لے جایا کرتا تھا۔ ایلی سن ایک دکان کے چمچے کے نیچے کھڑا ایک خالی بوتل میں سے اچار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی نظر کڑی پر پڑی۔ وہ اپنی موٹر کار میں بیٹھا تھا۔ چونکہ وہ ابھی بچہ ہی تھا اس لئے ایلی سن کو اس کا چہرہ اور آنکھیں نظر آ گئیں اور اس نے جھٹ پھٹا پھٹا کر دیکھ لیا کہ وہ کڑی ہے۔

کچھ سوچ کر ایلی سن اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور بھاگ کر موٹر کے نیچے چھپ گیا۔ نمبر پلیٹ خاصی اونچی تھی تاہم اسے ایک اینٹ دکھائی دی اور وہ اس اینٹ پر چڑھ کر نمبر پلیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ نمبر پلیٹ اور موٹر کی ڈوگی کے درمیان تھوڑی سی محفوظ جگہ تھی وہ اس جگہ بیٹھ گیا اور نمبر پلیٹ کے کنارے مضبوطی سے پکڑ لئے تھوڑی دیر بعد اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ موٹر چل پڑی تھی۔

دن بھر وہ اسی جگہ بیٹھا رہا۔ موٹر کئی جگہ گئی اور تین چار مرتبہ کی، لیکن وہ نہ اترا، جھٹکوں سے اس کا جسم ٹوٹنے لگا۔ چند بار اسے اچھی خاصی چوٹیں بھی آئیں۔ مگر وہ مستقبل مزاحی سے اپنی جگہ نہ اترا رہا۔ آخر شام ہونے لگی۔ موٹر ایک جگہ رکی اور سب لوگ اتر کر چلے گئے۔ ایلی سن پھر بھی وہیں بیٹھا رہا۔ جب رات کی سیاسی

چاروں طرف پھیل گئی تو وہ اٹھا اور نیچے چھلانگ لگادی۔ وہ ٹھیک مقام پر پہنچ گیا تھا۔ سامنے اس کا گھر نظر آ رہا تھا لیکن وہ خود کتنا بدل چکا تھا۔ پلاٹ میں اگی ہوئی گھاس اسے گنجان جنگل دکھائی دے رہی تھی اور دروازے تک پہنچنے میں سڑیاں اتنی بلند تھیں کہ ان پر چڑھنا ناممکن نظر آتا تھا۔ ایلی سن اور ادھر گھومنے لگا۔ وہ اس تلاش میں تھا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے وہ سیرگی کا کام لے سکے۔ پلاٹ خراسے دو چھریاں مل گئیں اس نے کوڑے میں سے ایک لمبا سا اٹھایا (یہ رسا اصل میں ایک باریک دھکا گا تھا) اور ناچس کی جلی ہوئی تیلیاں تلاش کرنے لگا۔ کل آٹھ تیلیاں مل سکیں اس نے رسے کی مدد سے وہ تیلیاں ان چھریوں کے ساتھ اس طرح باندھیں کہ اچھی خاصی سیرگی تیار ہوگئی۔ اوپر کی منزل سے روشنی آ رہی تھی اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ اس کا دوست ٹین جاک رہا ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے سیرگی اٹھائی اور زینے سے لگادی۔ جب وہ دروازے میں داخل ہوا تو ٹھکن سے اس کا جسم چور تھا اور ایک قدم چلنے کی سکت نہ رہی تھی۔ دروازے کی ایک طرف اسے فرش صاف کرنے کی جھاڑن دکھائی دی۔ وہ اس جھاڑن میں گھس کر سو گیا۔

جب وہ اٹھا تو دن نکل آیا تھا اور چاروں طرف چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آرام کرنے سے اس کی ساری ٹھکن دور ہوگئی تھی اور اب وہ تازہ دم تھا۔ اس نے سب سے پہلے ٹین کے کمرے کا دروازہ کھٹکنا لیکن اتنی آواز پیدا کرنا اس کے بس میں نہ تھا جس سے ٹین آگاہ ہو جائے۔ پلاٹ خرا لی سن نے فیصلہ کیا کہ وہ دروازے کے نیچے سے رینگ کر دوسری طرف پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اندر سے منہ لیٹ گیا اور ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر پہنچ گیا۔ کمرہ بالکل اسی طرح تھا جیسا کہ اس نے بارہا دیکھا تھا۔ ایک پنگ دیکھنے کی میز اور کرسی اور کتا بوں کی ایک لماری، یہ کمرے کا کل سامان تھا۔ ٹین کہیں دکھائی نہ دیا۔ ایلی سن، ٹین کی خواب گاہ سے اپنے کمرے کی طرف چلا مگر اس کے کمرے میں تالا پڑا تھا

اور دروازے کے نیچے جگہ اتنی کم تھی کہ وہ اندر جا سکتا تھا۔ پلاٹ خرا وہ ٹین کے کمرے میں آیا اور کھانے کے لئے کچھ تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی اسے ایک بہت بڑی رکابی میں دودھ مل گیا۔ غالباً یہ دودھ ٹین نے اپنی پالتو بلی کے سامنے رکھا تھا۔ تاہم بلی کہیں دکھائی نہ دی۔ ایلی سن نے ڈٹ کر دودھ پیا اور پنگ کے نیچے جا کر سونے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مڑے سے سو رہا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دوبارہ رات ہو چکی تھی ٹین ابھی تک نہ لوٹا تھا۔ وہ اٹھا اور کمرے میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اچانک اس کی نظر دو بڑی بڑی آنکھوں پر پڑی۔ یہ آنکھیں سرخ تھیں اور اسے کھوری تھیں۔ اس نے ذرہ جیسے ہٹ کر دیکھا، وہ اتنا ذرا ہوا کہ وہ ٹین کی پالتو بلی ہے۔ وہ بارہا اس بلی کو پیار کر چکا تھا لیکن موجودہ حالت میں بلی اسے کیونکر پہچان سکتی تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ بلی غرائی ہوئی آگے بڑھی۔ ایلی سن کو اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ اس کے پاس بچاؤ کا کوئی طریقہ نہ تھا اور نہ ہی فرار ہونے کی طاقت۔ قریب پہنچ کر بلی کی اور اپنا پیچہ آگے بڑھا یا۔ ایلی سن کی سانس رک گئی اور سوچے سمجھے کی صلاحیتیں ختم ہو گئیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا۔

الگ ہی لمبے وہ بلی کی گرفت میں تھا۔ اس نے آخری بار خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر بلی نے اسے مسلتا اور تھوڑا سا شروع کر دیا۔ شاید یہ کھانے سے پہلے اپنے شکار کو بے سدھ کرنا چاہتی تھی۔ یہ لمحہ بہت نازک تھے۔ وہ بے بس تھا اور اس عفریت سے نجات حاصل کرنے کی ساری کوششیں بے کار ہو چکی تھیں۔ دفعہ بلی نے اپنا پیچہ اس کے کندھے پر پارا۔ اس کا بازو ڈوٹ گیا اور حلق سے ایک چیخ نکلی۔ تکلیف کی شدت سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ بلی نے اسے پیٹ سے پکڑا اور ہوا میں اٹھا دیا۔ وہ سمجھ گیا آخری گھڑی آج پہنچی اور بلی اسے اٹھا کر منہ تک لے جا رہی ہے۔

مین اس وقت جب بلی کی مونچھیں اسے چھوری

خس اسے زہریلی سوئی کا خیال آیا۔ اس نے دایاں ہاتھ پڑھا کر سوئی بلی کے نیچے میں داخل کر دی۔ بلی نے آخری بار اسے بری طرح جھنجھوڑا۔ اس کی ہڈیاں چنچنے لگیں لیکن اگلے ہی لمحے بلی کی گرفت کمزور ہوگئی اور وہ جبٹ کر فرش پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ بے ہوش بلی اس پر گرے، وہ اٹھا اور دوڑ کر پنگ کے نیچے چھپ گیا۔

بلی بے ہوش ہو چکی تھی لیکن ایلی سن کو خطرہ تھا کہ جو وہ بے ہوش میں آئے گی، وہ دوبارہ اسے ہڑپ کرنے کی کوشش کرے گی۔ وقت بہت کم تھا اور کام بہت زیادہ ٹین سے ملنے کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح وہ تجربہ گاہ کی میز تک پہنچ جائے۔ اس طرح ٹین اسے آسانی دیکھ سکتا تھا۔ ٹین اور وہ ایک ہی تجربہ گاہ میں کام کرتے تھے۔ اس کی غیر حاضری میں ٹین ضرور وہاں موجود ہوگا۔ پیدل چل کر وہاں پہنچنا ناممکن نہ تھا کیونکہ وہ گھر سے کئی میل دور تھا اور اس کی موجودہ جماعت کی وجہ سے یہ فاصلہ سینکڑوں میل بن گیا تھا۔

آخرا سے ایک تدبیر سوچی۔ وہ دروازے سے نکل کر باہر برآمدے میں آیا اور اسٹور کی طرف چلا۔ اسٹور میں اسے جلد ہی مطلوبہ شے مل گئی یہ گتے کی ایک خالی ڈبیہ تھی جس میں ڈاک کے ذریعے کوئی دو ٹین کے نام آئی تھی۔ ڈبیہ کے اوپر ٹین کا نام اور تجربہ گاہ کا پتہ لکھا تھا۔ ایلی سن نے تھوڑی سی روٹی ڈھونڈ کر ڈبیہ میں رکھ دی۔ پھر وہ بسکٹوں کا چورہ جمع کرنے لگا اور کافاز کی ایک پڑیا میں باندھ کر ڈبیہ کے اندر رکھ دیا۔ اب وہ یہ چیزیں گھسیٹ کر باہر مین میں لے گیا۔ پھاٹک کے ساتھ ہی لیٹر کس تھاڑے سے اترنے میں اسے اپنی بنائی ہوئی سیرگی نے بہت مدد دی پھر وہی سیرگی اٹھا کر وہ لیٹر کس تک لے گیا اور گتے کی ڈبیہ لیٹر کس میں ڈال دی۔ پھر بسکٹ کی پڑیا اندر ڈالی اور سب سے آخر میں خود اندر چھلانگ لگادی۔

لیٹر کس میں سخت تاریکی تھی تاہم رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ اس نے ڈبیہ کھولی بسکٹ کی پڑیا اندر رکھی

اور پھر خود بھی اندر چلا گیا۔ روٹی کا ٹکڑا بنا کر اس نے نے ڈبیہ کا ”دروازہ“ بند کر لیا اور آرام سے لیٹ گیا جلد ہی اسے نیند آگئی آنکھ اس وقت کھلی جب اسے ایک زلزلہ سا محسوس ہوا۔ غالباً خط اور پکٹ الگ الگ کئے جا رہے تھے، پھر پنگولے لگے کسی نے اسے ڈبیہ سمیت اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد ڈاک گاڑی کی مسلسل حرکت اور پلاٹ خرا خاموشی چھا گئی ایک بار پھر پنگول چلی اور اسے میز پر پھینک دیا گیا۔ پھر طویل خاموشی۔ اس نے ”دروازہ“ کھولا اور آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ سامنے جانی پہچانی میز تھی۔ وہ اپنی تجربہ گاہ میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے اس کی کرسی پر کوئی بیٹھا تھا۔ ٹین..... نہیں، وہ جوتھا۔ اس کا بدترین دشمن، وہی جس کی وجہ سے اسے یہ سب مصیبتیں ملی تھیں۔

ایک خوفناک قہقہہ کمرے میں گونجا۔ جوت کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

”ڈاکٹر ایلی سن! آخر آپ پہنچ گئے۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ایلی سن نے اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے میز سے چھلانگ لگادی۔ فرش پر گر گئے ہی اس کا دوسرا بازو بھی ٹوٹ گیا۔ اب وہ بالکل بے بس تھا۔ سامنے جوت کھڑا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس کا قدم عام انسانوں جتنا تھا۔ حالانکہ سیارے میں وہ ایلی سن ہی کی طرح تھا۔ منادسا ایلی سن بھاگ کر ڈبیک کے نیچے چھپ گیا اور اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ جوت اس کا پیچھا کرے گا وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جوتی جوت کی انگلیاں سامنے آئیں، وہ زہریلی سوئی ان میں گھونپ دے گا۔ وہ ہر قیمت پر جوت سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جوت نے اس کی اصل حالت غائب کر کے اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔

”ڈاکٹر ایلی سن، باہر آ جائے، میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“





# قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

میری ذات کے دونوں پہلو، ایک ظاہر ایک پنہاں  
میں دل لگنا بھی جانتی ہوں، دل پھڑکانا بھی جانتی ہوں  
نظرِ نظر میں ہے خوشی کی، کہنیں کہنیں پر ہے اداسی  
دفا کی بازی لگا کے دیکھو، میں ہارنا بھی جانتی ہوں  
(مریم ماہ نمبر..... لاہور)

بند ہیں درجے تیرے پاس آؤں کیسے  
تو خفا ہو جائے تو میں مناؤں کیسے  
گزری ہے جو دل پہ بھلاؤں کیسے  
داغ وہ ملا ہے تجھے دکھاؤں کیسے  
(محمد اسلم جاوید..... فضل آباد)

کون ہمارا درد پڑھے گا ان زخمی دیواروں پر  
اپنا اپنا نام لکھا ہے سب رونے والوں نے  
دل کا غم سے رشتہ کیا ہے، عشق کا حاصل آنسو کیوں  
ہم کو کتنا زہر پلایا ہے ان بے درد سوالوں نے  
(محمد وارث آصف..... وال پھراں)

تھکا ہوا ہے وجود سارا یہ مانتی ہوں  
مگر خیالوں سے کوئی جائے تو غینہ آئے  
(فادریہ جسم..... ٹھینگ موزتصور)

یہ کچھ دن ہیں کہ اس کو یاد ہر اک شام کرنا ہے  
پھر اپنے دل کی بستی میں اسے گمنام کرنا ہے  
یہ کچھ دن ہیں کہ اس کی یاد جسم و جاں تھکائے گی  
پھر اس کے بعد ہم کو دیر تک آرام کرنا ہے  
(سائل دعا بخاری..... بھیرپور)

اسے یقین کہ میں جان نہ دے پاؤں گا  
مجھے یہ خوف کہ روئے گا آزما کے مجھے  
(آستر..... کراچی)

بڑی باتوں کو خاطر میں نہ لانا اس کی عادت ہے  
ذرا سی بات پر طوفان اٹھانا اس کی عادت ہے

محبت میں وہ سنجیدہ ہے کتنا دیکھتے رہا  
محبت ہر کسی سے یوں جتنا اس کی عادت ہے  
(شرف الدین جیلانی..... خٹواں دیار)

وہی رات کی خاموشی وہی نیناں  
یہ ہوا بھی کسی کی یاد لے آئی  
ہم تو بیٹھے چاند کو دیکھ رہے تھے  
نہ جانے کس کے لئے آنکھ بھر آئی  
(مونا جاوید..... کراچی)

اس نے کہا، گہری رات کی تاریکیاں دیکھیں  
کہا میں نے، پرانے عشق ہر پل دل میں جلا ہے  
کہا اس نے محبت میں تپش محسوس ہوتی ہے  
کہا میں نے کہ یہ سچی ہو تو گزار ہوتی ہے  
(رضیہ..... کراچی)

آج کل کی دوستی کاغذ کے پھول ہوتی ہے  
دیکھنے میں خوبصورت اور سونگھنے میں فصول ہوتی ہے  
(بلقیس خان..... پشاور)

بات چلی کہاں سے اور کہاں، وصل مگی  
تم سے ملی نظر پھر کہاں تسنیل مگی  
ان نظروں کے حصار میں صرف تم سما گئے  
نظریں جو جبک مگی تو طبیعت جیل مگی  
(عثمان غنی..... پشاور)

خون کیسا لیوں سے چھوٹا ہے  
سانس ٹوٹی کہہ کاچ ٹوٹا ہے  
ساری دنیا ابڑ مگی جیسے  
اس طرح تیرا ساتھ چھوٹا ہے  
(محمد آصف شہزاد آبادی..... ٹھینگ موزتصور)

وہ جو رہتا تھا اس دل میں کبھی اپنوں کی طرح  
ایسا بھولا کہ ملتا ہے اب سپنوں کی طرح  
پل پل کرتا تھا جو ساتھ نبھانے کی باتیں  
چھوڑ گیا ہم کو پرانی رسوں کی طرح  
(انتخاب: شفیق رضا..... سیال چنوں)

چوٹ لگ جائے تو کیا ہوتی ہے دل کی حالت  
اک آئینے کو پتھر پہ گرا کر دیکھو  
(ریحانہ جسم..... حیدر آباد)

☆☆



دور آنکھوں سے میری جس نے اجالے رکھے  
خواب آنکھوں نے سبھی اس کے سنبھالے رکھے  
ساتھ خوشیوں نے شب و روز نبھایا کس کا  
ہم نے پہ سوچ کے دکھ درد سنبھالے رکھے  
بڑی آنکھوں کو بھی کر دے گا وہ روشن اک دن  
جس نے آکاش کے دامن میں ستارے رکھے  
رات سادوں کی طرح ٹوٹ کے برسیں آنکھیں  
رات بھر ہم نے خطوط اس کے سنبھالے رکھے  
دل کے زخموں کو کسی طور بھی بھرنے نہ دیا  
ہم نے محفوظ محبت کے حوالے رکھے  
(حکیم خان حکیم..... کابل پورموسیٰ۔ اٹک)

کسی سے سل نہ سکا جو وہ چاک داماں ہوں  
کھانا نہ پھول کوئی جس میں وہ بخر خشک بیاباں ہوں  
سزایہ ہے کہ ہوں دنیا میں ایک عجیب انہی کی طرح  
لفظ یہ ہے کہ میں اس دور میں بھی انساں ہوں  
شفقت تھا ایسا کہ تزئین بزم امکاں تھا  
تکست ایسی کہ خود سے بھی اب گریزاں ہوں  
بقدر طرف کرد کب فیض دیدہ درو  
شیر گل کی طرح ہیں اب بھی یہاں پریشاں ہوں  
ظلم عقدہ کشائی ہے میرا دست جنوں  
مجھے پڑھو کہ میں بھی عزم تکست زنداں ہوں  
جو نئے نئے جاگے تو دنیا ہلا کے رکھ دیں گے  
نہ مجھ سے الجھو کہ میں بھی سامان حشر سزا ہوں  
یہ حادثات جہاں کیوں ہوں در بدر داجد  
خدا وہ دن ہی نہ لائے کہ میں تن آماں ہوں  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گیلانی..... کراچی)

جو تمہارے لب پہ ہے وہ بات بھی بے ساختہ  
ہاتھ میں جو آگیا، وہ ہاتھ بھی بے ساختہ

اس ہوانے جانے کیا سرکشی کی ہے جہوم کر  
ناچ اٹھا ہر پتھر ہر بات بھی بے ساختہ  
تھیلے اور نسل کے بندھنوں سے بے خبر  
عشق تو اک ذات ہے اور ذات بھی بے ساختہ  
اک ذرا سی بدگمانی بھی جو آئے دریاں  
آنکھوں سے ہو اشکوں کی ہر بات بھی بے ساختہ  
خفوں سے کب کم ہے یہ اہل وفا کے واسطے  
بلیروں کے ظلم کی سوغات بھی بے ساختہ  
جان لیتی ہیں دلوں کے راز آنکھیں دیکھیے  
راحت دل کو مگر ہے بات بھی بے ساختہ  
آفتاب عشق سے یوں نکھری ہر سو روشنی!  
چرخ اٹھے درد سے ذرات بھی بے ساختہ  
قلب خانم سے نکلتی ہے دعا یہ بارہا!  
اے خدا ہو سات اس کا، سات بھی بے ساختہ  
(فریدہ خانم..... لاہور)

منزلِ پاس ہے اور راہ گزر بھی نیرے پاس ہے  
اس دشتِ غبار میں فقط مسافر کی تلاش ہے  
دل میں میرے اک خواہش سی ہے دلی دلی  
میرے دل کو ابڑے باغ کو کلی کھلنے کی تلاش ہے  
ہوتا نہیں ہے کسی سے عداوت غم دل کا  
ہمیں خوشیوں کی آرزو ہے، خوشبوؤں کی تلاش ہے  
کل کا کچھ پتہ نہیں طلوع ہو بھی کہ نہ ہو  
میری آنکھوں کو ابھی بھی اک سحر کی تلاش ہے  
کچھ بھی تو مشترک نہ تھا ہم دونوں کے بیچ  
دل لگی اس کا کھیل، ہمیں اک محبت کی تلاش ہے  
دنیا کو تلاش جس کی ہمیں اس تلاش سے کیا  
ہمیں اک خدا اور پھر اک ناخدا کی تلاش ہے  
(مریم ماہ نمبر..... لاہور)

ادائے حسن کی تاثیر بھی کیا ہوتی ہے  
چہرے کے رہ جاتی ہے دل کی جو صدا ہوتی ہے  
شغنی، چشم، حیا پوش، خم ابرو تو بہ  
کبھی پرکیف حسینوں کی ادا ہوتی ہے



مراد وجود ہے تشنہ طویل عرصہ سے تصور میں جو آتے ہیں جاں اپ نہ فدا ہوتی ہے بڑے صبر و تحمل کا وقت ہے اسے دوست ہو جام و صوبہ سامنے پھر کس سے قضا ہوتی ہے صورت حسن پہ کیوں کر نہ فدا ہو امتیاز ہر ادا ان کی قیامت کا نشان ہوتی ہے (ایس امتیاز احمد.....کراچی)

شام تھے جو خاموش مٹی سی رہتی ہیں جاگتی سرکیں کچھ نہ کچھ تو کہتی ہیں جن کا دھوکہ لے ڈوبا تسکین مری! یاد کی دیکھ آنکھیں اب کیوں بہتی ہیں اس کے ایک کھلونے سے جو کھیلنا تھا اب بھی سائیں نام اسی کا لیتی ہیں رات مرے ارمان کو کھائے جاتی ہے جانے آنکھیں مڑ مڑ کے کیا مکتی ہیں یادوں کے بستر پہ جب بھی سوتا ہوں تیز ہوائیں روح پہ دستک دیتی ہیں کتنی پاگل ہیں فکر کی آنکھیں بھی دیواروں سے دل کی باتیں کہتی ہیں (چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

دیکھتی ہیں میری آنکھیں نظارے کیسے کیسے آشیان سے اٹھتے ہیں نظارے کیسے کیسے جان بوجھ کے بھی نہیں ملتا وہ مجھے زمانے میں مہرباں ہیں ہمارے کیسے کیسے نہیں گدگد تھ سے بے وفائی کا ہمیشہ تقدیر میں اپنی ہیں انگارے کیسے کیسے نظروں سے دور جا کے بھی تو خوش رہنے چاہتے ہیں آسمان پہ ستارے کیسے کیسے بدھیتی ہے میری تیرے ستم سہتا ہوں تیری مسکراہٹ کے ہیں نظارے کیسے کیسے زندگی بھی ہم نے داؤ پہ لگا دی ہے جاوید چمن میں پھول مکتے ہیں پیارے کیسے کیسے (محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

تم سے بچھڑے ہیں تو جانی ہے دنیا کی منتی ہر سانس یہاں آفت، ہر گھڑی ہے مصیبت کون کہتا ہے کہ بچھڑنے سے آتی ہے یاد میں کی ہمارے دل کو تو آج بھی ہے تم سے وہی عقیدت رقص بسمل ہو، زہریلا اہل یا سولی ہو کوئی اس کی آب و تاب وہی کہ یہ ہے داوی بہت ایک پل کے دیدار پر، سو جائیں کردوں فدا یہی ہے دستور وفا، یہی ہے نقضائے الفت (افصی رباب.....فیصل آباد)

اپنی تہائی کا احساس دلاؤں کیسے جو مرے دل پہ گزرتی ہے بتاؤں کیسے کند ذہنوں سے سیاهی کو مٹاؤں کیسے راہ سیدھی میں زمانے کو دکھاؤں کیسے سونے لگتا ہوں تو پلکیں یہ چمک جاتی ہیں اپنی آنکھوں میں تیرے خواب چھاؤں کیسے میرا شیوہ ہے فقط سب سے محبت کرنا دل میں نفرت کی میں دیوار اٹھاؤں کیسے بھول سکتا ہوں زمانے کی نوازش، لیکن میرے محبوب، تیرا پیار بھلاؤں کیسے (شرف الدین جیلانی.....بندوالہ یار)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ وعدہ جنمنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ جو لطف مجھ پر تھے بیشتر وہ کرم تھا میرے حال پر مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں وہ ہر اک بات پر روٹنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو کبھی ہم میں تم میں چاہ بھی کبھی تم کو بھی ہم سے راہ بھی کبھی ہم تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے ادا

یہی ہوں دلیر با تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (محمد وارث آصف.....والہ پٹھان)

نے لی انگڑائی پھر یاد تمہاری آئی بادل کیا آئے پھر یاد تمہاری آئی نے دل کو سمجھایا کہ نہ جانا اس پار کبھی سے موسم بدل گیا پھر یاد تمہاری آئی آنکھوں کے سارے منظر کچی کچی ہو گئے آنکھوں سے نکلے پھر یاد تمہاری آئی رنگ زندگی ہے رنگوں سے عاری عاری دل کو دیکھ کر پھر یاد تمہاری آئی جینا بھی کیا جینا ہے اس سے بہتر مرجانا ہے مٹا چروں کو دیکھ کر پھر یاد تمہاری آئی (عثمان غنی.....پشاور)

لوگوں پہ اکثر عشق کے حلقے ہوتے رہتے ہیں شاعر ستارے رہتے ہیں اور گلے ہوتے رہتے ہیں محبوب کے جاکر وہ بچوں کی مٹیں کرتے ہیں یاد یار کی خاطر وہ تو بیکہ ہوتے رہتے ہیں جانی کے لحاظ میں وہ تو دیدے پھاڑے پھرتے ہیں غم سے غلے پہلے ہو کر رکتے ہوتے رہتے ہیں محبوب کے چھ چھ عاشق آپس میں مل بیٹھیں تو تو میں میں ہوتی ہے اور دنگے ہوتے رہتے ہیں شاعر کو کتاب پر کرنے کو نہ چھوڑیں ایک بھی عامل یہ ہوں خو خالی کردار کہہ کنگے ہوتے رہتے ہیں مجھ کو علی جی قصوں کو اب اپنی بھی کچھ بات کہوں پڑ بھی پاگل پن کے اکثر حلقے ہوتے رہتے ہیں (محمد علی چغتائی.....خیر پور نامیالی)

سے گلے ہیں اسے مجھ پر بھروسہ نہیں اسے سوچ کر ہم نے بھی روکا نہیں اسے قص بھی چاند ستاروں سے یہ پوچھے کون سی وہ رات جب سوچا نہیں اسے

الفاظ تیر بن کر اتر رہے ہیں دل میں سننے رہے چپ چاپ عی ٹوکا نہیں اسے فاریہ یہ محبت نہیں اصول وفا ہے کہ ہم جان تو دیں گے مگر دھوکا نہیں اسے (فاریہ تبسم.....ٹھیک موز قصور)

عشق اگر تجھ کو جناب ہو جائے ہجر کا تو بھی نواب ہو جائے روز مر مر کے تو جیسے اے منیر لمحہ لمحہ تیرا عذاب ہو جائے جسے تو چاہے زندگی کی طرح وہ اور آنکھوں کا خواب ہو جائے تو اے ڈھونڈتا رہے ہر دم ختم تیرا بھی شباب ہو جائے اے تو دیکھے ہزار آنکھوں پہرہ مگر اس کا سراب ہو جائے آنکھ میں تیرے ہو جو آنسو عشق میں وہ بھی تیزاب ہو جائے تو بنائے فرشتہ اس کو مگر منیر وہ بھی خراب ہو جائے پھر مقدر تیرا بھی اے میرے ہدم جام و ساغر شراب ہو جائے (منیر احمد ساغر.....میاں پٹوں)

عجب لڑکی تھی رہتی تھی بس خیالوں میں وہ ضرب کرتی تھی تقسیم کے سوالوں کو کلاس روم میں پنسل تلاش کرتی تھی وہ بھول جاتی تھی لگا کے اس کو بالوں میں اس کی آنکھوں سے با ظہر تھی ہر اک بات پیچھے وہ بند رہتی تھی دل کے ہزار تالوں میں وہ پیار چھوٹوں سے عزت بڑوں کی کرتی تھی نہ میں بچوں میں آسکا نہ عمر والوں میں اب بھی اگر حسینوں کے چہرے نہ پڑھے احسان تو ہم نے کیا سیکھا زندگی کے اتنے سالوں میں

(احسان محرم..... زادے خیلا نوالہ۔ میانوالی)  
فصل جسم پر تانی ہے کرب کی چادر  
ہم اہل درد سے پوچھ کہ زندگی کیا ہے  
وہ میرے دل کی ستوں میں حلوں کی خاطر  
فصل جسم میں کتنے شکاف کرتا ہے  
وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لئے  
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اٹھالیا مجھے  
ابھی سے میرے رونگر کے ہاتھ تھکنے لگے  
ابھی تو چاک میرے رخ کے سلعے بھی نہیں  
دکھ کی یکسانیت سے یہ لگتا ہے  
ایک رات پلٹ کے آتی ہے  
(محمد ذوال..... ضلع صوابی)

نہ پوچھ مجھ سے میری داستان  
تمہارے آنسو چھلک پڑیں گے  
یوں نہ چینیو بچوں سے ان کی خواہش  
کہ وہ ہمارے بگ پڑیں گے  
ایک تم ہو کہ ہماری طرف دیکھنا گوارہ نہیں کرتے  
مگر یہ جان لو ہم اگر بازار میں نکلے تو چہرے چھل پڑیں گے  
ہمیں پتہ ہے تو کسی اور سے ملتا ہے  
مگر ہر دل سے نکال کر ہم یہ دیکھنے سے جل پڑیں گے  
رضا یہ زمانہ ہے کہ لئے نہیں دیتا ہمیں  
کیونکہ اگر ہم ملے تو ان کے آنسو نکل پڑیں گے  
(سکندر علی رضا..... فیصل آباد)

اندروں سے . میں ٹوٹ گیا ہوں  
اذیت سے میں چھوٹ گیا ہوں  
تجائی عشق کی ایسی پھیلی  
وقت سے پہلے میں لوٹ گیا ہوں  
اب میں تم سے نہیں بولوں گا  
جاؤ تم سے میں روٹھ گیا ہوں  
دل بدن جگر جل رہا ہے  
عشق میں کھا گہری میں چوٹ گیا ہوں  
سننے پہ یوچھ ہے سانس پھول گئی ہے

دم گھٹنے سے میں چھوٹ گیا ہوں  
تیرے بے رخی سے سہ کر گیا ہوں  
ارمانوں کا گلا میں گھونٹ گیا ہوں  
پیار و محبت میں جنگ جاتز ہے ذاکر  
پیار میں بول پہلا میں جھوٹ گیا ہوں  
(محمد ذاکر..... ہلاں آزاد کشمیر)

محرم کے اس تپتے سفر میں.....  
دخم چور چور اور دل غزدہ ہے.....!  
تپش سورج نے جلا دیا ہے انگ انگ.....  
نڈھال ہوں درنیدہ بھی.....!  
چلا تھا کوئے یار میں.....!  
بھڑکا کچھ اس طرح کہ.....!

راستوں نے دھوکہ کچھ یوں دیا.....!  
آنکھوں کی بینائی اور نور قلب چمن چکا.....!  
فلّاح کی تلاش میں رخت سفر باندھا تھا میں نے.....!  
کچھ اپنوں کا ساتھ تھا کچھ اپنے بن سے گئے تھے.....!  
آغاز یوش کی مانند.....!  
سفر کے ہر لمحے میں، میرا دل مطمئن رہا.....!  
پھر کچھ یوں پھرتے کہ ہمیشہ کو چھپ گئے.....!  
قالہ لیتا گیا، دل چل گیا، دھم بڑھتا گیا.....!  
کچھ دھم اپنوں نے یوں لگائے.....  
شنے سے مٹ نہ پائیں..... اک حصہ یوں کٹا کہ.....!  
آج تک جڑے میں نہ آیا.....!

بھوک اور مفلسی کا دور کچھ یوں آن پڑا.....!  
میرے قافلے کا ہر فرد بکرا رہتا.....  
میں چیخ رہا، گزرا تار با.....!  
عصمتیں لیں، چادر میں چھینیں.....!  
خون یوں نکھرا..... جیسے پانی ہو.....!  
غیرت کے نام سرکٹ گئے.....!  
آسمان روتا رہا زمین بکتری رہی.....!

(مدثر بخاری..... شہر سلطان)  
☆☆

میں اک درد اٹھا ہو جیسے  
لوگ رستے میں ٹھہر جاتے ہیں  
کوئی مجھ سے جدا ہو جیسے  
تم کہاں جاؤ گے، سوچو محسن  
دل بھرنے پہ یوں محسوس ہوا  
لوگ تھک ہار کے گھر جاتے ہیں  
جنگ پتوں کی صدا ہو جیسے  
(انتخاب: ساحل دعا بخاری..... بھیر پور)

دل کی ایک سزا ہو جیسے  
دعوت کی راہ پہ ہوں محو سفر  
جو کو منزل کا پتہ ہو جیسے  
تمہارے آنے کے انتظار میں  
رفیق نکھرا ہے خیالوں کا میرے  
گزار لی یونہی زندگی میں نے  
ہتیر ٹوٹ گیا ہو جیسے  
عشق کے حسین خیالوں میں  
جس کو جی بھر کے بھی دیکھا نہیں  
سنواری زندگی میں نے  
تمہارے آنے کی خوشی میں  
لج سے ہر بار ملا ہو جیسے  
گرجیاں دیکھ رہا ہوں رانا  
دل پہ تھر سا گرا ہو جیسے  
بہت دیر کروی آنے میں  
اب تو شادی کرنی میں نے  
(قدیر رانا..... راولپنڈی)

نہیں ہے بھروسہ کسی آدمی کا  
زمانے میں کوئی نہیں ہے کسی کا  
محبت میں دیکھے دھوکے ہی دھوکے  
بہاں پیار بچا نہیں ہے کسی کا  
بالے مجھے اندھیری نگر سے توں مولا  
بہاں دیا جلا نہیں زندگی کا  
(نمیر احمد ساغر..... مہاں چنوں)  
نہیں ہے بھروسہ کسی آدمی کا  
زمانے میں کوئی نہیں ہے کسی کا  
محبت میں دیکھے دھوکے ہی دھوکے  
بہاں پیار بچا نہیں ہے کسی کا  
بالے مجھے اندھیری نگر سے توں مولا  
بہاں دیا جلا نہیں زندگی کا  
(نمیر احمد ساغر..... مہاں چنوں)

جس دنیا سے گزر جاتے ہیں  
ایسا کرتے ہیں، مر جاتے ہیں  
دل جو ٹوٹے تو سر محفل بھی  
بال بے وجہ بکھر جاتے ہیں  
لب نہ دیکھو میری ہنسی آنکھیں  
تڑپتے دریا تو اتر جاتے ہیں  
دھمپ کا روپ دہانے والے  
ظلم کو اور ٹھہر جاتے ہیں  
لب نہ مڑ مڑ کے پکارو ان کو  
جس دنیا سے گزر جاتے ہیں  
ایسا کرتے ہیں، مر جاتے ہیں  
دل جو ٹوٹے تو سر محفل بھی  
بال بے وجہ بکھر جاتے ہیں  
لب نہ دیکھو میری ہنسی آنکھیں  
تڑپتے دریا تو اتر جاتے ہیں  
دھمپ کا روپ دہانے والے  
ظلم کو اور ٹھہر جاتے ہیں  
لب نہ مڑ مڑ کے پکارو ان کو

یہ دل دیتا دہائی ہے  
کبھی کبھانوں کو بھی بارش آئی ہے  
(ساجدہ راجا..... ہندوا سرگودھا)

جلوؤں کی خیرات بھی ہوگی  
پھول کھلیں گے بات بھی ہوگی  
شام ڈھلے گی رات بھی ہوگی  
یادوں کی برسات بھی ہوگی  
نینوں سے جب نین ملیں گے  
انکھوں کی بارات بھی ہوگی  
جب آؤ گے پاس ہمارے  
تم سے دل کی بات بھی ہوگی  
جو بازی تم کھیل رہے ہو  
اس بازی کو مات بھی ہوگی  
میرے افسانے میں بارو  
شامل اس کی ذات بھی ہوگی  
شب بھر میرے ساتھ رہو گے  
راشد ایسی رات بھی ہوگی  
(راشد ترین..... مظفر گڑھ)

تو نے اچھے دنوں کے تھے سننے بنے  
تو نے اب تک بنائے تھے جو بھی ملے  
جن چوں پہ تو نے تھاکیہ کیا  
وہی پتے ہوا آج دینے لگے  
تو نے دیکھے تھے جو  
خواب اچھے برے  
تیرے خوابوں کی تعبیر ایسی ہوئی  
میرے امتیاز تو  
تو تو آحق ہوا  
تو تو پاگل ہوا  
اس زمانے میں ڈھونڈتا ہے وفا  
(ایس امتیاز احمد..... کراچی)  
☆☆



# واصل جہنم

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

جنگل میں داخل ہونے والوں کے سامنے اچانک چند دیوہیکل بندر آگئے انہوں نے جدید رائفلیں اٹھا رکھی تھیں ان کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے جیسے انگارے برس رہے تھے اور جب ان بندروں کے منہ سے آواز نکلی تو اچانک.....

ظلم و بربریت کی انتہا پر مبنی جسم و جاں پر لگی طاری کرتی خونخوار اور حیرت انگیز کہانی

وہ ایک ہولناک رات تھی۔ بار بار گر بنے والے بادل فضا کا دل دہلا رہے تھے، بجلی یوں چمک رہی تھی جیسے تہرین کرٹھ پڑنا چاہتی ہو۔ بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ پورا گاؤں تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ٹکلیڈ اپنے شوہر فرخان کا ہاتھ تھامے پاگلوں کی طرح یوں بھاگ رہی تھی جیسے اس کے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں خوفناک بلائیں لگی ہوں۔ وہ اس لئے کوکس رہی تھی جس لئے اس نے شکار کا پروگرام بنایا تھا۔

یہ واقعہ دراصل کچھ یوں تھا کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ایک میگزین میں جنگلات کے بارے میں مضمون چمپا۔ جس میں اس گاؤں میں واقع جنگل کا ذکر بھی موجود تھا۔ یہاں ہرن کی کثرت پائے جاتے تھے۔ ٹکلیڈ نے ضد کی کہ وہ بھی اس جگہ جانے گی اور وہ ہرن کا شکار کریں گے۔ اس کا شوہر فرخان جو کہ خود بھی شکاری تھا۔ اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر دوسرے روز ہی ٹکلیڈ اور دوطرفہ رفاقت اور شاہنواز سمیت جنگل کے قریب واقع گاؤں میں پہنچ گیا۔ جنگل گاؤں کے مشرقی حصے میں واقع تھا۔ انہوں نے جنگل کے قریب کچھ فاصلے پر دو خیمے گاڑے، سفر کی تسکین زیادہ تھی اس لئے شکار کا پروگرام کل پر موخر کر دیا گیا۔ شام ہوتے ہی

اندھیرا پھیل گیا، موسم کے تیور بدل گئے۔ اور گر بن چک کے ساتھ موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ اسی وقت گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ فرخان نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا نصف درجن گھڑ سوار جن کے ہاتھوں میں جدید طرز کی رائفلیں اور چہرے پر نقاب موجود تھا۔ ”کیا بات ہے آپ لوگ کون ہیں اور اس طرح رائفلیں لے کر ہمارے خیمے کے سامنے آنے کا کیا مطلب ہے؟“ فرخان نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے ایک گھڑسوار سے پوچھا۔ ”میرا نام شیرا ہے۔ اس علاقے پر چوہدری حاکم یار کی حکومت ہے اس کی اجازت کے بغیر یہاں پر نہ وہ بھی رہیں مار سکتا۔ تم چوہدری حاکم یار سے اجازت لئے بغیر جنگل میں شکار کرنے آ گئے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اس علاقے میں داخل ہوتے ہی چوہدری کی حویلی میں جاتے۔ اس سے یہاں قیام کرنے اور شکار کھینچنے کی اجازت لیتے۔ اب ایسا کرو تم سب شرافت سے ہمارے ساتھ حویلی چلو، چوہدری کے سامنے تمہاری ڈشٹی ہے۔“ گھڑسوار دنگ سبجے میں بولا۔

اچانک فرخان کا ملازم رفاقت ہاتھوں میں رائفل تھامے اپنے خیمے سے باہر نکلا۔ ابھی اس نے



رائٹل کا رخ گھڑسواروں کی طرف کیا ہی تھا کہ شیرانے  
فائر کر دیا۔ رفاقت سینے پر گولی کھا کر چیخے ہوئے زمین  
پر گر اور ساکت ہو گیا۔

”خبردار کوئی غلط حرکت تمہاری بیوی کو پیوہ  
بنا سکتی ہے۔ جاؤ خیمے سے اپنی بیوی کو لے کر باہر آؤ۔“  
شیرا اس بات کی طرف پھٹکا۔

اسی وقت شاہنواز پھرتی سے اپنے خیمے سے باہر  
نکلا اور اپنے ہاتھوں میں تھامی رائٹل کا رخ شیرا کی  
طرف کر کے فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ شیرا کے  
جوانی فائر نے شاہنواز کو بھی زندگی سے محروم کر دیا۔ گولی  
اس کی پیشانی میں لگی تھی۔ فرقان حیرت و استعجاب کے  
عالم میں یوں کھڑا تھا گویا اسے سکتا ہو گیا ہو۔

”جلدی جاؤ اپنی بیوی کو خیمے سے باہر لے  
آؤ۔“ شیرا کے دھمکی آمیز لہجے نے فرقان کو سکتی  
کیفیت سے باہر نکالا۔ فرقان پلٹ کر تیزی سے اپنے  
خیمے میں داخل ہو گیا۔

شکیلہ خیمے میں خوفزدہ کھڑی تھی۔ اس کا پورا وجود  
خزاں رسیدہ تھے کی طرح کپکپا رہا تھا۔ فرقان نے اندر  
آتے ہی ایک طرف رکھا اپنا شکاری خنجر اٹھایا اور پھیلی  
طرف سے خیمے کو چھری سے چیرا اور شکیلہ کا ہاتھ پکڑ کر  
جنگل کی سمت دوڑنے لگا۔

گھڑسواروں کو جلد ہی ان کے فرار کا علم ہو گیا۔  
وہ ان کے پیچھے پاگل کتوں کی طرح گھوڑے دوڑاتے  
ہوئے پیچھے لگ گئے۔

گر جتنی برستی بارش میں وہ گرتے پڑتے گئے  
جنگل میں داخل ہو گئے۔ اچانک شکیلہ ٹھوکر کھا کر  
گر پڑی۔ فرقان اسے سنبھالنے لگا۔ شکیلہ کو اٹھنے میں  
وقت ہو رہی تھی۔ اس کے بائیں گھٹنے میں شدید چوٹ  
لگی تھی۔ ”فرقان مجھ سے اب بھاگ نہیں جائے گا۔“  
شکیلہ کے لہجے میں بے جا رنج تھی۔

فرقان نے شکیلہ کے زخم کا جلدی سے معائنہ  
کیا۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اسی لمحے گھوڑوں کی  
ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ فرقان نے پلٹ کر خوفزدہ

نظروں سے مڑ کر گھڑسوار ڈاکوؤں کی طرف دیکھا۔ انھیں  
یہی لمحہ اس کے لئے حیران کر دینے والا تھا۔ شیرا انھیں اس  
کے سامنے گھوڑے روکے ساکت سامنے کھڑے تھے۔  
”شیرا اب کیا ہوگا؟ یہ تو جنت کی حدوں میں  
کھڑے ہیں، ہم آگے نہیں جاسکتے، چودہری نے اپنی  
حیثیت کو زندہ لانے کو کہا ہے اسے کوئی بھی نہیں مار سکتا۔“

ایک نقاب پوش خوفزدہ لہجے میں شیرا سے کہہ رہا تھا۔  
نقاب پوش کے بلند آواز میں کہے گئے غلط  
ایک طرف فرقان کو ٹولی دے رہے تھے کہ وہ ڈاکو اب ان  
کے تعاقب میں نہیں آئیں گے۔ دوسری طرف فرقان کو ان  
اضطراب میں بھی مبتلا کر رہے تھے کہ جنت کی حدود کا  
مطلب کیا ہے؟

”گھڑسوار جنت سے اتنے خوفزدہ کیوں  
ہیں؟“ ہمت کر کے اس نے شکیلہ کو اپنی ہاتھوں میں  
اٹھالیا اور گھٹنے جنگل میں مزید آگے بڑھنے لگا۔ ”رک  
جاؤ آگے ہم سے بھی بڑا خطرہ موجود ہے۔“ شیرا چلا کر  
بولا مگر فرقان نے اس کی بات پر کان نہ دھرے آگے  
بڑھتا چلا گیا۔

کچھ دور جاتے ہی اچانک جنگل میں درختوں کی  
شہنشاہ چننے کی آوازیں آئیں۔ پھر قدموں کی چاپ  
سنائی دی۔ قدموں کی پراسرار آوازیں ان دونوں کو  
خوفزدہ کر رہی تھیں۔ ان کے دل تیزی سے دھڑکنے  
لگے۔

”بخ ٹھنڈی ہوا چلنے کے باوجود انہیں خوف  
سے پسینہ آنے لگا۔ پانچ منٹ بعد ہی چاروں طرف  
سے جھاڑیوں سے بن ماس کی طرح قوی بھیل درختوں  
بھر بندرنگل کر انہیں گھیرنے میں لے چکے تھے۔ ان  
بندروں کی سرخ گھورتی آنکھیں بد صورت چہرے اور  
بدن سے اٹھتی ہوئی دونوں کو خوفزدہ کر رہی تھی۔ شکیلہ  
کے چہرے کا رنگ انہیں دیکھ کر قہقہہ ہو گیا تھا۔ حیرت کی  
بات یہ بھی کہ ان بندروں کی کلائیوں میں عجیب ساخت  
کی گھڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مزید حیران اور خوفزدہ  
کروینے والی بات بندروں کے ہاتھ میں موجود اقلیم

تھیں جن کا رخ ان کی طرف تھا۔ بندر دھیرے دھیرے  
بات کھپاتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رفتہ  
رفتہ بندروں کا گھیرا ان کے گرد جنگ ہونے لگا۔ ڈراور  
وقت سے دونوں کی حالت بری ہو رہی تھی۔ بھاگنا بھی  
کے لئے ممکن نہ تھا۔ بندر انہیں چاروں طرف سے  
گھیرے میں لے چکے تھے۔

اچانک ہی انہیں زمین اپنے پاؤں تلے سے  
ٹھٹکی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ خوف سے ان کی ریڑھ  
کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی۔ وہ بات ہی حیرت اور  
ظلم میں مبتلا کر دینے والی تھی۔ ان درجن بھر بندروں  
میں سے سب سے دراز قد بندر کا منہ کھلا اور وہ  
کہہ کر آتی ہوئی انسانی آواز میں بولا۔ ”دائیں بائیں  
پہنچو مڑے بغیر سیدھے چلتے رہو۔ تمہیں حاتم کے  
خود پیش ہونا ہے۔“

”کک..... کون..... حاتم..... ہمیں جانے  
..... پلیر! ہمارے پیچھے چودہری کے غنڈے لگے  
..... ہم جان بچانے کے لئے..... غلطی سے ادھر  
آگے ہیں.....“ فرقان خوف سے کھلاتے ہوئے بولا۔  
”بکواس بندر کرد اور سیدھے چلو۔“ بندر اسے  
اٹھائی کی نال سے دھکیلتے ہوئے کھڑکھاتی ہوئی انسانی  
آواز میں بولا۔

فرقان خوف کے مارے کپکپاتی ٹانگوں سے  
شکیلہ کو ہاتھوں میں اٹھائے بندروں کے گھیرے میں  
آگے بڑھنے لگا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ خوف کے  
مارے کسی بھی لمحے گر کر بے ہوش ہو جائے گا، اس کے  
قوم بھٹکل آگے بڑھنے لگے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے  
بعد سفر کے بعد ان کے سامنے ایک وسیع و عریض  
ماریات آ گئی۔ بیرونی گیٹ کھلا ہوا تھا۔ بندر تیزی سے  
انہیں گھیرے میں لئے عمارت میں داخل ہو گئے۔  
کوریڈور میں جگہ جگہ انسانی جسم کی ہڈیاں بکھری پڑی  
تھیں۔

اچانک فرقان کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر شکیلہ  
سے گریزا۔ فرقان نے اٹھتے ہوئے نیچے پڑی چیز کو

دیکھا جس سے اسے ٹھوکر لگی تھی۔ ایک انسانی کھوپڑی  
تھی۔ گوشت پوست سے محروم کھوپڑی دیکھتے نہ اس  
کے قدم لڑکھڑائے اور وہ دوبارہ نیچے پڑی شکیلہ پر گر کر  
بے ہوش ہو گیا۔ شکیلہ اس سے پہلے ہی خوف کی زیادتی  
سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ بندر دیکھ کر آگے بڑھے  
ایک نے فرقان کو کندھے پر اٹھایا دوسرے نے شکیلہ کو  
اٹھالیا۔ بندروں کا قافلہ کوریڈور میں چلتا ہوا دائیں  
سمت کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں بھی انسانی  
ہڈیاں اور چند انسانی کھوپڑیاں پڑی تھیں۔

کمرے میں بائیں سمت ایک الماری رکھی تھی۔  
ایک بندر نے الماری کھولی اور ہاتھ ڈال کر کوئی سوچ  
آن کیا۔ کمرے کی دیوار تقریباً چار فٹ کے قریب سرک  
گئی۔ اب نیچے کی طرف سیڑھیاں جاری تھیں اندر  
داخل ہو کر دراز قد بندر نے چیمٹ میں کوئی چیز تلاش کی  
اور دروازہ بند ہو گیا۔ دیوار اپنی جگہ پر آچکی تھی۔ چاروں  
طرف روشنی پھیل گئی۔ روشنی پھیل جانے کی وجہ سے  
ہر چیز واضح طور پر نظر آرہی تھی، بندر انہیں اٹھائے  
ہوئے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگے، سیڑھیاں  
اترنے کے بعد وہ ایک وسیع ہال میں داخل ہو گئے،  
وہاں ہر طرح کا فرنیچر اور دوسرا سامان موجود تھا۔  
گویا یہاں رہائش کا مکمل انتظام تھا۔

ہال میں جگہ جگہ انسانی ڈھانچے لٹک رہے  
تھے۔ دائیں سمت ایک کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ مقفل  
تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک مٹن نصب تھا۔ ایک  
بندر نے مٹن دبایا اور کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک  
ہال نما کمرہ تھا۔ جس میں نصف درجن کے قریب لوہے  
کے بیڈ پڑے تھے۔ جن کے ساتھ ذخیریں منسلک  
تھیں۔

کمرے کے وسط میں ایک ادھیر عمر کا ورڈی جسم  
کا مالک ڈاکٹروں والا گاؤں پہنچے کھڑا تھا۔ گہری سانولی  
رنگت اور چہرے کے بد نما داغ اس کے چہرے کو  
بھیاں بنا رہے تھے۔ ایک طرف بڑی میٹری نما میز پر  
سرجیکل آلات رکھے تھے۔ ”انہیں بیڈ سے باندھ دو۔“



بد صورت شخص نے بندروں کو شکم دیا۔

حیرت انگیز طور پر بندروں نے اس کی بات سمجھ لی، چند ہی لمحوں میں فرقان اور شکلیہ بیڑ سے بندھے پڑے تھے۔ وہ شخص سر جھل میز کی طرف بڑھا۔ میز کے قریب ہی ایک ٹرائی پر ایک کمپیوٹر رکھا تھا جس کی روشنی اسکرین پر عمارت کے باہر کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے میز سے ایک سرخ اٹھائی اور باری باری ان دونوں کو انجکشن لگادیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ دونوں ہوش میں آ کر خوف زدہ نظروں سے بد صورت شخص اور بندروں کے ٹوٹے کود کھڑے ہوئے۔

”تم کون ہو اور ہمیں اس طرح یہاں کیوں لایا گیا ہے اور یہ کس قسم کے بندر ہیں جو انسانوں کی طرح بولتے ہیں کھلیں یہ بھوت تو نہیں؟“ فرقان نے ہوش میں آتے ہی اس شخص سے سوالات کئے۔

”میرا نام ڈاکٹر حاتم ہے، اس وقت تم جہاں موجود ہو، یہ ایک جدید ترین تجربہ گاہ ہے، اب تم پوچھو گے کہ میں کس قسم کے تجربے کرتا ہوں؟ تو سنو! مجھے اپنے علاوہ ہر انسان سے نفرت ہے۔ زمین پر ہر قسم کے فساد کے ذمہ دار یہ انسان ہیں۔ میرا مشن ہے جس حد تک ہو سکے انسانوں کا خاتمہ کر کے انہیں بندر بنادوں۔ میں انسان کے دماغ بندر کی کھوپڑی میں منتقل کر دیتا ہوں۔ ویسے بھی انسان اور بندر کے جسم کی بناوٹ تقریباً ایک جیسی ہی ہے۔ دماغ کی منتقلی کے بعد مشینی طریقے سے بندر کی آواز میں تبدیلی کر دیتا ہوں پھر بندر کے ساؤنڈیکس میں انسانی آواز ریکارڈ کر دیتا ہوں۔ اس کام میں، میں نے اس قدر مہارت حاصل کی ہے۔ جو ناقابل یقین ہے۔ یہ درجن بھر بندر جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ میری مہارت اور قابلیت کا ثبوت ہے۔ دماغ کی منتقلی کے آپریشن کے بعد نہ صرف انسانوں کی طرح بول سکتے ہیں بلکہ ذہن انسانوں کی طرح سوچتے بھی ہیں۔ یہ میرے حکم پر بلا جھجک عمل کرتے ہیں۔ یہ میری پوجا کرتے ہیں۔ اب تک میں میں کے قریب بندروں کو اپنے کامیاب تجربات سے انسان بنا چکا ہوں

اس وسیع عمارت کے نیچے بہت بڑا میٹ ورک ہے تاکہ ہر ایک کو سوج بھی نہیں سکے۔

ایک حصے میں زیر زمین جنت ہے جو میری اپنی تخلیق ہے۔ اس میں درجنوں کی تعداد میں دنیا بھر سے لائی گئی حسین ترین لڑکیاں ہیں۔ خوب صورت تالاب ہیں۔ جن میں خود کا رنوار سے نصب ہیں۔ میرا جب دل چاہتا ہے حسین ترین لڑکیوں کی رفاقت میں وقت گزارتا ہوں اور قانون کو مطلوب انجانی خطرناک ترین مجرم جو قانون سے بھاگتے پھرتے تھے۔ میں نے انہیں یہاں پناہ دی۔ ان کا برین واش کیا۔ وہ بھی اب یہیں رہتے ہیں اور میری پوجا کرتے ہیں۔ وہ اپنا مذہب ترک کر چکے ہیں۔

فی الحال اس جنگل میں میری حکومت ہے، چوہدری حاکم یار خان سے میرا معاہدہ ہے کہ وہ یا اس کا کوئی بھی ہر کارہ ایک حد سے آگے جنگل میں نہیں آئے گا جو اس حد سے آگے آ یا اس کا انجام برا ہوتا ہے۔ ان جو میری فرمانبرداری کرتا ہے اس کے لئے میرے بہت سے انعامات ہیں۔“ وہ بولتا چلا گیا۔

”لیکن اس جنگل میں تمہارے اخراجات کبے پورے ہوتے ہیں؟“ فرقان اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”انسانی جسم بہت بڑا خزانہ ہے۔ دماغ کی منتقلی کے بعد بھی انسانی جسم میرے لئے ناکارہ نہیں ہوتا۔

دل، گردے، آنکھیں محفوظ کر کے منہ بانی قیمت پر فروخت کر دیے جاتے ہیں۔ اس کام میں شہر کے بہترین اسپتال کے تین ماہر سرجن میرا ساتھ دیتے ہیں۔ جن کا قیام اکثر جنت میں ہی ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر حاتم ہڈیانی بلی ہنسا۔ ”نمبر دو تم لوگ اب جاؤ اور جانے ہوئے ان سرجنوں سے کہہ جانا کہ آؤ مجھے کتنے بعد آ جائیں۔ جب تک میں آپریشن کی تیاری کرتا ہوں۔“ ڈاکٹر حاتم نے ایک بندر کو ہدایت دیں۔ بندر فرقان کو عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے تجربہ گاہ سے باہر نکل

”دیکھا! جاتے ہوئے بندر کتنی خوشی سے تمہیں دیکھ رہا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ان بندروں کو انسانی گوشت کا عادی بنادیا ہے، موت کے بعد تمہارا جسم ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ تمہارے گوشت سے دعوت اڑائیں گے۔ جان بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ میرے غلاموں میں شامل ہو جاؤ اور جنت کے حوزے لوٹو۔ اب بتاؤ مجھے سجدہ کرتو گے یا؟“ ڈاکٹر حاتم نے اپنا جملہ ادھر اچھوڑتے ہوئے کہا۔

”مسلمان صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ تمہارے جیسے کتنے ہی شیطانوں نے مسلمانوں کو ہکانے کی کوشش کی مگر جہاد ویرانہ ہو گئے۔ تمہارا انجام بھی یہی ایک ہوگا۔“ فرقان بڑے لہجے میں بولا۔

شدت جذبات سے اس کے سینے سے پگھلا رہا پھوٹنے لگیں ڈاکٹر نے فرقان کو انجکشن لگا دیا، فرقان کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ شکلیہ خوفزدہ نظروں سے ڈاکٹر حاتم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے ایک عجیب ساخت کی مشین تھمیت کر فرقان کے بیڑ کے قریب کی اور مشین سے منسلک تاریں فرقان کے جسم کے مختلف حصوں سے منسلک کر دیں اور سرجری کے آلات لے کر فرقان کے جسم کے ساتھ کارروائی شروع کر دی۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور دو مہنگے اوجیز عمر کے افراد تجربہ گاہ میں داخل ہوئے۔ ان دونوں نے بھی ڈاکٹر والے گاموں پہن رکھے تھے۔ اندر آتے ہی ان دونوں نے ڈاکٹر حاتم کو فری سجدہ کیا۔ ”ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر جشد سب انتظامات مکمل ہیں جلدی سے میرا ہاتھ بٹاؤ پھر جنگل سے کسی صحت مند بندر کو بھی لاتا ہے تاکہ اس کا دماغ اس کی کھوپڑی میں منتقل کیا جاسکے۔“ ڈاکٹر حاتم نے حکم دیا۔

وہ تینوں فرقان کے جسم کی چیر پھاڑ کر رہے تھے شکلیہ خوفزدہ نظروں سے کارروائی دیکھتے ہوئے چیخ و پکار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر خوف سے اس کی حالت بری ہو رہی

تھی۔ تقریباً تین گھنٹوں بعد فارغ ہو کر وہ کا پتی چینی شکلیہ کی طرف بڑھا۔ اس نے شکلیہ کے جسم کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔

”یہ تمہارے گھٹنے میں چوٹ کیسے لگی؟“ ڈاکٹر کے لہجے میں تاسف تھا۔ ”ہم چوہدری کے ہر کاروں سے جان بچا کر بھاگ رہے تھے کہ میں گر کر زخمی ہو گئی۔“ شکلیہ روتے ہوئے بولی۔ خوف سے اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ رہا تھا۔

”افسوس تم زخمی ہو ورنہ جنت میں رہنے والی لڑکیوں میں شامل ہوتیں۔ وہاں رہنے والی لڑکیاں جسٹانی خانی سے مبرا ہیں اب میں تمہیں تحفے میں اپنے بھائی حاکم یار کے حوالے کر دوں گا۔ میں اسے فون کرتا ہوں کہ جنگل کے اعتدالی حصے میں میرے بندے تمہیں اس کے حوالے کریں گے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور ایک انجکشن اس کے بازو میں لگا دیا تو شکلیہ کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

شکلیہ کو ہوش آیا تو خود کو ایک آرام وہ بستر پر پایا۔ اس نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ تہہ خانے میں داخل ہونے کا واحد راستہ ایک دروازہ تھا جو اس وقت متغی تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک ہٹا کٹا شخص عجیب سی ہیئت میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں دو راکٹل برادر شخص تھے۔ جو شکل سے ڈاکٹر کو لگ رہے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں ان کے چہرے کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ ہٹا کٹا شخص شکلیہ کو حریف نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”تم اور تمہارا شوہر کیا سمجھتے تھے کہ میرے جیسے ہوئے لوگوں سے بچ جاؤ گے۔ میرا بڑا بھائی ڈاکٹر حاتم مجھ سے بھی بڑا درندہ ہے۔ تم چوہدری حاکم کا شکار ہو۔“ چوہدری نے تعجب لگایا اور شیطانی ارادے سے شکلیہ کی طرف بڑھا۔

شکلیہ نے مزاحمت کی کوشش کی تو چوہدری نے اس کے چہرے پر پھین مارنے شروع کر دیے۔ شکلیہ چیخنے چلانے لگی تو چوہدری نے چینی چلاتی شکلیہ کے کپڑے پھاڑ کر اسے رہنہ کر دیا۔ شکلیہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی



مگر اس کی ایک نہ چلی۔ کچھ دیر بعد وہ شرمناک حالت میں حسرت و یاس کی تصویر بنی ایک طرف بکھری پڑی سبک رہی تھی۔

”اب تم لوگوں کی باری ہے۔ اس کے بعد اس کی لاش جنگل میں پھنکوا دینا۔“ اپنے کارندوں سے پہ کھتا ہوا چوہدری تہہ خانے سے باہر چلا گیا اور شیطانی کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔ وہ دونوں شیطان شکیلہ کو اپنے جسم تلے روندنے لگے۔ شکیلہ کی چیخوں سے تہہ خانہ گونگ اٹھا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری احسان ایک شریف اور نیک سیرت انسان تھا۔ اس کے دونوں بیٹے جاکم اور حاتم اس کے برعکس ظالم بے رحم اور شیطان صفت تھے۔ چھوٹا بیٹا حاکم۔ مڈل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کا پسندیدہ مشغلہ گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھانا، گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو بے عزت کرنا تھا جبکہ بڑا بیٹا حاتم اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا، وہ بہت ذہین تھا۔ میٹرک سائنس میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ چوہدری احسان نے اثر کے بعد اس کے اصرار پر تعلیم کے لئے بیرون ملک بھجوا دیا۔ بیرون ملک بھی اس کی قابلیت اور ذہانت کی دھوم مچ گئی۔ پھر وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اسے سائنس اور ٹیکنالوجی سے عشق تھا۔ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ دولت کی کوئی کمی نہ تھی، وہ صرف پڑھتا رہا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا برین سرجن بھی تھا اور جیز عمری تک ملک سے باہر رہا۔ خوب دولت کمائی۔ ادھر اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔

وہ ادھیڑ عمری میں داخل ہوا تو ایک نوجوان لڑکی روہی پر عاشق ہو گیا۔ روہی کا تعلق ایک پاکستانی گھرانے سے تھا جو گزشتہ کئی سالوں سے لندن میں مقیم تھا۔ روہی سے ڈاکٹر حاتم نے اظہار محبت کیا اور منہ کی کھائی۔ صاف گور روہی نے اسے آئینہ دکھا دیا کہ چالیس سال کی عمر میں اسے اٹھارہ سالہ لڑکی سے اظہار محبت کرتے

ہوئے شرم آنی چاہئے۔ کچھ ڈاکٹر کی برصورتی کا بھی قصور تھا۔ روہی کی باتیں اس نے دل پر لے لیں۔

اس دوران اس کی ملاقات ایک عالم دین سے ہو گئی۔ انہوں نے اسے نیکی کے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ نیک اور پرہیزگار لوگوں کے لئے جنت میں اعلیٰ مقام ہے۔ اچھا مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان برائی کے راستے سے دور رہے۔ انگریزوں کے نقش قدم پر چلنے والا ڈاکٹر حاتم جو شراب پانی کی طرح پیتا تھا۔ فتنہ لگا کر ہڈیاں ہنسی جتا۔ ”میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اپنی جنت خود بنا سکتا ہوں۔“ اتنا قابل سائنسدان ہونے کے باوجود وہ نیکی اور خطی قسم کا انسان تھا۔ دل میں نہ جانے کیا مانی کہ ایک روز اپنا سب کچھ سمیٹ کر اپنے وطن کے لئے چل پڑا۔

والدین کے انتقال کے بعد تمام دولت جائیداد پر چھوٹے بھائی حاکم کا قبضہ تھا جو سیاست میں حصہ لے کر اپنے حلقہ سے صوبائی الیکشن جیت کر وزیر بن چکا تھا۔

حاتم نے چھوٹے بھائی حاکم سے اپنے حصے کی جائیداد کی رقم لی۔ حاتم کی اپنی دولت بھی بے شمار تھی جو اس نے بیرون ملک کمائی تھی۔

ڈاکٹر حاتم نے درجنوں کی تعداد میں شہر سے تعمیرات کے ماہرین بلوائے، شہر سے ہی ایک قابل انجینئر آیا۔ جنگل میں وسیع رقبے میں کافی گہری کھدائی کروائی گئی۔ اعلیٰ درجے کا سریا منکوا دیا۔ وسیع عریض عمارت تعمیر کی گئی۔ خوب صورت تالاب بنوائے گئے۔ ان تالابوں میں خوب صورت نوارے نصب کروائے۔ اس عمارت کے اوپر مٹی ڈلو کر اسے خفیہ بنا دیا گیا۔ اسی عمارت کے اوپر ایک دوسری عمارت تعمیر کروائی گئی۔ زیر زمین عمارت کو روشن رکھنے کے لئے ہیڈی جنریٹر منکوائے گئے۔ اس پروجیکٹ میں دولت پانی کی طرح بہائی گئی اور پھر عمارت کی تعمیر میں حصہ لینے والے افراد کو ڈاکٹر حاتم نے خفیہ طریقے سے مل کر دوا دیا۔

ڈاکٹر حاتم کا دل ایک لڑکی نے توڑا تھا۔ لہذا اس نے عہد کیا کہ اپنے لئے بنائی گئی خود ساختہ جنت میں ملک بھر سے خوب صورت ترین لڑکیاں منگوائے گا۔ انہی دنوں ایک لڑکی عاشری جو کہ بہت خوب صورت اداکارہ تھی۔ جب وہ سینما اسکرین پر دکھائی دیتی تو فلم چیخوں کے دلوں پر بجلی گر جاتی اس کے نوجوان حسین چہرے کی طرف انہی نظریں واپس پلٹنا بھول جاتیں۔ فلم بین جب اس کا نیم عریاں رقص دیکھتے تو دیوانے ہو جاتے۔ فلمی افق کے اس درخشاں ستارے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لوگ بے چین ہو جاتے۔ مگر سے ٹونک کے لئے نکلنے وقت وہ رنگین شیشوں والی گاڑی استعمال کرتی ایسا وہ سیکورٹی کی وجہ سے کرتی تھی سڑک پر ایک کرلوگ اس کی گاڑی پر ٹوٹ پڑتے تھے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے، اپنے پرستاروں کی اس قدر ہمت کے باوجود وہ مغرور ہرگز نہ تھی۔

سر محفل اپنے درجنوں پرستاروں سے ملتی آٹو گراف دیتی پرستاروں کی فرمائش پر ان کے ساتھ تصویریں تک کھینچواتی تھی۔ اس روز بھی ایک اعلیٰ درجے کی پارٹی میں عاشری شریک تھی۔ اس نے کافی حد تک ٹنک اور چھوٹا لباس پہن کر نمایاں نظر آنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی تھی۔ اس پر پانے والی مردوں کی نظروں میں حسرت اور غوروں کی نظروں میں حسرت تھا۔ وہ تقریب تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اب تقریب اختتام ہونے والی تھی اس وقت وہ ایک گوشے میں تنہا بیٹھی تھی کہ چونک پڑی۔ ایک آدمی نے قدم تاقامت کا نوجوان اس کے قریب آ بیٹھا۔ ”میرا نام فرہاد علی ہے آپ کے لئے ایک بہترین آفر ہے، ہمارے ملک کی ایک نامور شخصیت فلم بنانا چاہتی ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ آپ ان کی فلم میں مرکزی کردار ادا کریں۔“

”دیکھئے اس وقت میرے پاس کافی فلمیں ہیں اب فرصت ملی تو غور کروں گی۔“ عاشری نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”مس عاشری آپ ایک فلم کا معاوضہ بچیں لاکھ لگتی ہیں اس فلم میں مرکزی کردار ادا کرنے کی ہائی بھر تے ہی آپ کو ایک کروڑ روپے دیئے جائیں گے۔ یہ میرا کارڈ ہے جب دل چاہے رابطہ کر لیتا۔“ فرہاد نے اپنا کارڈ اسے دیا۔

دوسرے روز عاشری نے بے اختیار فرہاد علی کو فون کیا۔ ایک کروڑ کی خلیفہ رقم کی آفر نے اس کے ہوش و ہواس اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔

فرہاد علی کا بنگلہ شہر کے ایک پوش علاقے میں تھا۔ فرہاد علی نے اپنے بنگلے میں اس کی خوب آؤ بھگت کی اور ایک کروڑ روپے کا چیک اسے پیش کیا۔ اس دوران ایک ملازم کافی لے آیا۔ کافی پیتے ہی عاشری ہوش کھو بیٹھی۔ اس کے بعد عاشری کو کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ جنگل میں واقع ڈاکٹر حاتم کی خود ساختہ جنت میں پہنچادی گئی۔ کچھ روز اخبارات میں اس کے اغوا کے چرچے ہوتے رہے پھر دنیا اسے بھولتی چلی گئی۔ اسی طرح مختلف طریقوں سے ملک بھر سے درجنوں لڑکیاں اغوا کر کے وہاں پہنچادی گئیں۔ سنگین مقدمات میں ملوث افراد جو قانون سے چھپتے پھرتے تھے انہیں لالچ و دے کر جنگل میں ڈاکٹر حاتم کی تجربہ گاہ میں بھجوا دیا گیا۔ جہاں ڈاکٹر حاتم نے برین واش کر کے اپنا غلام بنالیا۔

☆.....☆.....☆

اسلم، جاوید اور حیدر اس وقت ایک جیب میں موجود تھے، جیب اسلم چلا رہا تھا۔ وہ تینوں آپس میں کزن ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے دوست بھی تھے۔ ان کا تعلق ایک بڑے سیاسی گھرانے سے تھا۔ اس وقت وہ دھار کی غرض سے اس جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ سیدھے چلتے چلتے اسلم نے جیب کو بائیں ست موڑا۔ آگے گھٹا جھجکا تھا۔ جیب جیسے ہی گھٹے جنگل میں داخل ہوئی۔ اسے جیب کو چلانا دشوار ہونے لگا۔ تو اس نے جیب روک دی۔ ”ایسا کرتے ہیں جیب۔ ہمیں روک کر پیدل چلنے ہیں۔“ اسلم نے کہا اور راتل ہاتھ میں تمام کر جیب سے اتر گیا۔ اس کے دوستوں نے بھی اس کی

تھلید کی۔

اب وہ تینوں ہاتھوں میں رائٹلیں تھامے چوکنے انداز سے آگے بڑھ رہے تھے ان تینوں کا تعلق بڑے گھرانوں سے تھا، اس کے باوجود وہ اچھے کردار اور دوسروں کے کام آنے والے انسان تھے۔ وہ چلتے ہوئے گھنے جنگل میں گھستے چلے گئے، ابھی انہوں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ انسانی سمت سے کوئی شے ان کے جسموں میں پیوست ہوگئی انہوں نے اگر کچھ محسوس کیا تو صرف جسم پر سوئی کی نوک جیسی جھین پھروہ تینوں ہوش سے بچانے ہو گئے۔

انہیں ہوش آیا تو انہوں نے خود کو لوہے کے بیڈوں پر زنجیروں سے بندھا پایا، انھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے، ان کے بدن زنجیروں سے اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ ان کا پلٹنا بھی مشکل تھا۔ اس ہال نما کمرے میں عجیب و غریب قسم کی مشینیں موجود تھیں۔

قریب ہی ڈاکٹروں والا گاؤں پہنچے ڈاکٹر حاتم کھڑا تھا۔ ڈاکٹر حاتم کے قریب دو دراز قد بندر کھڑے سرخ سرخ آنکھوں سے ان تینوں کو دیکھ رہے تھے ان آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی، بندر انہیں دیکھتے ہوئے بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ ”یہ سب کیا ہے تم نے ہمیں کیوں اغوا کیا ہے؟“ اسلم نے پوچھا۔

”میں ہوں ڈاکٹر حاتم، جنت کا خالق جہاں ہر قسم کا عیش و آرام، درجنوں کی تعداد میں حسین لڑکیاں ہیں اگر تم مجھ کو خدا مان کر سجدہ کرو تو اس جنت میں رہو گے ورنہ تم بھی دوسروں کی طرح میرے تجربے کا شکار ہو جاؤ گے۔ جو بہت ہی خوفناک ہے۔ میں انسان کا دماغ بندر کی کھوپڑی میں منتقل کر دیتا ہوں۔ ویسے بھی انسان اور بندر کے جسم کی بناوٹ تقریباً ایک ہے۔ اس کے بعد مشینی طریقے سے بندر کی آواز میں تبدیلی کرو دیتا ہوں پھر بندر کے سادہ ٹیکس میں انسانی آواز ریکارڈ کرتا ہوں۔ اس کے بعد انسان کا دل، آنکھیں، گردے نکال کر محفوظ کر لئے جاتے ہیں، بھلا جانے جانے

والے جسم کو یہ میرے آدم خور بندر کھا جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف بول سکتے ہیں بلکہ ہر قسم کا اسلحہ بھی مہارت سے چلا سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر حاتم کی باتیں سن کر ان تینوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھتے ہوئے ہاتھوں کی طرح قبضہ لگایا اور کیپڑ کا ایک ٹکڑا دبا کر ٹائیک میں بولا۔ ”نمبر تھری اندر آؤ۔“ خود کار دروازہ کھلا اور ایک بندر اندر داخل ہوا۔

حیرت انگیز طور پر بندر نے اندر آتے ہی ڈاکٹر حاتم کو سجدہ کیا اور کھر کھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرے لئے کیا حکم ہے؟“

”ڈاکٹر کا امران اور ڈاکٹر جشید کو بلاؤ۔“ ڈاکٹر حاتم نے اسے حکم دیا۔ بندر سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ ”نمبر تم تینوں مجھے سجدہ کرو گے یا نہیں۔“ ڈاکٹر حاتم سرد لگا ہوں سے انہیں نکلنے لگا۔

”ہم تمہاری شعبہ بازیوں سے ڈرنے والے نہیں۔ تم چاہو تو ہمیں جان سے مار دو مگر ہم اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔“ اسلم اور اس کے ساتھی ایک زبان ہو کر بولے۔

اسی وقت ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر جشید اندر داخل ہوئے ڈاکٹر حاتم نے حیدر کو آنکھیں لگا دیا۔ حیدر کی آنکھیں بند ہونے لگیں ان تینوں جلا دھشت ڈاکٹروں نے حیدر کے جسم کو تختہ مشق بنالیا۔ تھوڑی دیر بعد جاوید اور اسلم کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔ ڈاکٹر حاتم حیدر کی کھوپڑی کا اوپری حصہ الگ کر رہا تھا۔ تینوں ڈاکٹر قصائیوں کی طرح حیدر کے جسم پر نشتر چلا رہے تھے۔ اسلم اور جاوید خوف اور دہشت سے چلانے لگے انہیں اپنی اپنی بھیانک موت صاف نظر آ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یاسر اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھی الٹل ٹرے میں سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ یاسر نے زندگی میں کبھی سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ گزشتہ روز سے



اس کی جتنی حالت نہایت اترتی تھی اس کے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ یاسر کا تعلق آری سے تھا۔ وہ فوج کا ولیکر کاٹھ تھا۔ ایک روز اس کے دل میں نہ جانے کیا سہائی کہ اس نے فکری دوستی کے ایک ویٹکی میگزین میں اپنا تعارف اور فون نمبر شائع کر دیا۔ تعارف شائع ہونے کے کچھ روز بعد اسے ایک لڑکی نے کال کی اور اپنا نام سیرا بتاتے ہوئے دوستی کی پیشکش کی۔ یاسر لڑکی کی خوب صورت آواز پر سرمٹا۔ دونوں گفتگوں فون پر باتیں کرتے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان ملاقاتوں میں دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں ان کی اس لواستوری کی زندگی بہت مختصر تھی۔

سیرا کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔ اس کے والد محسن صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑی بہن خوشی ایک حساس ادارے کی افسر تھی اور سیرا یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ سیرا نے ملنے ملانے کا سلسلہ چاک مطلق کر دیا۔ اس کا نمبر بھی آف رہنے لگا۔ یاسر دن میں کئی بار اس کے موبائل نمبر پر ٹرائی کرتا۔ مگر ہر بار اس کی سماعت سے آواز نہ نکلتی۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے برائے مہربانی کچھ دیر بعد کال کیجئے۔“ مگر اس کے باوجود وہ روزانہ اس کے موبائل نمبر پر دن میں سیکڑوں بار ٹرائی کرتا۔ بالآخر ایک روز اسے سیرا کا موبائل نمبر آن ملا۔ پہلے تو اس نے یاسر کی کال ریسویسی نہ کی بلکہ خرابی دیر بعد اس نے کال اٹینڈ کی۔ ”کیا بات ہے سیرا تم اچانک ہی غائب ہو گئیں تمہارا نمبر بھی آف تھا۔ اب جبکہ تمہارا نمبر آن ملا ہے تو کال ریسویسی کر رہی ہیں۔ کیا تم مجھے بھولنے کی کوشش کر رہی ہو۔“ یاسر نان اسٹاپ بولنا چلا گیا۔

”سوری یاسر! تم مجھے بھول جاؤ۔ میرے گھر والوں نے میری شادی کر دی ہے اب میں کسی اور کی امانت ہوں، آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ سیرا کے الفاظ یاسر کے دل میں خنجر کی طرح اتر گئے۔

”سیرا میں نے تو دوستی کے پہلے روز ہی کہہ دیا

تھا کیوں بناتی ہو ریت کے تاج محل، سب ٹوٹ کر کھر جائیں گے۔ آج کہتی ہو تم میرے ہو، کھنکھراتا ہوا بھول جاؤ گی۔

اور تم نے مجھے جوابی Sms کیا تھا۔ Hills Can fly, Rivers can dry, you can forget me, but never can. شدت جذبات سے یاسر کی آواز بھرانے لگی۔

”یاسر اب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں اب میں سیرا حماد ہوں۔“ سیرا نے بے رحمی سے رابطہ منقطع کر دیا۔ یاسر کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ گھر والوں کے لاکھ پوچھنے پر وہ کچھ بتانے کو تیار نہ تھا۔ واصل اس کے اور سیرا کے گھر والے دونوں کی محبت سے لاعلم تھے۔ سیرا کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے وہ آکٹا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کے دماغ میں پھر باضی کی برچھائیاں رقص کرنے لگیں، زندگی کے چند خوشگوار لمحوں کی برچھائیاں، اب اس کی زندگی ایک اذیت ناک موڑ پر آچکی تھی، وہ محسوس کر رہا تھا کہ زندگی بھران پر چھائیاں سے چھچھانیں چھڑا سکے گا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اس کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازے کی سمت دیکھا۔ اس کی والدہ اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ”لینے رہو۔“ انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“ والدہ نے غرما میٹر سے اس کا نمبر پکڑ لیا۔ ”ایک سو تین بخار ہے اور تم کہہ رہے ہو معمولی بخار ہے چلو ڈاکٹر کے پاس۔“

”نہیں امی! کوئی ٹیبلٹ دے دیں، میں ٹیبلٹ کھا کر سو جاؤں گا۔“ والدہ نے بخار کی دو ٹیبلٹ اسے کھلائیں۔ ”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”نہیں امی، میں اب سوؤں گا مجھے نیند آ رہی ہے۔“ یاسر نے بھانے کیا اور اس کی ای اثبات میں سر

ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ والدہ کے جانے کے بعد اس کے ذہن پر خیالات کی یلغار ہو گئی۔ سوچتے سوچتے وہ بے خبر ہو گیا۔

اچانک کسی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے آنکھیں کھول کر آواز کی سمت دیکھا آواز کھڑکی کی طرف سے آ رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر کسی کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ یاسر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اٹھ کر بلب روشن کیا۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لئے حیرت انگیز تھا۔ کھڑکی میں سیرا کھڑی تھی وہ بے تاب سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔

اچانک سیرا غائب ہو گئی۔ یاسر نے اپنی آنکھوں کو مسلا اسی دوران اس کی انگلیاں اپنی پیشانی سے مس ہوئیں، اس کی پیشانی آگ کی طرح جل رہی تھی، اسے بہت تیز بخار تھا، وہ چلا کر گر کر اور ہوش و حواس سے عاری ہو گیا۔

☆-----☆-----☆

چوہدری حاکم بیڈ پر گھڑاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے شراب پی رہا تھا اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی تقریباً نیم عریاں حالت میں بیٹھی سسک رہی تھی۔ سولہ سال انشیں ایک غریب کسان کی بیٹی تھی جسے چوہدری کے کارندے زبردستی اغوا لائے تھے۔ اس کے والدین اور بھائی نے مزاحمت کی تو چوہدری کے حکم پر اس کے کارندوں نے ان تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور انشیں کو اٹھا کر جوٹلی لے آئے جہاں چوہدری نے اس کی عزت لوٹی، انشیں اپنی لٹی ہوئی آبرو کا تمام کر رہی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اب چوہدری اسے اپنے کارندوں کے حوالے کر دے گا۔

گاؤں کی لڑکیوں کی چوہدری اور اس کے خوار یوں کے ہاتھوں بربادی کی داستانیں اس نے سن رکھی تھیں۔ اسے اپنا ہولناک انجام صاف نظر آرہا تھا۔ اسی وقت چوہدری کا موبائل فون بجا۔ دوسری طرف گاؤں کے تھانے کا اے ایس آئی شاگرد تھا۔

”چوہدری صاحب غضب ہو گیا۔ گزشتہ دروز

پہلے تین نوجوان شکار کے لئے جنگل گئے اور لاپتہ ہو گئے۔ آج صبح ایک کھڑا لڑکیاں کاٹنے جنگل گیا، اسے تین لاشیں دکھائی دیں، اس کا کہنا ہے کہ لاشیں ناقابل شناخت اور زیادہ گوشت سے محروم ہیں۔ اگر یہ لاشیں ان نوجوانوں کی تھیں تو غضب ہو جائے گا۔ ان کا تعلق ایک بڑے سیاسی گھرانے سے ہے۔ میڈیا والوں نے دیے بھی ان کی کشیدگی پر ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، اوپر سے بھی نکلے پرکائی دباؤ ڈالا گیا ہے، ہم آپ کے حکم پر گئے جنگل کے اس حصے میں نہیں جاتے جہاں جانے سے آپ نے منع کر رکھا ہے۔ مگر آئی جی صاحب کے حکم پر ایس پی شہر یار صاحب تفتیش کے لئے یہاں آ رہے ہیں وہ با اصول اور ایماندار افسر ہیں اس کے علاوہ ان کا تعلق بارسوخ خاندان سے ہے وہ آئی جی صاحب کے داماد بھی ہیں اگر وہ تفتیش کرتے ہوئے گئے جنگل میں مخصوص مقام تک چلے گئے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ آپ کے بھائی حاکم صاحب کا ٹھکانہ ان کی نظروں میں آجائے۔“ شاگرد اللہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

”گھبراؤ مت میرا بھائی کوئی کیورت نہیں جو تیرا ایس پی اسے پکڑے گا۔ وہ چوہدری حاکم کا بھائی ہے، اس وقت تو کہاں ہے۔“ چوہدری نے پوچھا۔

”میں سرخ پارتی کے ہمراہ جنگل جا رہا ہوں۔“ شاگرد اللہ بولا۔

”ٹھیک ہے تم جنگل پہنچو میں بھی آتا ہوں، ہو سکے تو لاشیں غائب کرادو۔“ چوہدری نے کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

چوہدری کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات نمایاں نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کی پولیس تو اس کی زرخیز تھی اگر ایس پی شہر یار تفتیش کے لئے گاؤں آجاتا تو گریز ہو جانی گاؤں کے لوگ اگرچہ اس کے ڈر سے خاموش تھے لیکن اگر کسی نے زبان کھول دی تو اس کے سیاسی کردار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چوہدری نے اپنے دست راست شیرا دیکر چار کارندوں کو بلا کر صورتحال

سے آگاہ کر کے گاڑی تیار رکھنے کا حکم دیا۔

چند منٹ بعد ہی ان کی جیب تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ اے ایس آئی شاکر سمیت پانچ پولیس اہلکار جا رہے تھے۔ میڈیا کے چند افراد بھی وہاں موجود تھے۔ جو ہدیری تیزی سے شاکر اللہ کی طرف بڑھا اور اسے لے کر میڈیا والوں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ "شاکر اللہ تمہیں چاہئے تھا کہ میڈیا والوں کے پیچھے سے پہلے لائش غائب کر ادا دیتے۔" "جو ہدیری نے دانت پیٹتے ہوئے کہا۔

"جو ہدیری صاحب آج کل میڈیا بہت فاسٹ جا رہا ہے ہمارے پیچھے سے پہلے میڈیا والے جائے وقوع پر پہنچ چکے تھے۔" شاکر اللہ نے اپنی صفائی پیش کی۔ "جو ہدیری اسے گھورتا ہوا لاشوں کے قریب جا پہنچا۔ وہ لائش ڈھانچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں، ہڈیوں کے شجروں سے زیادہ تر گوشت غائب تھا۔ لاشوں کی حالت دیکھ کر جو ہدیری جیسے ظالم انسان کی حالت بھی غیر ہو گئی۔

احسانک جو ہدیری چونکا ایک نوجوان اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس رپورٹر کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ شہزاد نای یہ پولیس رپورٹر ایک بڑے اخبار سے وابستہ تھا۔ "جو ہدیری صاحب یہ علاقہ آپ کے حلقہ میں شامل ہے آپ کا یہاں بہت اثر رسوخ ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس علاقے میں کیا ہو رہا ہے؟ ہم نے سنا ہے گزشتہ کچھ عرصے سے یہاں اس قسم کی بہت ہی لائش ملی ہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس سے پہلے جو لائش ملیں ان کے مقدمات کیوں درج نہیں ہوئے؟" رپورٹر کے سوالات پر جو ہدیری کو ساپ سونگہ گیا۔

"دیکھئے مسٹر! ابھی ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوگا تب ہی پتہ چلے گا کہ ان کی موت کی وجوہات کیا ہیں۔ پھر ڈی این اے ٹیسٹ ہوگا تا کہ معلوم ہو سکے یہ تینوں کون تھے، آپ خود دیکھ رہے ہیں یہ صرف ہڈیوں کے شجر ہیں۔"

جو ہدیری کو رپورٹر کے گھرے میں دیکھ کر اسے

ایس آئی شاکر اللہ، اس کی مدد کو لپکا۔ "ایچا آفیسر میں چلتا ہوں یہ درنگی دیکھ کر میری حالت خراب ہو رہی ہے۔" جو ہدیری بہانہ بنا کر وہاں سے کھٹک گیا۔

☆.....☆.....☆

حماد کا روزنامہ کرتے ہوئے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر اس کی جوان سال بیوی سمیرا بیٹھی تھی۔ دونوں کی شادی گزشتہ ماہ ہوئی تھی۔ سمیرا حماد کی کزن تھی۔ حماد کے والد حسین صاحب کی گاؤں میں تھوڑی سی زمین تھی جس سے ان کی گزر بسر ہو رہی تھی حماد بی اے کرنے کے بعد باپ سے مدد کر کے روزگار کے سلسلے میں دہلی چلا گیا۔ اس کے دہلی جانے کے اخراجات حسین نے اپنی آدمی سے زائد زمین فروخت کر کے پورے کئے۔ حماد دس سال دہلی میں رہا اس دوران اس نے اچھا خاصا کمالیا تھا۔ اس کے والد کا شہر جانا ہوا۔

خوشی کی بہن سمیرا کو دیکھ کر اپنے بیٹے حماد کے لئے پسند کر لیا۔ حماد اور سمیرا دونوں کزن تھے۔ لہذا چٹ مٹنگی اور پٹ بیاہ کے مصادیق اگلے ماہ حماد کے پاکستان آتے ہی دونوں کی شادی ہو گئی۔ سمیرا مشرقی لڑکی تھی لہذا اس نے کسی قسم کا احتجاج کئے بنا ہی بھرنی تھی۔ شادی کے بعد سمیرا نے باپ کو بھلانے کی ممکنہ کوشش کی، وہ دونوں ہی مومن کے لئے پہاڑی علاقے میں چلے گئے اس وقت وہی مومن سے فارغ ہو کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے سمیرا پہلی بار گاؤں اپنے سرسراں جاری تھی۔ ابھی ان کی گاڑی گاؤں کی حدود سے کچھ فاصلے پر تھی کہ ہلکی ہلکی بوند باندی ہونے لگی۔ حماد نے دائیں چلا دیے۔ "کہیں بارش تیز نہ ہو جائے۔" سمیرا نے خندے کا اظہار کیا۔

"فکر مت کرو گھنٹے بھر کا سفر باقی ہے اکثر یہاں ایسے ہی ہوتا ہے بس بوند باندی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دو تین بار بارش بھی ہوئی لیکن ہلکی سی۔" حماد بولا۔

لیکن ایسا ہوا نہیں حماد کی توقع کے برخلاف جب ان کی گاڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی گرج

جبک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ "لو بارش تو بھی ابھی تیز ہونا تھا۔ سر براہزد دینے کے چکر میں ابوکو فون بھی نہیں کیا، اب سگنل کام نہیں کر رہے۔" حماد موبائل فون کی اسکرین دیکھتے ہوئے بولا۔ بارش کی وجہ سے اس نے گاڑی کی رفتار کم کر رکھی تھی۔ ہیڈ لائٹس زیادہ دور تک کام نہیں کر رہی تھیں۔ "بارش رکتی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔" حماد بڑبڑایا۔ اس کا خیال اس بار درست ثابت ہوا بارش مزید تیز ہو گئی۔

اچانک سامنے سے ایک جیب آتی دکھائی دی۔ حماد نے گاڑی سائیڈ پر روکی۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک کافی ناہموار تھی۔ جیب ان کی گاڑی کے قریب آ کر رک گئی۔ حماد نے جیب کی طرف دیکھا۔ جو ہدیری حاکم اپنے چار حواریوں سمیت جیب میں موجود چوبیس نظروں سے سمیرا کو دیکھ رہا تھا۔ "دینی آتے ہی شادی کرنی حماد بابو، ہمیں بلایا تک نہیں۔" چلو ہم خود ہی ملنے آ جاں گئے۔" جو ہدیری نے قہقہہ لگایا۔

"جو ہدیری صاحب ابو نے شادی کے سلسلے میں جلدی کی تھی اور ہماری شادی بھی شہر میں ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کو دعوت نہ دے سکے۔" حماد معذرتی لہجے میں بولا۔

"او سانوں کوئی گلا نہیں فیئر ملاں گے۔" جو ہدیری نے کہا اور اس کی جیب آگے بڑھ گئی۔ حماد نے گاڑی اشارت کی۔ "یہ نمونہ کون تھا ویسے شکل سے تو بد معاش لگتا تھا۔" سمیرا ہنسی لہجے میں بولی۔

"ہمارے گاؤں کا جو ہدیری ہے۔" حماد نے مختصر جواب دیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے گھر پر موجود تھے۔ حماد کے والدین نے بھوک خوب آؤ بھگت کی۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ صبح ان کی آنکھ دیر سے کھلی ابھی وہ ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ حسین صاحب نے دروازہ کھولا۔ دروازے میں شیرا سمیت جو ہدیری

کے نصف درجن کارندے موجود تھے۔ وہ دیدہ دلیری سے حسین صاحب کو دھکیلتے ہوئے گھر میں گھستے چلے گئے۔ "ادبوس بھی بولوں جو ہدیری کا دل اس چوکری پر کیوں آ گیا، یہ تو چاند کا کٹلا ہے، سن ادبواؤ، آج اسے رات کو حویلی بھیجا دینا یہ جو ہدیری حاکم کا حکم ہے۔" شیرا نے ان پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" حماد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ حماد کی طرف کر دیا۔

"رکو بیٹا! یہ نادان ہے سمجھتا نہیں یہ رات کو آئے تھے سفر کی تھکن ہے، میں کل خود ہی بھوکھو لی لے آؤں گا۔" حسین صاحب مصلحت بھرے لہجے میں بولے۔

"بوڑھا سمجھدار ہے، اور سن کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔" شیرا نے حسین صاحب کو تنبیہ کی اور سرح افراد کے ہمراہ گھر سے نکل گیا۔

"ابو آپ نے اس خبیث بے ایسا وعدہ کیوں کیا؟" حماد کی پیشانی عرق آلود تھی۔

"ایسا میں نے انہیں ہانکے کے لئے کیا ہے، ہم آج رات ہی یہ گاؤں چھوڑ کر فرار ہو جائیں گے۔" سارا دن ان کا پریشانی میں گزرا پریشانی کے عالم میں وہ بھوکے رہے۔ جب معصیت انسان کے سر پر کھڑی ہو تو نہ ہی بھوک لگتی ہے نہ نیند آتی ہے۔ وہ چاروں بھوکے پیاسے جاگتے رہے اور رات میں دے قدموں گھر سے باہر نکلے، نصف شب کا وقت تھا، حسین صاحب اور حماد نے سوٹ کیس ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ حماد کی والدہ اور سمیرا نے چہرے چاروںوں سے ڈھانپ رکھے تھے ان کی گاڑی گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی وہ گاڑی کے قریب جیسے ہی پہنچے، جو ہدیری کے کارندے اندھیرے میں کہیں سے اچانک نمودار ہو گئے۔ وہ شیرا سمیت چھ افراد تھے جنہوں نے جدید طرز کی رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ "میں نے کہا تھا نا کہ ہوشیاری مت دکھانا، جو ہدیری کبھی اپنے شکار سے غافل نہیں رہتا، تم نے بھاگنے کی کوشش کر کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اب چلو



چوہدری کے سامنے۔ وہ ان چاروں کو رانٹلوں سے دھکیلنے لگے۔ شیرا نے سیرا کو اٹھا کر چیپ کی پچھلی سیٹ پر پھینکا، دو رانٹل بردار جلدی سے اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے، انہوں نے سیرا کو اس طرح دیوبچ لیا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔

”چھوڑو اسے۔“ حماد بچھڑ کر ایک رانٹل بردار سے لپٹ گیا تو دوسرے نے رانٹل کا بٹ حماد کے جڑے پر مارا۔ حماد کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی وہ لبو لہان ہو گیا۔

”اسے مت مارو۔“ حسین صاحب شیرا کے قدموں میں گر گئے۔ شیرا کے روکتے روکتے رانٹلوں کے بٹوں سے حماد کی اچھی خاصی مرمت ہو چکی تھی۔

”چلو تم لوگ اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھو۔“

شیرا اور اس کے ساتھیوں نے حماد اور والدہ کو ان کی گاڑی کی پچھلی سیٹوں میں دھکیلا ایک رانٹل بردار ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ شیرا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے حویلی کی طرف دوڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں انہیں بے دست و پا کرنے کے حویلی پہنچا دیا گیا۔ شیرا چلتی ہوئی سیرا کو تہہ خانے میں بند کر آیا جبکہ حماد اور اس کے والدین کو حویلی کی عقبی سمت لے جایا گیا۔

چوہدری اس جگہ موجود مچھو کو تادوے رہا تھا کہ ایک جگہ خندق نما بوا سا گڑھا کھدایا تھا۔ تین صحت مند قسم کے افراد گڑھے سے نکلے والی مٹی کے ڈھیر کے پاس کھڑے تھے۔ تینوں نے اپنے ہاتھوں میں پیلے پٹڑے ہوئے تھے۔ ”حاکم کے حکم سے جہیں انکار کی ہمت کیسے ہوئی۔“ چوہدری چلا یا۔

”چوہدری اللہ سے ڈرو اس کی لٹھی بے آواز ہے۔ جب تیرے سر پر پڑے گی تب تو اپنے برے افعال برے کاموں، بوجھلے گناہوں پر پھٹتے گا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔“ حسین صاحب گھمبیر لہجے میں بولے۔

چوہدری چراغ پا ہو گیا۔ ”ان تینوں کو زندہ فون

کردو۔“ مسلح افراد نے رانٹلوں کے بٹوں سے ان تینوں کو مارنا شروع کر دیا کچھ دیر بعد وہ تینوں زمین پر ادھ موئے پڑے تھے۔ حماد اور اس کے والدین کو گھسیٹ کر گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ چوہدری کے اشارے پر گڑھے میں مٹی ڈالنی شروع کر دی گئی۔ کچھ ہی دیر میں گڑھا مٹی سے بھر گیا وہ تینوں اس گڑھے میں زندہ دفن ہو چکے تھے۔

اب چوہدری کا رخ تہہ خانے کی طرف تھا جہاں بے بس سیرا قید تھی۔ ادھر سیرا تہہ خانے میں قید اندیشوں میں گھری ہوئی تھی۔ چوہدری کی ظالمانہ فطرت کا اسے اندازہ ہو چکا تھا اپنی عزت اور زندگی اسے خطرے میں نظر آ رہی تھی اس ویران تہہ خانے میں اس کا کوئی انسان مددگار نہ تھا۔ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا۔

”جہاں کوئی انسان مدد کو نہ پہنچ سکتا ہو۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں۔ اسی ذات پاک نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچایا، وہی اللہ ہے جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو چھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا۔ اسی پاک پروردگار نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں محفوظ رکھا۔“

سیرا جس نے زندگی میں نماز نہ پڑھی تھی۔ اس کی والدہ نے زبردستی اسے نماز پڑھنا سکھا یا تھا۔ وہ تہہ خانے میں ایک طرف نیت کرنے کے بعد نماز پڑھنے لگی۔ سجدہ میں جاتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

نماز پڑھنے کے بعد اس نے سلام پھیرا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ”یا اللہ میری مدد فرما۔ جس طرح تو نے حضرت ابراہیم کو آگ سے محفوظ رکھا۔ جس طرح تو نے حضرت یوسف کی کنوئیں میں حفاظت فرمائی۔ جس طرح تو نے حضرت یونس کو چھلی کے پیٹ میں محفوظ رکھا۔ یا اللہ میری عزت کو اس ورنڈے سے محفوظ رکھ۔“ وہ روتے ہوئے دعا کر رہی تھی۔

اسی وقت چوہدری حاکم عجیب ہیٹ میں اندر داخل ہوا۔ اندر ٹیبل میسر کے دعا کے الفاظ اور اس کے رونے کی آواز اور بیٹے آنسوؤں کو دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تیرے شوہر اور ساس سر کو زندہ زمین میں دفن کر کے آ رہا ہوں۔ اس تہہ خانے میں کتنی لڑکیوں کی عزت میں نے بربادی کی۔ اب تیری باری ہے۔ دیکھتا ہوں تیرا خدا تجھے کیسے پھانسا ہے۔“ وہ شیطانی ارادے سے سیرا کی طرف بڑھا۔

”کون کہتا ہے کہ اللہ نہیں سنتا۔ وہ سچے دل سے مانگی ہر دعا قبول کرتا ہے مظلوم کے آنسو عرش کو ہلادیتے ہیں۔“

اچانک ان دونوں کے درمیان ایک بیولہ سا نمودار ہوا جس نے رفتہ رفتہ ایک خوب صورت لڑکی کی شکل اختیار کر لی! چوہدری اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی پلکوں تک نے جھپکنا بند کر دیا تھا۔

”سیرا تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے جلدی سے باہر بھاگ جاؤ کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔ حویلی کا ہر فرد پتھر کا بت بن چکا ہے۔ تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔ ایک گھنٹہ تک یہ پتھر کے بت بنے رہیں گے۔“ نمودار ہونے والی لڑکی نفرتی آواز میں بولی۔

”آپ کون ہیں؟“ سیرا نے ہمت کر کے پوچھا۔

”سیرا نام نکلیہ ہے۔ اسی تہہ خانے میں اس ورنڈے نے مجھے بھی برباد کیا تھا۔ آج تم نے سچے دل سے اللہ کو پکارا تو اللہ کی رحمت جوش میں آ گئی۔ تمہاری مدد کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ اب وقت ضائع مت کرو۔“ ندرخ نے کہا اور سیرا بھاگتی ہوئی تہہ خانے سے باہر نکلے۔ وہ تیزی سے تہہ خانے سے باہر نکل کر کورڈور میں بھاگ گئی۔ کورڈور میں نصف درجن افراد ساکت کھڑے تھے وہ گیٹ تک جا پہنچی گیٹ پر بھی دو مسلح افراد بت کی طرح ساکت تھے۔ وہ حویلی سے نکل کر بھاگ گئی۔ وہ دو یوانوں کی طرح دوڑ رہی تھی۔

دوڑتے دوڑتے وہ جنگل میں داخل ہو گئی۔

جب وہ گھنے جنگل میں داخل ہوئی تو صبح کے چھ بج رہے تھے۔

اچانک کسی شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا داییں سمت جھاڑیوں سے ایک قد آور شیر دھاڑتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں سیرا پر جمی ہوئی تھیں۔ سیرا خوف سے اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی شیر نے اپنا پیٹ زمین سے لگایا اور سیرا پر جست لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ خوفناک موت شیر کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔

☆.....☆.....☆

ایس پی شیر یار نصف درجن پولیس اہلکاروں کے ہمراہ جنگل میں تفتیش کے لئے آیا ہوا تھا۔ یہ وہی مقام تھا۔ جہاں سے اسلم اور اس کے دو ساتھیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ لاشوں کے ناقابل شناخت ہونے کی وجہ سے DNA ٹیسٹ کر دیا گیا۔ ٹیسٹ سے ثابت ہو گیا کہ لاشیں اسلم اور اس کے ساتھیوں کی ہیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ چونکا دینے والی تھی۔ لاشوں کے جسم سے دماغ، دل، گردے، آنکھیں سرجری کے ذریعے نکال دی گئی تھیں، مرنے سے پہلے انہیں بے ہوش کیا گیا تھا۔ ”یہ کام کسی ورنڈے یا عام انسان کا نہیں کسی ماہر سرجن کا ہے۔“ شہریار کا دماغ ان ہی خطوط پر درست سوچ رہا تھا۔

سوچنے کے دوران وہ اپنے ارد گرد سے غافل ہو گیا۔ اس غفلت کی اسے بھاری قیمت چکانی پڑی، انجانی سمت سے آنے والی کوئی شے ان کے جسموں میں پیوست ہو چکی تھی۔ وہ سب اپنے ہوش کھو بیٹھے۔

ایس پی شہریار کو ہوش آیا تو اس نے اٹھنا چاہا مگر ناکام رہا اس کے ہاتھ پاؤں لوہے کی زنجیروں کی مدد سے آہنی بیڈ سے بندھے پڑے تھے۔ اس ہال کمرے میں عجیب مینشیں پڑی تھیں۔ ایک ایڈیٹر عمر کا شخص ہاتھوں میں سرجیکل آلات لئے اس کے قریب کھڑا تھا۔ ”کون ہو تم اور میری فورس کے فوجوان کہاں ہیں؟ جنگل میں تم نے ایسا کیا کیا تھا جو ہم سب سیکنڈوں



میں بے ہوش ہو گئے؟“ شہر یا رہے خونی سے اس سے پوچھنے لگا۔

”تم دس گھنٹے بعد ہوش میں آئے ہو۔ اس دوران تمہارے ساتھی اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں، ان کے دل، گردے، آنکھیں اور دماغ، سر جری کے ذریعے نکال دی گئیں اور گوشت آدم خور بندر کھا گئے۔ اب تمہاری باری ہے۔“ ڈاکٹر حاتم نے تہقید لگایا۔

اس کی بات سن کر ایس پی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ”تم نے جنگل میں ہمارے ساتھ کیا کیا تھا؟“ ایس پی نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے تجربہ گاہ سے کچھ فاصلے پر ایسا جدید سسٹم نصب کیا ہے کہ تجربہ گاہ کی حدود سے ایک کلومیٹر سے بندہ جب ہماری حدود میں داخل ہوتا ہے تو ہمیں علم ہو جاتا ہے۔ اس سسٹم میں یہ خوبی ہے کہ چھوٹے جانوروں اور پرندوں کی آمد پر مکمل موصول نہیں ہوتے صرف انسانوں اور بڑی جسامت کے جانوروں کی آمد پر متحرک ہوتا ہے۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بے ہوش کرنے کا مکمل میرے غلام بندروں کا ہے۔ جو نہ صرف انسانوں کی طرح بول سکتے ہیں بلکہ انسانوں کی طرح سوچتے سمجھتے ہیں۔ یہ پرستم کا ہتھیار چلانا جانتے ہیں ان بندروں کی کلائی پر مخصوص ساخت کی گھڑی موجود ہے جس میں چھوٹی اور باریک سوئی نصب ہے گھڑی کا رخ مطلوبہ فرد کی طرف کر کے گھڑی کا پین دبایا جاتا ہے۔ سوئی گھڑی سے نکل کر مطلوبہ فرد کے بدن میں پیوست ہو جاتی ہے اس سوئی میں انسان کو سیکنڈوں میں بے ہوش کر دینے والی انتہائی تیز ترین دوا شامل ہے۔

میرے ساتھی بندر اس دقت میں عدد ہیں سب کی کلائیوں پر گھڑی موجود ہے۔ اب زیادہ باتوں کا وقت نہیں تمہارے ماتحت اوپر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر حاتم سفاک لہجے میں بولا۔

”ڈاکٹر مجھے مار کر تم اپنے حق میں بہت برا کرو گے پولیس کا حکمہ کا تھوڑا کر تمہارے پیچھے پڑ جائے گا۔

میں ایس پی شہر یا رہا خان ہوں آئی جی پولیس کا داماد میرا فیملی بیک گراؤ غلط بھی بہت بڑا ہے۔“

”تم جو کوئی بھی ہو تمہارا قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا میرے حفاظتی انتظامات انتہائی سخت ہیں۔ قانون کو مطلوب سفاک ترین نارنگ ٹکڑا اور میں کے قریب میرے تیار کردہ انسان نمابندر اور اس تجربہ گاہ کے اوپر عمارت کے باہر کچھ فاصلے پر خود کار گیس نصب ہیں۔ اس کے علاوہ اس عمارت کی چھت پر خطرناک ترین میزائل سسٹم نصب ہے۔ ایک پین دبائے کی دیر ہے یہ میزائل سیدھے تمہارے شہر پر جا گریں گے اور وہ شہر صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا، یہ سب کچھ میں اس تجربہ گاہ سے کنٹرول کر سکتا ہوں۔ میں ناقابل تغیر ہوں۔“ ڈاکٹر حاتم تہقید لگاتے ہوئے آگے بڑھا اور اس کے بازو میں انکیشن لگنے لگا۔

ایس پی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ خوف اور دہشت، دلیر اور نڈر پولیس افسر کے چہرے پر نمایاں نظر آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کامران اور ڈاکٹر جمشید تجربہ گاہ میں داخل ہوئے اور بے ہوش ایس پی کے بدن کی جیر پھاڑ کا کام سر انجام دینے لگے۔ دو گھنٹے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ بندر ڈاکٹر حاتم کے حکم پر اندر آئے اور دل، گردے، آنکھوں اور دماغ سے محروم لاش اٹھا کر باہر نکل گئے ان کی آج کی دعوت کا بھرپور انتظام ہو چکا تھا۔ ایس پی کے ساتھیوں کے بعد ایس پی کا گوشت بھی انہیں نصیب ہو رہا تھا۔

احاکم تجربہ گاہ میں ٹوں ٹوں کی آواز تیزی سے گونجنے لگی ڈاکٹر حاتم کمپیوٹر کی طرف لپکا۔ کمپیوٹر اسکرین پر عمارت کے باہر کھنچے جنگل کا منظر تھا جس نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ یہ منظر انتہائی ناقابل یقین تھا اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نظر آنے لگے۔ کمپیوٹر اسکرین پر ردی نظر آرہی تھی۔ اس کی محبت ردی جس نے اسے ٹھکرایا تھا۔

ایک بھاری جسامت کا شیر اس سے کچھ فاصلے

پر حملے کے لئے پرتول رہا تھا۔ شیر نے اس پر جست لگنے کی تیاری کرتی تھی۔ ڈاکٹر حاتم نے پھرتی سے چند پین دبائے خفیہ خود کار گیسوں سے گولیاں ٹپکیں اور شیر کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ شیر زمین پر گر کر تر پنے لگا۔ گولیوں کے برسٹ نے شیر کا جسم چھلنی کر دیا تھا۔ شیر کے پراسرار طور پر مرتے ہی گولیوں کی آواز سن کر لڑکی خوفزدہ کھڑی متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”نمبر دن، نمبر نو، ردی کو جنگل سے بہ حفاظت یہاں لے آؤ۔“ ڈاکٹر چلایا۔

تقریباً اُس منٹ بعد بین ماس کی جسامت کے دو بندر ردی کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ ردی جو کہ اصل میں سیرا تھی۔ ڈاکٹر کی پسند ردی کی بمشکل خوفناک بندروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر خوف سے بے ہوش ہو کر گر گئی۔ ایک بندر نے آہستگی سے اسے اٹھایا، چند منٹ بعد ہی سیرا تجربہ گاہ میں موجود ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

”ڈاکٹر کامران تم لوگ جنت میں جا کر دقت گزارو۔ میری ذہنی کیفیت درست نہیں ہے۔“ ڈاکٹر حاتم بولا اور وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے تجربہ گاہ سے نکل گئے۔

ڈاکٹر حاتم سیرا کی طرف بڑھا۔ سیرا ہو بہو ردی کی ڈیپٹی کیٹ معلوم ہو رہی تھی۔ دونوں کی شکل و صورت قد و قامت اور رنگت بالکل ایک جیسی تھی۔ یہ ایک حیرت انگیز اتفاق تھا بالکل قلمی پیویشن تھی۔ سیرا گویا ردی کا ڈبل پارٹ تھی۔ ڈاکٹر نے ایک انکیشن سیرا کو لگایا اب وہ بے تابی سے سیرا کے چہرے کو ٹک رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ ”آخر تم مجھے مل گئیں۔ اب میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔“

کچھ دیر بعد سیرا کو ہوش آ گیا۔ وہ کراہے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اور گرد کا منظر دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ ”تت، تم کون ہو۔ میں کہاں ہوں، خدا کے لئے مجھے جانے دو؟“

”ردی میں ڈاکٹر حاتم ہوں جو تم سے محبت کرتا

تھا۔ بے انتہا محبت مگر تم نے مجھے ٹھکرایا۔ اب ایسا مت کرنا، میں دنیا کو آگ لگا دوں گا۔ تم میری ہو، تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو میں سب کو تباہ و برباد کر دوں گا۔“ ڈاکٹر حاتم بذیانی لہجے میں بولا۔ وہ ردی کی بمشکل سیرا کو دیکھ کر دیا لگی کی آخری حد پر جا پہنچا تھا۔

سیرا جو اٹھ کر بیٹھ گئی تھی خوفزدہ ہی اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے ساتھ آسان سے گرا بھجور میں انکا والا معاملہ ہوا تھا۔ چوہدری کے بچنے سے نکل کر اس پاگل ڈاکٹر کے مجھے چاچا بھی تھی۔

”ارے میں نے تو تم سے کچھ کھانے پینے کا پوچھا ہی نہیں۔ میں چائے منگواتا ہوں۔“ ڈاکٹر حاتم نے کوئی پین دبایا اور مائیک میں بولا۔ ”چائے لاؤ میری جان کے لئے۔“ دس منٹ بعد ایک بندر چائے کا کپ ٹرے میں لایا ان کے قریب ٹرے رکھنے کے بعد فری سجدہ کیا اور بولا۔ ”اور کوئی حکم میرے آقا۔“

سیرا بندر کے منہ سے کھر کھرائی ہوئی انسانی آواز سن کر خوفزدہ ہو گئی۔

”نہیں اب تم جاؤ۔“ ڈاکٹر نے اسے خوفزدہ دیکھ کر بندر کو جانے کے لئے کہا۔ ”ان سے مت ڈرو، یہ میرے بھائے ہوئے ہیں، میرے اشاروں پر چلتے ہیں یہ کھانا کھا سکتے ہیں، چائے بنا سکتے ہیں، ہماری طرح بول چال سکتے ہیں۔ میں نہیں یہاں کی ہر چیز دکھاؤں گا اپنی بھائی ہوئی، جنت بھی دکھاؤں گا۔“ وہ سیرا کے قریب جا بیٹھا۔

”میں تمہاری جدائی میں برسوں رڈیا ہوں۔ اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔“ ڈاکٹر حاتم نے اس کے گرد اپنے بازو جمال کر دیے۔ ردی تم اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔“

”دیکھو تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں ردی نہیں سیرا ہوں۔ چوہدری حاکم نے میرے شوہر اور ساس سر کو قتل کر دیا ہے، میں اس سے عزت اور جان بچا کر بھاگی اور جنگل میں جا بیٹھی۔“ سیرا بے بسی سے

بولی۔

ڈاکٹر حاتم مجڑک اٹھا۔ اس نے چائے کا کپ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ ”تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم روٹی ہو۔ کوہنہ روٹی ہو۔ روٹہ میں اس شہر کو کھنڈر بنادوں گا۔ سب کو فنا کروں گا، تمہیں بھی مار دوں گا۔“ ڈاکٹر حاتم جوتی ہو کر اسے جھنجھوڑنے لگا۔

”ہاں میں روٹی ہوں۔ اب تو مجھے چھوڑ دو۔“ سمیرا خوفزدہ لہجے میں بولی۔ سمیرا نے اندازہ لگا لیا کہ ڈاکٹر حاتم جنوں میں مبتلا ہو چکا ہے اس سے جان بچانی ہے تو اس کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔

ڈاکٹر حاتم پانکلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ”ہلو تم میری ہوناں۔“ سمیرا کے چہرے پر گہری نظریں مرکوز کرتے ہوئے ڈاکٹر گہری ستانت سے بولا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ وہ شیطانی اور ڈاکٹر حاتم نے اسے گلے لگا لیا۔ ”چلو میں تمہیں تجربہ گاہ کی سیر کراؤں۔“ وہ اسے لے کر کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔ ”یہ دیکھو کمپیوٹر اسکرین پر عمارت کے باہر کے مناظر دکھائی دے رہے ہیں اگر دشمن اس حدود میں آ جائے تو سگنل موصول ہوتے ہیں۔ تجربہ گاہ میں الارم بجنے لگتا ہے، تب یہ گرین ٹین دہانا پڑتا ہے، درجنوں خفیہ خودکار گنیں ٹارگٹ پر برسنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ریڈ ٹین دہاتا ہے، گولیاں ٹارگٹ پر برس جاتی ہیں۔ اب یہاں آؤ۔“ وہ سمیرا کو لئے ہوئے دوسری طرف چلا گیا۔

”اس لیپ ٹاپ کے قریب مشین پر جو لیور ہے اس کو نیچے کرتے ہی میزائل فائر کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ پھر یہ بلیک ٹین دہانا پڑے گا، پانچ منٹ بعد ہی یہ خطرناک ترین میزائل شہر پر جا گریں گے پھر پورا شہر تباہ ہو جائے گا۔“

”لیکن اگر وہ ہاں کے بجائے یہاں گر گئے تو؟“ سمیرا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا جب تک اس لیور کو دوبارہ اوپر نہ کیا جائے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر کسی غلطی

سے فوراً ہی لیور اوپر کر کے میزائل رد کرنے کی کوشش کی تب ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اس تجربہ گاہ میں میرے ڈاکٹر جشید اور کامران کے علاوہ کسی کو یہاں کسی مشین کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔ چلو تمہیں گئے ہاتھوں جنت کی سیر بھی کرا دوں۔“ وہ اسے لئے ہوئے تجربہ گاہ کے کونے میں چلا گیا۔ اس نے چھت میں گئے ایک لیور کو گھما کر دیا۔ ”دیکھیں مسکرتی کی دیوار اپنی جگہ سے ہٹ گئی یہ ایک دوسری سرنگ میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ وہ سمیرا کا ہاتھ تھا۔ سرنگ میں اتر گیا۔

ان کے اندر جاتے ہی سرنگ کا دروازہ بند ہو گیا اور لائٹس آن ہو گئی۔ ”یہاں کی جگہوں پر الیکٹریک سوئچ لگے ہیں، یہاں پر ہمارا الیکٹریک نظام اپنا ہے۔ اس سرنگ کے آخری حصے میں اسلحہ خانہ بھی ہے اور وہ سوئچ آن کرنا ہوا باتیں کرتا رہا اور سمیرا کا ہاتھ تھا۔ آگے بڑھتا رہا۔ آخری حصے میں اسلحہ خانے کے قریب چھت پر لگے لیور کو گھماتے ہی ایک خفیہ دروازہ کھلا، ہوا کے سرد جھوکے ان کے بدن کو راحت دینے لگے جیسے ہی وہ دروازے سے اندر داخل ہوئے دروازہ خود کار طریقے سے بند ہو گیا۔

یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا ان کے ارد گرد خوب صورت مناظر تھے، قسم قسم کے پھولوں کے پودے ارد گرد موجود تھے۔ چارہ و خوب صورت تالاب جن میں فوارے نصب تھے۔ تالابوں میں سونے کے بے عورتوں کے عریاں جسم تھے اور دلکش فوارے بھی تھے، دیوار میں سنہری رنگت کی تھیں جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ درجنوں خوب صورت لڑکیاں نیم عریاں لباس میں گھوم پھر رہی تھیں۔

ڈاکٹر حاتم اور سمیرا آگے بڑھے تو ڈاکٹر کامران اور جشید پر نظر پڑی جو دو لڑکیوں سے لکھیلیاں کر رہے تھے درجن کے قریب خوفناک شکل کے افراد انہیں ہاتھوں میں لئے گھوم رہے تھے۔ ان جرائم پیشہ افراد کے چہرے وحشت زدہ تھے انہوں نے ڈاکٹر حاتم کو سجدہ کیا۔ وہ دونوں کافی دیر خود ساختہ جنت میں رہے پھر ڈاکٹر حاتم

اسے دوبارہ تجربہ گاہ میں لے آیا۔

سمیرا کو وہاں رہتے ہوئے تین روز گزر چکے تھے۔ ایک روز ڈاکٹر حاتم جنگل گیا ہوا تھا اور سمیرا تجربہ گاہ میں اکیلی تھی۔ ڈاکٹر حاتم سمیرا پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ اب تک تو سمیرا اس سے محفوظ تھی۔ دراصل ایک روز جب ڈاکٹر حاتم نے اس سے دست درازی کی کوشش کی تو سمیرا نے اسے ٹوک کر کہا۔ ”شادی سے پہلے یہ ممکن نہیں اور شادی وہ عہد کی مدت گزرنے کے بعد ڈاکٹر حاتم سے کرے گی۔“

ڈاکٹر حاتم اس کا دیوانہ تھا اس نے سمیرا سے وعدہ کر لیا کہ شادی سے پہلے اسے ہاتھ نہیں لگائے گا، اب اسے سمیرا کی عدت ختم ہونے کا انتظار تھا۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے سمیرا کی نظر ایک طرف پڑے موبائل فون پر پڑی اس نے موبائل فون اٹھا یا اور خوشی کا نمبر ملانے لگی نمبر مل گیا۔ ”ہائی میں سمیرا بول رہی ہوں۔“

”سمیرا کہاں ہو تم! تمہارا اور حماد کا اور انکل، تینوں کے نمبر بند جا رہے ہیں۔“ خوشی بے تابی سے بولی اور سمیرا نے اپنی تمام رد و درسا ذالی اور بتایا کہ چوہدری نے کیسے اس پر ظلم ڈھائے اب وہ ڈاکٹر حاتم کی قید میں ہے جو جنگل میں واقع ہے۔ ”ہائی میرے پاس وقت نہیں، یہ نہ ہو کہ ڈاکٹر حاتم آ جائے وہ جوتی انسان ہے۔“ سمیرا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ یاسر کو فون کرے اور وہ یاسر کا نمبر ملائے گی۔

صبح کے وقت خوشی اپنے ادارے کے اعلیٰ افسر کے سامنے پہنچی تھی اور افسر کو سمیرا پر پینے والے مظالم کی کھانسناری تھی۔ افسر نے اپنی میز پر پڑی بہت سی فائلوں میں سے ایک فائل نکالی۔ اسے کھولا اور دیکھ کر نے کے بعد فائل خوشی کے حوالے کر دی۔ ”خوشی تم ہمارے ٹھکے کی ذمہ دار اور ذہین افسر ہو، اب تک تم نے بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں، یہ فائل کل ہی ہمارے ادارے کے حوالے کی گئی ہے۔ جس گاؤں کا تم

نے ذکر کیا ہے اس کے جنگل میں بہت سے لوگ لاپتہ ہو گئے ہیں۔ لاپتہ ہونے کے بعد کچھ لوگوں کی لاشیں ملی ہیں جن کے جسم پر گوشت برائے نام ہوتا ہے۔ یعنی ڈھانچے ملے ہیں بعض لاپتہ افراد کا سر اس کی تینیں ملا۔ پچھلے دنوں ایک بڑے سیاسی گھرانے سے تعلق رکھنے والے تین نوجوان شکار کھیلنے گئے اور لاپتہ ہو گئے دوسرے روز ان کی ناقابل شناخت لاشیں ملیں۔ لاشیں کیا تھیں ڈھانچے تھے۔ DNA ٹیسٹ سے ان کی شناخت ہوئی۔ اس کے کچھ روز بعد ایس بی شہر یار جو کہ وہاں کے آئی جی صاحب کے داماد بھی تھے کچھ پولیس اہلکاروں کے ساتھ جنگل میں تفتیش کے لئے گئے اور لاپتہ ہو گئے۔ ان لاپتہ پولیس افسران میں سے صرف ایس بی شہر یار کا ڈھانچہ ملا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ ہلاک ہونے سے پہلے انہیں بے ہوش کیا گیا تھا، اس کے بعد سر جری کے ذریعے ان کے دماغ، آنکھیں، دل، گردے نکال لئے گئے۔ ظاہر ہے یہ کام کسی ماہر سر جن کا ہی ہو سکتا ہے۔

اب یہ کیس صوبائی حکومت کی درخواست پر ہمارے حساس ادارے کو ملا ہے۔ ہمارے ادارے کو تمہاری بہت ضرورت ہے اب تک تمہیں جتنے بھی کیسز ملے ہیں۔ تم نے تقریباً ہر مجرم کو اس کے انجام تک پہنچایا ہے اس کے علاوہ تم نے اپنی بہن کی داستان بیان کی ہے اس لئے یہ کیس میں تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔

چوہدری با اثر شخصیت سے وہ اپنے حلقے سے ایکشن جیت چکا ہے اور حکمران جماعت کا وزیر ہے تم بغیر ثبوت کے اس کے اوپر ہاتھ نہیں ڈال سکتیں۔ میڈیا بھی ان حادثات کے بعد بہت اچھل کود کر رہا ہے۔ جلد از جلد اس کیس کو حل کر کے مجرموں کو کیفر کر دیا تک پہنچاؤ۔“ افسر اعلیٰ نے تفصیلی گفتگو کی۔

”سر ہو سکتا ہے جنگل میں غائب ہونے والے افراد کی ہلاکتوں میں ڈاکٹر حاتم کا ہاتھ ہو، اسی ڈاکٹر حاتم کا جس کا فون کال پر سمیرا نے مجھ سے ذکر کیا ہے۔“ خوشی نے افسر اعلیٰ کی بات کاٹ کر اپنے خدشے کا اظہار



کیا۔

”ہوسکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا ہے۔ تمہاری سیرا سے تفصیلی بات نہیں ہوئی۔“ افسر نے پوچھا۔

”ساس سسر کی لاشیں چوہدری کی حویلی کے عقی جھے میں دفن ہیں اور یہ بھی بتایا کہ وہ گھنے جنگل کی کسی عمارت کے تہ خانے میں واقع تجربہ گاہ میں جنونی سا مستندان حاتم کے قبضے میں ہے۔ ڈاکٹر حاتم اسے اپنی محبوبہ رو بی سمجھ رہا ہے کیونکہ سیرا کی شکل رو بی سے ملتی جلتی ہے۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔“ خوشی بولی۔

”تمہارے ساتھ ہمارے گلے کا ہونہار افسر نوید اختر جائے گا۔ وہ تمہارے اندر رہے گا۔ علاقہ پولیس بھی تم سے تعاون کرے گی اس کے علاوہ کسی بھی پرابلم کی صورت میں تم وہاں سے بھاری نفری بھی گھولا سکتی ہو اور کوئی سوال؟“

”نوسر۔“ خوشی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”اپنا خیال رکھنا۔“ افسر بولا۔ خوشی تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

خوشی اور نوید اختر دوسرے روز سہ پہر کے وقت گاؤں میں موجود تھے۔ انہوں نے گاؤں کے تقریباً ہر فرد سے گفتگو کی مگر کوئی بھی حقیقت بتانے پر تیار نہیں تھا۔ ظالم و جابر چوہدری کا خوف لوگوں کے دلوں پر اس قدر بیٹھ چکا تھا کہ اس کے ظلم کی پگلی میں پسنے کے باوجود کوئی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ تھک ہار کر تھانے پہنچ گئے۔ گاؤں دیہاتوں میں عموماً شام ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا ہے، اس وقت اگرچہ رات کے نو بج رہے تھے۔ مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رات آدمی سے زائد بیت چکی ہو۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھانے کے اس کمرے میں خوشی، نوید اختر اور انسپکٹر عارف موجود تھے۔ اس تھانے کا عملہ انسپکٹر عارف سمیت چھ افراد پر مشتمل تھا۔

اجا تک خوشی چوک چوک بڑی کسی عورت کے چننے کی آواز آ رہی تھی۔ ”یہ کس کے چننے کی آواز ہے لگتا ہے

کسی پر ظلم ہو رہا ہے۔“ خوشی مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ”میڈیم یہ اکثر یہاں کا معمول ہے آپ ریلیکس ہو کر بیٹھی رہیں۔ باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔“ انسپکٹر عارف جھانکی لیتے ہوئے بولا اسے نیند کی وجہ سے بار بار جھانکیاں آ رہی تھیں۔

”تمہارا دماغ تو درست ہے، تمہارے جیسے اگر قانون کے رکھوالے ہوں تو اس ملک کا اللہ حافظ ہے۔“ اسی وقت نسوانی چیخ پھر سنا دی۔ خوشی تیزی سے تھانے سے باہر نکلے۔ نوید نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ تیزی سے اپنی جیب کی طرف بڑھے۔ اسی لمحے چیخ پھر سنا دی ساتھ ہی لگا تار چار پانچ فائر ہوئے انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ تھانے سے کچھ دور ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ آوازیں وہیں سے آ رہی تھیں۔ ”نوید جیب اسٹارٹ کرو۔“ خوشی چلائی۔ اور جیب میں چھلانگ لگا دی۔ نوید نے جیب اسٹارٹ کی، اسی لمحے اس مکان کے قریب سے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنا دی۔ انہوں نے دیکھا۔ وہ ایک جیب تھی جو تیزی سے ایک طرف دوڑتی جا رہی تھی۔ نوید نے اپنی جیب اس جیب کے تعاقب میں لگا دی۔

دونوں بھیڑیں تیز رفتاری سے آگے پیچھے جاری تھیں۔ عورت کے چننے کی آواز پھر سنا دی۔ اب وہ چیخیں جیب کے اندر سے گونج رہی تھیں۔ اسی وقت جیب سے ان پر بے درپے تین فائر ہوئے۔ نوید نے تیزی سے اسٹیرنگ گھمایا ان کی جیب لہر کر رہ گئی۔

خوشی نے اپنے ہوسٹر سے پہلے نکالا اور نوید سے گاڑی کی رفتار تیز کرنے کو کہا۔ جیب اب ان سے کچھ فاصلے پر تھی، اسی وقت دو فائر مزید ہوئے، گولیاں ان کی گاڑی کے بونٹ میں لگیں۔

خوشی نے جیب کے پچھلے ٹائروں کا نشانہ لے کر پے درپے دو فائر کئے۔ اس کا نشانہ بے مثال تھا۔ زور دار دھماکے سے جیب کے دونوں پچھلے ٹائر برست ہو گئے۔ تیز رفتار جیب کو جھکا لگا وہ لہرائی ہوئی ٹوٹی پھوٹی سڑک سے اتری اور درختوں میں گھسی چلی گئی۔

بہت سے چھوٹے بڑے پودوں کو توڑنے کے بعد وہ ایک بڑے درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ جیب کے شیشے پھٹنا چور ہو چکے تھے۔ نوید نے اپنی جیب کو زوردار بریک لگا کر روکا۔ جیب کے رکتے ہی وہ دونوں چھلانگ لگا کر جیب سے اترے اور دوڑتے ہوئے قریبی قد آور درختوں کی آڑ میں چھپ گئے۔

الٹی ہوئی جیب سے سب سے پہلے ایک گرائیل شخص راقل تھا۔ نوید نے مضطربانہ طور پر جھانک کر اسے دیکھنا چاہا یہ اس کی غلطی تھی جس کی اسے سزا جھگڑا پڑی۔ گرائیل شخص کی راقل سے نکلنے والی گولی نوید کے شانے میں لگی۔ وہ چیخا ہوا زمین پر گر گیا۔ نوید کی چیخ سن کر خوشی کا خون کھول اٹھا۔ اس کے پہلے سے نکلے گولی گرائیل شخص کے سینے میں لگی تو وہ چیخا ہوا گر گیا۔

خوشی پھرتی ہے جگہ تبدیل کر کے ایک دوسرے درخت کی اوٹ میں چلی گئی۔ اس کی یہی دور اندیشی اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی۔ جیب سے نکلنے والے دوسرے شخص کے ماؤڈر سے نکلنے والی گولی وہاں لگی جہاں چند لمحے پیشتر خوشی موجود تھی۔ خوشی نے فوراً ہی اس کا نشانہ لے کر گولی چلائی۔ گولی اس کے سر پر لگی اور اس کا مغز توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ اس کے غضب کا تیسرا نشانہ لنگڑا کر جیب سے باہر نکلا ایک موٹا شخص بنا۔ گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔ الٹی ہوئی جیب سے آخری شخص جو باہر نکلا وہ چوہدری کا دست راست شیرا تھا، خوشی کی چلائی ہوئی گولی نے اس کی ٹانگیں میں سوراخ کر دیا۔ وہ اپنی زخمی ٹانگیں دوسرے ہاتھ سے تھامے پچھلی پچھلی لگا ہوں سے اپنے ہاتھوں سے چھوٹ کر گرنے والے پہلے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غم تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی اتنی دیدہ دلیری سے اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دے گا۔ خوشی چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے پہلے کی ٹال کا رخ شیرا کی طرف تھا اور انگلیاں ٹریگر پر۔

جیب سے ایک نوجوان لڑکی باہر نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ شیرا کی آنکھیں یہ دیکھ کر حیرت سے مزید پھیل گئیں کہ اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کرنے والی ایک لڑکی ہے آج تک وہ عورت کو کمزور جان کر اس پر ظلم ڈھاتا چلا آیا تھا۔ اب ایک عورت اس کے سامنے موت کا روپ دھارے کھڑی تھی۔ عورت کا یہ روپ اس کے لئے نیا تھا۔ ”ماردواس شیطان کو بھی مارد، اس نے نہ جانے کئی ہی عورتوں کی عصمت پر ڈاکہ ڈالا ہے کتنے گھر پر باد کئے آج میرے باپ بھائی کو قتل کر کے مجھے بھی چوہدری کے ہاتھوں پر یاد کرنے لے جا رہا تھا۔“ لڑکی اس کے قریب آ کر رو بی ہوئی بولی۔

شیرا کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔ ”مجھے مت مارو تم جیسا کہو گی میں کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ خوشی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھمکھار رہا تھا۔

”نہیں اسے مت چھوڑنا یہ سانپ ہے اور سانپ کی فطرت ڈنٹا ہے۔ وہ ڈنٹے سے باز نہیں آتا۔ یہ شیرا ہے چوہدری کا دست راست، اسے مار ڈالو۔“ لڑکی دوبارہ چلائی تو خوشی کی انگلیوں کا دباؤ ٹریگر پر بیڑھ گیا۔ اس کے پہلے کی گولی شیرا کی پیشانی میں لگی۔ شیرا کا جسم کٹے ہوئے درخت کی مانند گر اور ساکت ہو گیا۔

خوشی تیزی سے نوید اختر کی طرف لپکی۔ نوید بے ہوش پڑا تھا۔ خون اس کے شانے سے بہہ رہا تھا۔ لڑکی کی مدد سے خوشی نے اسے جیب میں ڈالا اور تیز رفتاری سے تھانے کی طرف روانہ ہوئی۔ تھانے پہنچ کر نوید کو اسپتال بھجوا گیا۔ انوا کی جانے والی لڑکی کو گاؤں ہی کے ایک شریف گھرانے میں بٹھرایا گیا۔ دوسرے روز خوشی پولیس پارٹی کے ہمراہ چوہدری کی حویلی جا پہنچی۔

اس وقت چوہدری کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں خوشی انسپکٹر عارف اور پانچ پولیس اہلکاروں کے ہمراہ موجود تھی۔ چوہدری ان کے سامنے سٹول صوفے پر بیٹھا تھا۔ ”چوہدری صاحب آپ کا دست راست شیرا اور



اس کے چچے ایک معصوم لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ کل رات پولیس مقابلے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ آپ کو تو یہ خبر پہنچ ہی گئی ہوگی۔“ خوشی بولی۔

”یہ جھوٹ ہے پولیس نے جھوٹا الزام لگا کر میرے ملازموں کا ان کا ڈنٹر کیا ہے، میں اس کی شکایت ادا پر کروں گا۔“ چوہدری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ چوہدری صاحب محکمہ پولیس کی درخواست پر حکومت نے یہ کیس ہمارے محکمے کے حوالے کیا ہے۔ پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے آپ کے ہر کاروں کے قبضے سے غیر قانونی اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ مغویہ لڑکی نے بیان دیا ہے کہ آپ کے کہنے پر اسے اغوا کیا گیا تھا۔ اغوا ہونے والی لڑکی کے رشتے دار بھی آپ کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی حویلی کے عقبی سمت تین بے گناہ انسانوں کو زندہ دفن کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس آپ کی حویلی کی تلاشی کا سرچ وارنٹ موجود ہے۔“ خوشی بغیر کسی گھبراہٹ کے بولی۔

”کس کی ہمت ہے جو حویلی کی تلاشی لے۔“ چوہدری بھڑک اٹھا۔

”مسٹر چوہدری حویلی کی تلاشی کا سرچ وارنٹ ہے ہمارے پاس۔“ خوشی نے وارنٹ چوہدری کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”میں کسی وارنٹ کو نہیں مانتا تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم کو خیر و عافیت سے چلے جاؤ۔“ وہ غصے سے دھاڑا۔

”چوہدری اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ہم سے تعاون کرو۔ ورنہ ہمیں زبردستی تلاشی لینا پڑے گی۔“ خوشی آسانی سے بولی۔

چوہدری غصے سے اٹھا۔ ”کیا بکواس ہے میں ابھی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔“ چوہدری نے آئی جی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ”آئی جی تمی کا دور ہے۔ اب پولیس میرے جیسے وزیر کے گھر کی تلاشی لے گی۔“

”چوہدری صاحب حالات بہت گمبیر ہو چکے ہیں۔ آپ کے علاقے میں بے درپے قتل کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ کئی پولیس والے مارے جا چکے ہیں۔ آپ کے جو بندے پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں ان کے قبضے سے غیر قانونی ہتھیار ملے ہیں مغویہ لڑکی اور اس کے رشتہ دار آپ کے خلاف گواہ بن چکے ہیں اگر آپ کے ہاتھ صاف ہیں تو تلاشی دینے میں حرج نہیں، ہمیں اس سلسلے میں اوپر سے سخت احکامات ملے ہیں۔“ آئی جی نے کہا تو چوہدری نے غصے سے رابطہ منقطع کر دیا۔

”تم لوگ تلاشی لے سکتے ہو۔“ چوہدری کے دلچسپ منہ میں جھنجھلاہٹ تھی۔ خوشی انسپکٹر اور دوسرے پولیس اہلکار حویلی میں پھیل گئے، تلاشی کی کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی لیکن کوئی غیر قانونی چیز برآمد نہ ہوئی۔ چوہدری کے ملازموں کے پاس جو اسلحہ تھا اس کا انکسین موجود تھا، اب خوشی کے حکم پر حویلی کے عقبی سمت کھدائی شروع کر دی گئی۔ جگہ جگہ کھدائی کی گئی مگر یہاں بھی نتیجہ صفر رہا۔ حویلی کلائی بڑی تھی۔ اس کے عقبی سمت کا ایریا بھی کافی طویل و عریض تھا۔ اتنی بڑی جگہ کی مکمل کھدائی ناممکن بات تھی۔ کھدائی کرنے والے پولیس اہلکاروں کے جسم سے مسلسل کھدائی کے باعث پسینہ بہہ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وقت گزر رہا تھا۔

شام چھ بجے کھدائی رکوا دی گئی۔ پولیس اہلکاروں کا تھکن سے برا حال تھا۔ خوشی مایوس نظر آرہی تھی۔ ”اب بولو کیا ملا تمہیں یہ سب کر کے، میں نے کہا بھی تھا کہ یہاں کچھ بھی نہیں۔ تم لوگوں نے مجھے ہراساں کیا۔ کھدائی کر کے میری حویلی کا بیڑا غرق کر دیا۔ میں تم لوگوں پر کیس کروں گا۔“ چوہدری سخت غصے میں تھا۔

خوشی اداس تھی۔ اتنی سخت تلاشی اور کھدائی کے باوجود چوہدری کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملا تھا وہ اس درندے کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے یہ ناممکن تھا۔ حالانکہ اپنی فون کال میں

سیرانے یقینی لہجے میں کہا تھا کہ حویلی کے عقبی سمت میں اس کے مقتول شوہر اور ساس سرسودھن کیا گیا ہے۔ مایوسی کے عالم میں وہ بے خیالی سے بچی اور اس کا پاؤں سلب ہوا اور وہ منہ کے بل گرنے لگی، خوشی گرتے ہوئے اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر اپنے چہرے کو چوٹ لگنے سے بچایا۔

اچانک وہ چونک پڑی جہاں اس کا ہاتھ گرتے ہوئے پڑ گیا تھا۔ وہاں ایک مردانہ گھڑی پڑی تھی۔ خوشی نے اٹھتے ہوئے گھڑی اٹھائی اور بغور اس کا معائنہ کرنے لگی یہ گھڑی اس نے حماد کو تحفے میں دی تھی۔ یہ جدید طرز کی انتہائی مہنگی گھڑی تھی۔ گھڑی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید پیچیدہ مینجمنٹ اور تشدد کے دوران گھڑی حمادی کلائی سے ٹوٹ کر گر پڑی تھی جس پر چوہدری اور اس کے کارندوں کی نظر نہیں پڑی۔

چوہدری کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔ ”اس جگہ کھدائی کرو۔“ جہاں سے گھڑی ملی تھی۔ پولیس اہلکاروں نے وہاں کھدائی شروع کر دی۔ تین فٹ کھدائی کر لینے کے بعد وہ احتیاط سے کھدائی کرنے لگے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ان کے ہاتھ رک گئے۔ انسانی جسم ظاہر ہونے لگا تھا۔ اس وقت تک اندھیرا چھا چکا تھا۔ حویلی میں چاروں طرف روشنی تھی۔ اب وہ مزید احتیاط سے کھدائی کرنے لگے رات دس بجے کے قریب تینوں لاشیں زمین سے نکال لی گئیں لاشوں کی حالت بہت خراب تھی۔ بدبو کے پھسکے اٹھ رہے تھے۔

”چوہدری صاحب آپ خود کو قانون کی حراست میں سمجھیں۔“ انسپکٹر پھسکڑی لے کر چوہدری کی طرف بڑھا۔

اچانک بے درپے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی انسپکٹر کی پیشانی میں لگی۔ تو وہ بنا آواز نکالے زمین پر گر گیا۔ بقیہ پولیس اہلکار سینے پر گولیاں کھا کر زمین پر گر گئے۔“ خبردار لڑکی کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے جسم میں بھی گولی اتاری جائے گی۔“ ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ خوشی نے سر گھما

کر دیکھا اسے چوہدری کے نصف درجن مسلح اہلکاروں نے گھیر رکھا تھا۔ ”لاشوں کو دوبارہ دفنا دو ان لاشوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے اس لئے کھدائی ذرا زیادہ کرنا اور اس لڑکی کو تہہ خانے میں لے جا کر بند کر دو کچھ دیر بعد میں اس سے ملوں گا جب تک میں شغل کر لوں۔“

چوہدری اپنی موچیوں کو ٹاؤنٹا ہوا دہاں سے چلا گیا۔ خوشی کو رات گھنٹوں کی زود میں تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ہوسٹر سے پھیل نکال لیا گیا تھا۔ اب خوشی بنا کسی ہتھیار کے اس خونی تہہ خانے میں قید تھی۔ جہاں نہ جانے کتنے بے گناہوں کی زندگی کے چراغ گل کر دیئے گئے۔ خوشی کو اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ بدترین گھڑی آن پہنچی جس کے اندیشوں نے خوشی کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور چوہدری اندر داخل ہوا۔ چوہدری نے عقابانی نظروں سے خوشی کا جائزہ لیا۔ ”تمہارے ساتھیوں کو باعزت طریقے سے حویلی کے عقبی حصے میں دفن کر دیا ہے۔ اب بہت جلد تمہیں بھی ان کے پاس بھجوا دوں گا۔“ اس نے خوشی کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم یہ تو بتاؤ تم میرے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو؟“

”سیرانام کی جس لڑکی پر تم نے ظلم ڈھائے ہیں وہ لڑکی میری بہن ہے۔“

”اوه جب تم یہ سب جانتی ہو تو یہاں آنے کی حماقت کیوں؟ تمہاری بہن تو بچ کر بھاگ گئی پر تم نہیں بچ سکو گی۔“ چوہدری حیثیت نہ انداز میں ہنسا۔

”چوہدری تمہاری عقل پر ماتم کرنے کو دل کر رہا ہے۔ آج کا دن تمہاری بد نصیبی کے آغاز کا دن ہے۔ آج کے دن تم غلط وقت پر غلط جگہ پر اپنی مصیبت کو دعوت دے بیٹھے ہو۔ تمہیں میرے سامنے اکیلے نہیں آنا چاہئے تھا۔ ہر لڑکی تر نوالہ نہیں ہوتی، میں کوئی عام لڑکی نہیں حساس ادارے کی افسر ہوں۔“ خوشی نے ترشی سے جواب دیتے ہوئے اپنی پوزیشن واضح کی۔ چوہدری نے اپنے ہوسٹر سے رولور نکالنا چاہا

مکراس کی یہ حسرت اس کے دل میں رہ گئی۔ خوشی بجلی کی طرح اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس نے فضا میں قلابازی کھائی اور چوہدری کے سینے پر فلائنگ کلک ماری۔ چوہدری اچھل کر دروازہ جا کر اٹھی وہ بمشکل اٹھا ہی تھا کہ خوشی کی اسپین کلک اس کے جڑے سے لگرائی چوہدری کی نگاہوں کے سامنے ستارے سے رقص کرنے لگے اس نے چیختے ہوئے اپنے خون آلود جڑے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ خوشی کی زوردار چپ سائیڈ کلک چوہدری کے سینے پر لگی چوہدری الٹ کر چیخا ہوا گر گیا اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے اس کی کئی پھلیاں ٹوٹ گئی ہوں وہ بری طرح خوشی سے پٹ رہا تھا۔ اس نے چند منٹ میں لائٹوں اور گھونٹوں سے چوہدری کی خاطر خواہ توضیح کی تھی۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ”بچاؤ۔ بچاؤ۔“ وہ مدد کے لئے چیخ دیا پکار کر رہا تھا۔

اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور نصف درجن رائفل بردار داخل ہو گئے اندر کا منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ چوہدری فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا اور چیخ چلا رہا تھا اور خوشی بے دردی سے اس کے جسم پر ٹھوکریں برسا رہی تھی۔ ”رک جائز کی۔“ ایک رائفل بردار چلایا۔ ان کی انگلیوں کی گرفت ٹریگر پر سخت ہونے لگی۔ خوشی نے خونی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور ایک طرف ہٹ گئی۔ نصف درجن رائفل برداروں کے سامنے خالی ہاتھ مزاحمت نہ کرتی تھی۔ انہوں نے خوشی کو رسیوں سے باندھ کر بیڈ پر پھینکا۔ چوہدری بمشکل اٹھا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔

”چوہدری صاحب اگر اجازت ہو تو اسے جان سے مار دوں۔“ ایک رائفل بردار نے خوشی کی طرف رائفل کی نال کار رخ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں اے کچھ گھنٹوں کی بات ہے۔ میری طبیعت ذرا سنبھل جائے۔ میں اس کی ساری کسر نکالوں گا۔ اب تو یہ بندھی ہے کیسے ہاتھ بندھ چلائے گی۔“ چوہدری اپنے ہلکا اردوں کے سہارے چلا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

خوشی بے بس پڑی آنے والے وقت کی تکلیف کا اندازہ کرنے لگی۔ پہلے تو وہ آزاد تھی اس لئے چوہدری کو چھٹی کا دودھ یا کروادیا۔ اب وہ رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ کچھ گھنٹوں بعد تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور چوہدری اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی سوچا ہوا تھا۔ چوہدری اپنی مونچھوں کو تاد دیتا ہوا خوشی کی طرف بڑھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک ابر آلود رات تھی۔ ہلکی ہوندا یو امدی ہو رہی تھی۔ گا۔ بے گاہے ہوندا باندی رک جاتی پھر بر سے لگتی۔ یاسر کے دل کا موسم بھی عجیب ہو رہا تھا۔ سیرا اسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ اور دل دیکھنے لگا تھا کہ کیا سیرا ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو جائے گی۔ تاریک رات میں تیز ہوانے ایک بار پھر سائیں سائیں کرنا شروع کر دیں۔ بادل زور زور سے گرجنے لگے۔ اس کے ذہن میں بھی آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ سمیرا کی حاد سے شادی کے بعد وہ بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اس روز تیز بخار کے سبب بے ہوش ہو گیا اور کئی روز اسپتال میں ایڈمٹ رہا۔ ان دنوں اسے ہر طرف سیرا دکھائی دیتی تھی۔ اس روز شام پانچ بجے وہ گھر پر اکیلا تھا۔ گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی یاسر نے اٹھ کر دروازہ کھولا دروازے میں ایک سولہ سالہ محسوس لڑکی کھڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔

”جی فرمائیے!“ یاسر اسے الجھن زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”یاسر صاحب میرا نام انشین ہے، میں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچی ہوں، آپ کی محبت سیرا خطرے میں ہے، چوہدری نے اس کے شوہر اور سر کو قتل کر کے اسے اغوا کر لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے عزت بچا کر وہاں سے بھاگی اور چوہدری کے بھائی ڈاکٹر حاتم کے ہتھے جا چھی جس نے اسے قید کر لیا

ہے۔“ انشین بولی۔

”مس انشین آپ کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں اور جس گاؤں کا آپ ذکر کر رہی ہیں وہ کہاں ہے؟“ یاسر نے بے تابی سے پوچھا۔

”انشین اسے گاؤں کا ایڈریس بتا کر بولی۔ ”میں اسی گاؤں کی رہائشی ہوں اور فضل دین کی بیٹی ہوں۔ میں بھی چوہدری حاکم کے مظالم کا شکار ہوئی۔“ انشین نے کہا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گئی۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے پورے گاؤں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یاسر تیز قدموں سے کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ رات کے اس مہیب سناٹے میں مہکروں میں سوئے پڑے تھے۔ صرف کتوں کے بھونکنے کی بے سری آواز آرہی تھی جو بھونک کر گاؤں والوں کو کسی اجنبی کی آمد کی اطلاع دے رہے تھے۔ چلتے چلتے یاسر کے سامنے ایک کچی اینٹوں سے بنا مکان آ گیا اس نے بنا سوچے سمجھے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ مگر دروازہ نہ کھلا اس نے مسلسل دستک دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ تقریباً دس منٹ بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا شخص باہر نکلا۔ ”کیا بات ہے پتر؟“ بوڑھے نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

”میں انشین سے ملنا چاہتا ہوں جو فضل دین کی بیٹی ہے۔“

بوڑھے نے یاسر کو عجیب نظروں سے گھورا۔

”انشین اور اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے پتر۔“ یاسر سناٹے میں آ گیا۔ ”کب کیسے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اسے دنیا سے گزرے ایک سال بیت چکا ہے۔ چوہدری نے اسے اغوا کر دیا تھا، باپ اور بھائی نے مزاحمت کی تو چوہدری نے سب کو قتل کر دیا انشین کی عزت لوٹ کر اس نے اسے اپنے کارندوں کے حوالے کر دیا، اس کے کارندوں نے انشین کو نوچنے کھونٹنے کے بعد بے دردی سے قتل کر دیا۔“

بوڑھے کے منہ سے داستان سن کر یاسر چکر کر رہ گیا۔ اس نے بوڑھے کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی پانگل کو دیکھتے ہیں۔

”بابائیں روز پہلے انشین مجھے شہر میں ملی تھی یہ تم کب کی بات کر رہے ہو؟“ یاسر بولا۔

”میں نے بتایا تا کہ سال بھر پہلے کی بات ہے۔“ بوڑھے کے جواب نے یاسر کے ہوش اڑا دیے۔ اس کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ ابھی چند دن پہلے تو انشین اس سے ملی تھی وہ کون تھی وہ چکر کر رہ گیا۔

”اچھا آپ مجھے چوہدری کی حویلی کا پتہ بتادیں۔“ بوڑھا تفصیل سے اسے حویلی کا ایڈریس سمجھانے لگا۔ یاسر بوڑھے سے رخصت ہو کر تیز قدموں سے حویلی کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ انہونی ہو چکی تھی۔ ایک روح اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے تقریباً بھاگتا ہوا چل رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ حویلی کی پشت پر موجود تھا۔ حویلی کی دیواریں کافی اونچی تھیں۔ وہ فوج کا کمانڈر تھا۔ اونچی دیواریں بھلا کتنا اس کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ چنانچہ چند لمحوں بعد ہی دیوار پھلانگ کر حویلی کے اندر موجود تھا۔

رات نصف سے زائد بیت چکی تھی حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یاسر کے جسم پر موجود دونوں ہولسٹرز میں پٹل موجود تھے اس نے دونوں ہولسٹرز سے پٹل نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں قیام لئے اور دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چوکنے انداز میں چل رہا تھا۔

اچانک اسے رکنا پڑا۔ ایک رائفل بردار اس کی طرف پشت کئے چوکنے انداز میں کھڑا تھا۔ یاسر نے پٹل اپنے ہولسٹر میں رکھے اور کرائنگ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ رائفل بردار سے کچھ فاصلے پر رک کر اس نے اپنی پٹنڈی سے بندھا تیز دھار خنجر نکالا اور پھرے دار کے قریب پہنچ کر پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ ہلکی سی آہٹ

یاس اشکار کیم لیا۔ ”کون ہو تم اور سب کرتے ہوئے  
”ہیں شرم نہیں آتی۔“

”باہو کیا کریں۔ میں یہاں ملازمہ ہوں۔  
یہ چوہدری کے کارندے ہیں۔ انکار کرنے پر بھی نہیں  
چھوڑتے۔ زبردستی کرتے ہیں۔“ عورت بے بس لہجے  
میں بولی۔

”حوالی میں کتنے افراد موجود ہیں؟“ یاس نے  
پوچھا۔

”چوہدری سمیت سات افراد ہیں۔“ لڑکی سہجے  
ہوئے لہجے میں بولی۔

یاس نے اندازہ لگایا۔ چوہدری کے علاوہ حوالی  
کے تمام افراد مارے گئے۔ ”چوہدری کہاں ہے؟“

”چوہدری صاحب تہہ خانے میں ہیں۔“ وہ  
گولیوں کی آواز سن کر تہہ خانے سے باہر کیوں نہیں  
آیا؟“ یاس نے حیرت سے پوچھا۔

”تہہ خانے سے کسی قسم کی آواز باہر نہیں سنائی  
دیتی نہ ہی باہر کی آواز اندر جاتی ہے۔“ عورت نے  
جواب دیا۔

یاس سمجھ گیا۔ تہہ خانہ ساؤنڈ پروف ہے۔ ”چلو  
مجھے تہہ خانے تک لے چلو۔“ یاس نے اسے پھل کی  
ٹال سے اشارہ کیا۔ لڑکی اسے لئے ہوئے تہہ خانے  
کے دروازے پر جا پہنچی۔ ”تم یہیں کھڑی رہو۔“ یاس  
نے کہا اور دروازہ کھولا۔ خوش قسمتی سے دروازہ اندر  
سے لاک نہیں تھا۔ چوہدری کے وہم و گمان میں بھی  
نہیں تھا کہ کوئی اس کی حوالی میں ٹھس کر اس کے  
اہلکاروں کی لاشیں بچھا کر تہہ خانے تک آ سکتا ہے۔  
یاس جیسے ہی اندر داخل ہوا ٹھٹک گیا۔ ایک لڑکی بیڈ پر  
بندھی پڑی تھی۔ چوہدری اس کے قریب کھڑا کچھ کہہ  
رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سن کر چوہدری مڑا اور  
حیران رہ گیا۔ دروازے پر ایک نوجوان پھل اس کی  
طرف تانے کھڑا تھا۔

چوہدری نے اپنے ہولشر کی طرف ہاتھ بڑھایا  
ہی تھا کہ یاس دھڑکیوں کی طرح اس پر پل پڑا۔ اس نے

نے رائفل بردار کو ہوشیار کر دیا۔ اس نے پلٹنا چاہا مگر  
اسے دیر ہو چکی تھی۔ یاس نے ایک ہاتھ مضبوطی سے اس  
کے منہ پر بٹھا دیا اور دوسرے ہاتھ سے تیز دھار خنجر اس  
کی شہہ رگ پر چلا دیا۔ اس کی شہہ رگ سے خون کا فوارہ  
بہہ نکلا اور اس کا جسم تر پنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا جسم  
ساکت ہو گیا تو یاس نے اسے آہستگی سے اٹھا کر دیوار  
کی آڑ میں لٹا دیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اس دوران وہ خنجر  
اپنی پٹنڈی سے باندھ کر ہولشر میں سے پھل نکال کر  
ہاتھ میں لیے چکا تھا۔

اجانک غیر متوقع طور پر دو مسلح افراد اس کے  
سامنے آ گئے یاس کو دیکھ کر انہوں نے اپنی رائفلوں کو  
پھرتی سے سیدھا کرنا چاہا مگر وہ یاس کی تیزی کا مقابلہ نہ  
کر سکے حوالی گولیوں کی آوازیں اور ان کی آخری  
چیخوں سے کونج اٹھی ایک طرف سے تین افراد رائفلیں  
تھامے باہر نکلے انہوں نے یاس کی طرف رائفلیں  
سیدھی کر کے فائر کئے۔ یاس نے پھرتی سے چھلانگ  
لگائی اور فضا میں تلابازیاں کھاتا ہوا ایک طرف گرا۔  
گر تہہ ہی پے در پے فائر کئے یہاں بھی اس کی بے  
مثال نشانہ بازی کام آئی۔ وہ تینوں افراد چٹختے ہوئے  
جہنم واصل ہو گئے۔ حوالی کے درندوں کی بد قسمتی تھی کہ  
آج ان کے مقابل فوج کا مانا ہوا کمانڈو تھا جو فہر اور  
غضب کی علامت بنا ہوا تھا۔

یاس اس وقت کوریڈر میں تھا انداز میں دوڑ رہا  
تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے باہر نکلتا چاہا  
مگر یاس کے پھل سے ٹکٹے والی گولی نے اسے وہیں  
ڈھیر کر دیا۔ یاس دروازے پر لات مار کر اندر کھس گیا۔  
کمرے میں گندی رنگ کی حامل ایک متناسب جسم کی  
مالک عورت کھڑی تھی۔ یاس نے اس کی طرف دیکھتے  
ہی اپنا چہرہ دوسری طرف گھمادیا۔ عورت برہنہ حالت  
میں کھی شاییدہ کمرے سے ٹکٹے والے مرد کے ساتھ  
عیاشی کر رہی تھی۔ میز پر ایک طرف شراب کی بوتل اور  
گلاس رکھا تھا۔ ”اپنے کپڑے پہن لو۔“ یاس سرد لہجے  
میں بولا۔ عورت نے جلدی جلدی بیڈ پر پھر پڑا اپنا



چوہدری پر لاقوں اور گھونسلوں کی بارش کر دی۔ چند لمحوں بعد ہی چوہدری تہہ خانے کے فرش پر ادھ موا پڑا تھا۔ یاسر نے چوہدری کو پاؤں سے ہلا جلا کر دیکھا اور اندازہ کر لیا کہ چوہدری اب بے ہوش ہو چکا ہے۔ اس نے خوشی کو کھولا۔ ”صیکس! آپ نے مجھے بچایا ویسے آپ ہیں کون اور یہاں کیسے پہنچے؟“

”میرا نام یاسر ہے اور تعلق آری سے ہے، اس سلطان نے میری ایک دوست سمیرا کو اغوا کیا تھا۔ جو اس کے چنگل سے بھاگ کر اس کے بھائی کے ہتھے جا چکی تھی، میں اس سے اس کے بھائی کا ایڈریس پوچھنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ میرا ارادہ تھا اس پر مار چڑھ کر اس کے بھائی کا پیسہ معلوم کروں گا، اس کے تمام کارندوں کو واصل جہنم کر چکا ہوں، اب اس کی باری ہے، تاکہ یہ دوبارہ کسی پر ظلم نہ کر سکے، اب آپ بتائیں آپ کون ہیں؟ اور اس شیطان کے نرغے میں کیسے آ گئیں؟“

”میرا نام خوشی ہے میرا تعلق ایک حساس ادارے سے ہے۔ سمیرا میری بہن ہے، میں یہاں سمیرا کی تلاش اور ایک مشن پر آئی ہوں۔“ خوشی نے اپنی روداد سے سنوائی۔

”اچھا تو آپ سمیرا کی باقی ہیں۔“  
”تمہاری سمیرا سے کب دوستی ہوئی؟“ خوشی نے پوچھا۔

وہ میری کلاس فیلو رہ چکی ہے۔“ یاسر نے بات بنائی۔ خوشی نے اندازہ لگالیا کہ یاسر جھوٹ بول رہا ہے اس کا لہجہ جھلی کھا رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ شاید دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ لیکن پھر سمیرا نے چپ چاپ شادی کیوں کر لی گھر والوں کو بتایا کیوں نہیں کر دیا کسی سے پیار کرتی ہے باتوں کے دوران یاسر کو چوہدری کا خیال آیا اس نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ چوہدری رپو اور ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ خوشی کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ ”اب تم دونوں بھی جہنم میں جاؤ گے۔“ اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز

سنائی دی۔ چوہدری نے مڑ کر دیکھا جاہا، یاسر کے لئے یہی لمحہ اہم تھا۔ پھرتی سے ہولسٹرس سے نکل کر گولی چلا دی مگر گولی چوہدری کے سینے میں دل کے مقام پر لگی، وہ بنا آواز نکالے جہنم رسید ہو گیا۔ چوہدری کے پیچھے دروازے میں وہ عورت کھڑی تھی جو اس کی ملازمت تھی۔ ”وہ جی میں نے سوچا بہت دیر ہو گئی ہے، جہانک کر دیکھ لوں۔“ اس نے اپنی صفائی پوش کرتے ہوئے کہا اور یاسر کے لب مسکرائے۔

☆.....☆.....☆

خوشی اور یاسر پچاس کے قریب پولیس کمانڈوز کے ہمراہ مختار انداز میں آگے بڑھ رہے تھے ان کی آنکھوں پر مخصوص ساخت کے گلاسز موجود تھے جن کی وجہ سے اندھیرے میں بھی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ خوشی کے چہرے پر نقاب بندھا ہوا تھا اس نے جیز کی پیٹنٹ اوپنل آسٹین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ لیکن اس گھنے جنگل میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رات آدھی سے زائد بیت چکی ہو، چاروں طرف سے مختلف اقسام کے جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گھنے جنگل میں داخل ہوتے ہی وہ دو دو کی ٹولیوں میں ہٹ کر آہستگی سے آگے بڑھنے لگے تھے۔ دور دراز سے آگے پولیس کمانڈوز جو دائیں سمت بڑھ رہے تھے کہ اچانک چونک پڑے۔ ایک طرف کھنی جھاڑیوں سے چار عدد تو میٹل بندر نکلتے دکھائی دیے۔ وہ دونوں حیرت سے بندروں کی طرف دیکھنے لگے۔ چاروں بندروں کے کندھے سے جدید طرز کی رائفلیں موجود تھیں۔ بندروں کا رخ ان کی طرف تھا۔ ابھی وہ ان سے کچھ فاصلے پر تھے کہ بندروں نے اپنی اپنی کلائی اپنی نظروں کے سامنے کی حیرت کی بات یہ کہ ان کی کلائیوں پر گھڑیاں موجود تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ وقت دیکھ رہے ہوں۔ اسی وقت انہیں اپنے جسم میں سوئی کی جبین کا احساس ہوا۔ اور دونوں کمانڈوز کے حواس ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ایک طرف سے ادھر آتی خوشی اور یاسر نے دونوں

کمانڈوز کو گرتے دیکھا اور بندروں کے کندھوں پر موجود رائفلوں کو دیکھا اسی وقت بندروں نے رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لے لیں۔ خوشی نے ماؤز کا رخ بندروں کی طرف کر کے ٹیکر دیا، لگا تار چار فائر ہوئے چاروں بندر کریمہ انداز میں چیختے ہوئے گرے۔ گولیاں ان چاروں کے سر میں لگی تھیں۔ خوشی اور یاسر دوڑتے ہوئے بندروں کے قریب پہنچ گئے نچے پڑے کمانڈوز کا معائنہ کیا اور سکون سے گہری سانس لی، وہ دونوں زندہ تھے صرف بے ہوش ہوئے تھے۔

”حیرت ہے یہ دونوں بے ہوش کیسے ہوئے۔“ وہ دونوں مردہ بندروں کی طرف لپکے چاروں بندروں کی کلائی میں گھڑی تھی۔

”خوشی حیرت اور تعجب سے اس عجیب ساخت کی گھڑی کا معائنہ کر رہی تھی اسی اثناء میں آٹھ کے قریب کمانڈوز بھی وہاں پہنچ گئے۔“ میں سمجھ گئی۔“ خوشی پر جوش انداز میں بولی۔ ”اس گھڑی میں ایسا سیکیزم سیٹ کیا گیا ہے کہ اس میں موجود باریک سی سوئی انتہائی تیز رفتاری سے کافی فاصلے پر موجود کسی بھی جاندار کے جسم میں پیوست ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں سوئی میں انتہائی زود اثر بے ہوشی کی دوائی ملی ہوگی جو انسان کو سیکنڈوں میں بے ہوش کر دیتی ہے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان بندروں کے پاس جدید اسلحہ اور ایسی جدید ساخت کی گھڑیاں کیسے آئیں اور یہ بندر انہیں اتنی مہارت سے کیسے استعمال کرتے ہیں۔“ خوشی نے تہرہ کیا۔

”وہ کمانڈوز بے ہوش افراد کو ہوش میں لانے کی کوشش کریں اور بتایا آگے روانہ ہوتے ہیں۔“ یاسر بولا اور وہ لوگ آگے بڑھ گئے اچانک تڑتار ہٹ کی آواز سنائی دی ایسا لگا کہ شیش گئیں ایک ساتھ چلی ہوں، ان سے آگے چلنے والے کئی کمانڈوز چیختے ہوئے زمین پوس ہو گئے۔ گولیاں نامعلوم مقام سے آئی تھیں۔ خوشی اور یاسر پھرتی سے ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ ”سمجھ نہیں آتا یہ گولیاں کہاں سے

آئیں؟“ یاسر نے کہا۔

اسی وقت ایک طرف سے چار کمانڈوز برآمد ہوئے اس سے پہلے کہ خوشی اور یاسر انہیں روک سکیں۔ شیش گئیں ایک بار پھر گر جیں وہ چاروں بھی اپنے فرض پر قربان ہو گئے اس بار خوشی اور یاسر دونوں نے دیکھا تھا کہ گولیاں سانے کی جھاڑیوں سے چلائی گئی تھیں۔ گولیاں چلانے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔ ”لگتا ہے خود کار گئیں ہیں، لیکن انہیں آپریٹ کون کر رہا ہے اور کہاں سے کر رہا ہے؟“ خوشی تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

ان کے ارد گرد سے قدموں کی چاپ سنائی دی انہوں نے پلٹ کر دیکھا پولیس کمانڈوز بھی ادھر ہی کا رخ کر رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر وہ بھی سکے میں آ گئے۔ ”آگے مت بڑھنا سانے موجود جھاڑیوں میں خود کار گئیں نصب ہیں جنہیں کسی خفیہ مقام سے آپریٹ کیا جا رہا ہے۔ سب لوگ اس طرح درختوں کی آڑ میں چھپے رہیں۔“ خوشی نے چلا کر زندہ بچ جانے والے کمانڈوز کو خبردار کیا۔ اسی لمحے نصف درجن کمانڈوز نے جذبات میں آ کر غلطی کی ان کے ہاتھوں میں ہینڈ گرنیڈ موجود تھے جو انہوں نے پن کھینچنے کے بعد سانے جھاڑیوں میں اچھال دیئے، ان کے سامنے آتے ہی خود کار گئیں گر جیں اور وہ نصف درجن کمانڈوز چیختے ہوئے زمین پر گر گئے، ان کے ہاتھوں سے اچھالے ہوئے ہینڈ گرنیڈ سانے موجود جھاڑیوں میں گرے، پے در پے ساعت جھنک وھانکے ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد خوشی آہستگی سے باہر نکلی اور کرائنگ کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس پر فائرنگ نہیں ہوئی۔ پیچھے رہ جانے والے افراد بھی ہمت کر کے درختوں کی آڑ سے نکلے اور خوشی تک جا پہنچے۔ اس کا مطلب ہے شہید ہونے والے کمانڈوز کی قربانی رنگ لائی ہے اور خود کار گئیں جاہ ہو گئی ہیں۔“ خوشی اپنے ساتھ کرائنگ کر کے چلتے ہوئے ایک کمانڈوز سے کہہ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد انہیں دور ایک وسیع عمارت دکھائی دی۔ ”گلتا ہے ڈاکٹر حاتم کا ٹکڑا نہ یہی ہے اور یہاں ہونے والے پراسرار واقعات کا ذمہ دار بھی ڈاکٹر حاتم ہی ہے۔“ خوشی نے کہا۔

اسی وقت ایک درخت کے اوپر سے راتفل گرجی، آگے چلنے والے تین کمانڈوز چنچیں مارتے ہوئے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، یاسر اور دیگر کمانڈوز نے آواز کی سمت فائر کئے، درخت سے تین بندر کریمہ آواز میں چیختے ہوئے گرے۔ اب وہ مزید احتیاط سے کرائنگ کرتے ہوئے نہایت آہستگی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ عمارت اب انہیں واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ سرخ رنگ کی وسیع و عریض عمارت چاروں طرف سے جھاڑیوں اور درختوں میں گھری ہوئی تھی۔

اچانک فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ”تم سب کے لئے آخری دارنگ ہے، اپنی جان بچا کر یہاں سے نکل جاؤ، اس کے بعد تمہیں اس کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ تم لوگ ڈاکٹر حاتم کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے، اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ، میری جنت ناقابل تخییر ہے۔“

”ڈاکٹر حاتم ہم مسلمان سپاہی ہیں موت سے نہیں ڈرتے تم نے بہت سی انسانی زندگیاں برباد کی ہیں، ہم تمہیں کیفر کردار تک پہنچا کر جائیں گے۔“ یاسر نے بلند آواز سے پر عزم لہجے میں کہا۔ ”اب تم لوگ یہیں ٹھہرو، ہم دس کمانڈوز آگے جاتے ہیں۔“ کمانڈوز کا انچارج بولا اور دس افراد کے ہمراہ کرائنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی وہ عمارت کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اس طرف جھاڑیوں سے دو خودکار گولیاں نرتر اہٹ کی آواز کے ساتھ گولیاں برسائے لیکیں فضا کمانڈوز کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ ارد گرد کی زمین پر ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آنے لگے۔ ورنہ صفت ڈاکٹر حاتم نصف سے زائد کمانڈوز کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

خوشی ذہین ترین سیکرٹ ایجنٹ تھی اور زندگی میں پہلی دفعہ اس کا واسطہ ایسے خطرناک مجرم سے پڑا

تھا۔ اس مشن میں حقیقت میں اس کے ذہن پر ناقابل فراموش بوجھ تھا۔ ”اگر ڈاکٹر حاتم کے حملے کا سیاق ہوتے رہے تو یہ مشن ناکام ہو سکتا ہے۔ اب ہم لوگوں کو کافی محتاط رہنا پڑے گا۔ ڈاکٹر حاتم انتہائی خطرناک اور ذہین مجرم لگتا ہے، اس عمارت کے ارد گرد ایسے آلات نصب ہیں کہ ڈاکٹر حاتم کو ہماری ہر حرکت کی خبر ہو جاتی ہے۔ وہ سائنس دان بھی ہے، اس پر قابو پانا کافی مشکل لگ رہا ہے، خیر ہم بھی ہمت نہیں ہاریں گے، میں قسم کھاتی ہوں کہ اس مشن کو کامیاب کئے بغیر واپس نہیں لوٹوں گی، آپ لوگ بھی یہ تصور کر لیں کہ اس مشن کی کامیابی کے لئے ہم نے اپنی کشتیاں جلا دی ہیں، یا تو ہم یہیں جان دے دیں گے یا اس مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔“ خوشی پر عزم لہجے میں بولی۔

”اب میں اور یاسر بیٹھ کر گریڈ لے کر آگے جائیں گے ہم نے وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں خودکار گولیاں نصب ہیں، آپ لوگ یہیں رہیں۔“ وہ دونوں بیٹھ کر گریڈ لے کر کرائنگ کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک چھوٹے درخت کی آڑ میں ہو کر ارد گرد کا معائنہ کرنے لگے، کچھ دیر بعد انہوں نے انتہائی مہارت سے پے در پے سات، آٹھ بیٹھ کر گریڈ جھاڑیوں میں چھپ گئے، جہاں ان کے خیال میں خودکار گولیاں نصب تھیں، دھماکوں سے زمین لرز اٹھی چاروں طرف گرد و غبار چھانے لگی، وہ دونوں پلٹے اور درختوں کی آڑ میں ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

اچانک ایک طرف جھاڑیوں سے کمانڈوز پر فائرنگ ہوئی۔ کمانڈوز میں بل چل چک گئی۔ اس حملے میں تین کمانڈوز مزید مارے گئے۔ پلٹ کر درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے کمانڈوز نے جھاڑیوں کی سمت لگاتار فائرنگ کی۔ جھاڑیوں سے بندروں کی بھیا یک چیخیں سنائی دیں۔ یاسر اور خوشی محتاط انداز میں جھاڑیوں کی طرف لپکے۔ فائرنگ دونوں طرف سے رک چکی تھی۔ جھاڑیوں میں نصب درجن بندر مرے پڑے تھے ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو رہے تھے۔ اب وہ دوبارہ

آہستگی سے عمارت کی طرف بڑھے اس بار کوئی بھی فائر ان پر نہ ہوا۔ ”گلتا ہے خودکار گولوں کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے۔“ ابھی وہ عمارت کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھے کہ ارد گرد کے درختوں سے ان پر فائرنگ ہوئی، اس حملے میں تین کمانڈوز مزید اپنے فرض پر قربان ہو گئے۔ ”خوشی یاسر اور دیگر کمانڈوز نے آواز کی سمت فائر کئے۔ بندروں کی بھیا یک چیخیں سنائی دیں اور خاموشی چھا گئی یہ تقریباً آٹھ کے قریب بندر تھے جن کے گولیوں سے چھلنی مردہ جسم درختوں سے گرے تھے۔ اب وہ سب مختلف درختوں کی آڑ میں چھپے تھے۔

اچانک ڈاکٹر حاتم کی بھاری آواز ایک بار پھر گونجی۔ ”تم لوگوں نے میری برسوں کی محنت ضائع کر دی۔ ان مارے جانے والے بندروں پر میں نے بہت محنت کی تھی۔ تم نے میری عمر بھر کا سرمایہ ختم کر دیا۔ اب اگر تم میں سے کوئی آگے بڑھا اور عمارت کے دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو میں میزائل فائر کر دوں گا یہ میزائل تمہارے شہر کو ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے منادیں گے۔“ ڈاکٹر حاتم کے الفاظ سن کر وہ سکتے میں آ گئے۔

اپنی زندگی کی انہیں پرواہ نہیں تھی لیکن وطن عزیز پر آج آئے۔ یہ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے ان کے ساتھی کمانڈوز کی تعداد بھی بندرہ کے قریب رہ گئی تھی۔

اچانک خوشی چونکی عمارت کے قریب جھاڑیوں سے سیاہ لباس میں ایک نقاب پوش نکل رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر سیاہ رنگ کا لباس موجود تھا۔ چہرے پر ماسک کی طرح نقاب تھا۔ نقاب پوش کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی نے یاسر کو اشارہ کر کے سمجھا دیا۔ ”درخت کے پیچھے چھپے رہو اس پر فائر مت کرنا۔“ نقاب پوش بوی مہارت سے کرائنگ کرتے ہوئے اس درخت کے قریب سے گزرنے لگا۔ جہاں وہ لوگ چھپے ہوئے تھے اسی وقت خوشی کے اشارے پر یاسر نے اسے درخت کی آڑ میں گھسٹ لیا۔ یاسر کا ایک ہاتھ نقاب پوش کے منہ پر تھا اور دوسرے ہاتھ

سے وہ نقاب پوش کی گردن کی رگوں کو مخصوص انداز سے مسل رہا تھا۔ نقاب پوش ہاتھ چلا کر خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ خوشی نے آگے بڑھ کر اس کی کچھنی پر مخصوص انداز سے گھونسا مارا۔ نقاب پوش بے ہوش ہو گیا وہ دونوں اسے گھسٹ کر ایک طرف لے جانے لگے۔ ایک طرف کھائی نما چھوٹا سا گڑھا تھا۔ وہ دونوں اسے لئے گڑھے میں اتر گئے۔

”اب میں اسے ہوش میں لا رہی ہوں، تم پہلے اس پر تان لو۔“ خوشی آہستگی سے بولی اور اس کی کچھنی پر موجود رگوں کو مخصوص انداز سے ملا۔ نقاب پوش کچھ ہی دیر میں ہوش میں آ گیا۔ یاسر نے اپنا پہل اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ نقاب پوش نے ہوش میں آتے ہی یاسر کے ہاتھ میں موجود پہل کو دیکھا جس کی نال اس کی پیشانی پر اور ٹیگر پر یاسر کی انگلی موجود تھی۔ ”سنو مشر! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تم سے چند سوالات کئے جائیں گے اگر صحیح جواب دیا تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے اگر جھوٹ بولا تو گولی تمہارا مقدر ہوگی! اب بتاؤ مرو گے یا ہمارے سوالات کے جواب دے کر زندہ رہو گے۔“ خوشی سرد لہجے میں بولی۔

”پوچھو! وہ تھوک نکل کر بولا۔“

”اس عمارت میں اس وقت کتنے افراد موجود اور کون کون ہیں؟“ خوشی نے پہلا سوال کیا۔

”ڈاکٹر حاتم، ڈاکٹر کامران، ڈاکٹر جمشید اور دس عدد میرے جیسے نقاب پوش ہیں۔“

”خطرناک بندر کتنے باقی بچے ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ کیا انہیں ڈاکٹر حاتم نے ٹریننگ دی ہے؟“ خوشی نے پوچھا۔

”بندر سب مارے جا چکے ہیں اس بات پر ڈاکٹر بہت غصے میں ہے۔ ڈاکٹر کا سب سے بڑا ہتھیار یہ بندر تھے جو تقریباً میں کے قریب تھے انسان کا دماغ بندر کی کھوپڑی میں منتقل کرنے کے بعد وہ شبی طریقے سے بندر میں ایسی تبدیلیاں لاتا تھا جو حیرت انگیز تھیں یہ بندر انسانوں کی طرح بولتے تھے۔ سوچتے تھے ڈاکٹر



کے ہر حکم پر عمل کرتے تھے ہر قسم کا اسلحہ چلانے میں ماہر تھے، یہ تجربہ گاہ اب بھی ناقابلِ تخریب ہے، اگر تم لوگ اندر جانے کا سوچ رہے ہو تو یہ تمہاری حماقت ہے وہاں بے حد حفاظتی انتظام ہیں، ایسا میزائل سسٹم ہے کہ ایک اشارے پر پورا شہر کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ، یہ حقیقت کیا ہے؟ میں نے کہیں سے سنا ہے کہ ڈاکٹر نے خود ساختہ جنت بنا رکھی ہے۔“

خوشی نے پوچھا۔

”وہ بہت خوب صورت جگہ ہے جہاں ملک بھر سے لائی گئی درجنوں خوب صورت لڑکیاں جمع ہیں۔ ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔“

”تم کس لئے باہر آئے تھے۔“ اس بار یاسر نے پوچھا۔

”تم نے جو ہم بھیجے تھے اس سے خود کار گنیں تو تباہ ہوئیں مگر خفیہ کیمرے بھی ناکارہ ہو گئے ہیں۔“

نقاب پوش نے جواب دیا۔

”سمیرا کو ڈاکٹر نے کہاں رکھا ہے؟“ خوشی نے پوچھا۔

”سمیرا کو تو نہیں جانتا البتہ ڈاکٹر کی محبوبہ تہہ خانے کی تجربہ گاہ میں ڈاکٹر کے ساتھ رہتی ہے۔“

”تہہ خانے تک جانے کا راستہ بتاؤ۔“ خوشی کے پوچھنے پر وہ تہہ خانے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

”اب مجھے چھوڑ دو، تم نے وعدہ کیا تھا۔“

”ہمارا وعدہ تمہیں زندہ رکھنے کا ہے، چھوڑنے کا نہیں۔“ خوشی نے کہا۔ اور اس کی کپٹنی پر زور دیا گھونہ مارا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی خوشی اور یاسر اسے گھسیٹ کر کمانڈوز تک لائے۔“ تم لوگ عمارت سے باہر رہو گے۔ یاسر اس کی نقاب اور لباس پہننے لگا اور مجھے کندھے پر لاد کر اس عمارت کے اندر لے جائے گا۔ ڈاکٹر اسے اپنا کارندہ سمجھے گا۔ میرے بارے میں یہ اسے بتانے گا کہ میں اس جنگل میں بے ہوش لی تھی۔

عمارت میں جاتے ہی میں سانس روک کر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دوں گی۔ ویسے بھی میں مارشل آرٹ کے ساتھ ساتھ یوگا کی ماہر بھی ہوں۔“ خوشی بولی۔

یاسر بے ہوش نقاب پوش کو ایک درخت کی آڑ میں لے گیا۔ اس کے کپڑے خود پہنے اور اپنے اسے پہنا دیے۔ چہرے پر اس کا نقاب چڑھایا۔ اب وہ خوشی کو کندھے پر لاد کر عمارت کی طرف اسی راستے پر چل دیا۔ جہاں سے انہوں نے نقاب پوش کو ٹریس کیا تھا۔

بیرونی گیٹ سے اندر جاتے ہی یاسر کو یڈور میں چلنے لگا۔ کوریڈور میں جگہ جگہ انسانی جسم کی ہڈیاں اور گوشت سے محروم کھوپڑیاں پڑی تھیں۔ وہ چلنے ہوئے کن انگیوں سے جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اسے دیواروں میں پوشیدہ کئی خفیہ کیمرے بھی نظر آئے۔

”لگتا ہے ڈاکٹر نے عمارت میں ہر جگہ کیمرے نصب کر رکھے ہیں۔“ اس نے سوچا۔

خوشی اس کے کندھے پر ساکت پڑی تھی یہاں آنے سے پہلے خوشی نے زنانہ لباس پہن لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر خوب صورت لڑکیوں کو جنت میں رکھتا ہے۔ یاسر کوریڈور میں چلتا ہوا دائیں سمت کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں پائیں سمت رکھی الماری کھول کر نقاب پوش کے بتائے گئے طریقے کے مطابق سوچ گئی۔ آن کیا۔ کمرے کی دیوار تقریباً چار فٹ کے قریب سرک گئی۔ اندر داخل ہو کر چھت میں لگا سوچ آن کیا۔ تہہ خانے کا دروازہ بند ہو گیا دیوار اپنی جگہ پر آگئی اور چاروں طرف روشنی پھیل گئی یہ ایک عظیم الشان تہہ خانہ تھا۔ وہ میز میاں اتر کر وسیع ہال میں داخل ہو گیا۔

ہال میں جگہ جگہ انسانی ڈھانچے موجود تھے۔ تہہ خانے کا انتظام دیکھ کر یاسر متاثر نظر آ رہا تھا۔ دائیں سمت والے کمرے کے دروازے کا سوچ آن کر کے ہی ہال نما کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ اس ہال نما کمرے میں نصف درجن لوہے کے بیڈ عجیب قسم کی مشینیں، کمپیوٹر، سرجری کے آلات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا گویا یہ جدید ترین لیبارٹری تھی۔

ڈاکٹر حاتم اس وقت لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھا۔ سمیرا ایک طرف بیڈ پر لیٹی تھی شاید وہ بھی تھی باجے ہوش تھی۔ یاسر نے اپنے آپ کو پرسکون رکھا۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جنگل میں بے ہوش پڑی لی تھی۔ میں اٹھا لیا شاید آپ کے کام آجائے۔“ یاسر نے بھرائے ہوئے لیپ ٹاپ میں بولتے ہوئے اس نقاب پوش کے لیپ ٹاپ کی نقاب پوش کی کوشش کی۔ جس میں وہ کسی حد تک کامیاب رہا۔

”اسے بیڈ پر لٹا دو۔“ ڈاکٹر کے حکم پر یاسر نے خوشی کو ایک بیڈ پر لٹا دیا۔

”بہت خوب! کیا حسین لڑکی ہے، اسے بھی جنت میں پہنچا دوں گا لیکن یہ روٹی کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ آج اسے پھر سمیرا بننے کا دورہ پڑا تھا، اس لئے اسے نیند کا انکشن لگا دیا۔“ ڈاکٹر ہڈیاں ہستی ہنسا اور کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ کوئی مٹن دیا اور غصے سے کمانڈوز کو دھمکیاں دیتے لگا۔

”عمارت کے قریب مت آنا ورنہ سب کو ختم کر دوں گا۔“ اس کے بعد اٹھا۔ اس پری کو اٹھاؤ اسے جنت میں چھوڑ آئیں یہ نہ ہو کہ روٹی جاگ کر مجھ سے ناراض ہو جائے۔“ وہ دوبارہ ہنسا۔

یاسر نے خوشی کو دوبارہ اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر کی خود ساختہ جنت میں تھے۔ یہاں دس کے قریب مسلح نقاب پوش بھی تھے۔ ڈاکٹر جشیہ اور کامران بھی وہیں موجود تھے۔ ڈاکٹر کے اشارے پر یاسر نے خوشی کو ایک طرف لٹایا اور اس کے ساتھ باہر نکلے لگا۔“ تم میں سے چار افراد باہر جاؤ اور عمارت کے قریب ہی رہو۔ جیسے جیسے موقع ملے سرکاری کتوں کا خاتمہ کرتے جاؤ۔“ ڈاکٹر نے کہا اور چار نقاب پوش ان کے ساتھ چل دیے۔

اب وہ دوبارہ تجربہ گاہ میں تھے ڈاکٹر وقفے وقفے سے کمپیوٹر پر نگاہ ڈالتا رہتا تھا ایک گھنٹہ بعد تجربہ گاہ میں الارم بج اٹھا۔ ڈاکٹر کمپیوٹر کی طرف دیکھتے ہوئے چلایا۔ ”حرام خورد و نوش آگے آنے سے روکو۔“

کمپیوٹر پر سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کمانڈوز درختوں کی آڑ سے نقاب پوشوں پر فائر کر رہے تھے چاکا ک دو نقاب پوش جیتے ہوئے جہنم واصل ہو گئے۔ کمانڈوز نے ان کے سینوں میں گولیاں اتار دی تھیں کچھ دیر بعد دوسرے دونوں نقاب پوش بھی مارے گئے۔

اسی وقت سمیرا کسمانے لگی، اسے ہوش آ رہا تھا۔

”حرام خورد و نوش میں تمہارے شہر کو کھنڈر بنا دوں گا۔“ ڈاکٹر لیپ ٹاپ کی طرف لپکا۔ اس نے لیور پر دایاں ہاتھ رکھا اور اسے نیچے کر دیا۔ اسی اثنا میں سمیرا ہوش میں آ چکی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟ پاگل انسان رک جاؤ، خدا کے لئے بلیک مٹن مت دباؤ۔“ وہ چلائی، ڈاکٹر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا اور اپنی انگی بلیک مٹن کی طرف بڑھادی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر کامران ڈاکٹر جشیہ اور نقاب پوش نوجوان لڑکیوں کو دبوچے ان کے ساتھ فرمستیاں کر رہے تھے۔ خوشی نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اندازہ لگایا کہ لڑکیاں اپنی جان بچانے کے لئے خود پر جبر کئے ہوئے تھیں۔ نقاب پوشوں کا اسلحہ ارگرد پڑا تھا۔ وہ بے فکری سے شراب پی رہے تھے اور لڑکیوں کو پھینچ رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی خفیہ ایجنٹ ان کو کیفر کردار تک پہنچانے آگئی ہے۔ ان کا شرمناک کھیل اب اخلاقی حدود پار کرنے والا تھا۔ خوشی نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اسی وقت ایک نقاب پوش جھومتا ہوا خوشی کی طرف بڑھا اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ خوشی کے جسم کو چھوتے خوشی کی زوردار فریاد نکلی اس کے سینے پر لگی وہ اچھل کر تالاب میں جا گرا خوشی نے ایک رائفل کی طرف جھلانگ لگادی۔

اس سے پہلے کہ نقاب پوش کچھ کرتے یا سنہیلے رائفل خوشی کے ہاتھوں میں تھی ان لڑکیوں کو چھوڑ دو خوشی وہ چلائی۔ نقاب پوش نے لڑکیوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ خوشی کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اپنی رائفلوں کی طرف لپکے۔ خوشی نے پے در پے



فائرنگ شروع کر دی۔ اس کا نشانہ غضب کا تھا۔ وہاں موجود نصف درجن قصاب پوش واصل جہنم ہو گئے۔ ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر جمشید خوف سے کانپ رہے تھے۔ ”لڑکیوں! تم لوگ آزاد ہو یہ تمہارے جرم ہیں، ان کا فیصلہ کرو، پھر تمہیں اس جہنم سے آزادی دلائی ہوں۔“ درجنوں لڑکیاں ڈاکٹروں پر ٹوٹ پڑیں، ڈاکٹر چیخنے چلانے لگے درجنوں کے قریب لڑکیاں انہیں زمین پر لٹائے مار پیٹ رہی تھیں ان میں سے بعض غیض و غضب کے عالم میں ڈاکٹروں کے جسم پر اچھل رہی تھیں کچھ نے وہاں رکھی لوسے کی کریاں اٹھالیں اور ڈاکٹروں پر برساتے لگیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں ڈاکٹروں کی خونچکان لاشیں پڑی تھیں۔

خوشی انھوں میں راتقل تھا۔ لڑکیوں کو لئے خفیہ راستے پر چلتی ہوئی تجربہ گاہ کے اندر داخل ہو گئی۔ لڑکیاں اس کے عقب میں تھیں۔ ڈاکٹر لیور کھینچ کر قہقہہ لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا اب بلیک بٹن دباتے ہی میزائل فائر ہو کر شہر پر جا گریں گے اور سب تباہ ہو جائے گا۔ ”رک جاؤ ڈاکٹر۔“ یاسر چلا یا اور اس پر چھلانگ لگا دی، یاسر نے ڈاکٹر کو کرسی سے کھینٹ لیا، ڈاکٹر نے نیچے پڑے یاسر کو اپنے اوپر سے اچھالا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف لپکا، اس بار وہ بلیک بٹن دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ تجربہ گاہ میں خوفناک سائرن بجنے لگا۔ ”ہا بابا۔ اب پانچ منٹ بعد یہ میزائل فائر ہو جائیں گے۔“ اس نے دیوانگی سے ہنسا شروع کر دیا۔

یاسر اس پر پل پڑا اس کے طاقتور گھونے اور لاقین ڈاکٹر کے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ لڑکیاں اور سیرا ساکت کھڑی تھیں۔ خوشی نے لیپ ٹاپ کی طرف چھلانگ لگا لی اور لیور کو کھینچ کر اوپر کرنے لگی۔ ”باجی رک جائیں لیور کھینچنے سے یہ تجربہ گاہ اور عمارت تباہ ہو جائے گی، میزائل ہمیں پھٹ جائیں گے، ہم سب مارے جائیں گے۔“ سیرا چلائی اور خوشی کی آنکھیں چپکنے لگیں اس نے خطرناک فیصلہ کیا اور لیور اوپر کر دیا۔

”نہیں۔“ ڈاکٹر حاتم چلا یا، اسی لمحے اس کی کٹی

سے یاسر کا گھونسلہ نکل آیا تو وہ چکر اکر گر اور بے ہوش ہو گیا۔ ”بھاکو! سمیرا نے کہا اور سب باہر کی طرف بھاگے، دھماکے شروع ہو گئے۔ عمارت لرزنے لگی۔ وہ ہال میں بھاگ رہے تھے کہ ایک طرف کی دیوار گری تقریباً پانچ کے قریب لڑکیاں لمبے کے نیچے دب گئیں جگہ جگہ سے ہلاک، ستون، لمبے گر رہا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت عمارت ان کے سروں پر گر جائے گی۔ وہ تہہ خانے کی سیڑھیوں تک پہنچے، پھر وہ کوریڈر تک جا پہنچے تھے، پے در پے دھماکے ہو رہے تھے۔ پوری عمارت لمبے کا ڈھیر بن گئی اور ڈاکٹر حاتم واصل جہنم ہو گیا تھا۔

وہ مین گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ دھماکے شدت اختیار کر گئے، خوشی کے جسم سے ایک ستون سے ہلاک کے کئی ٹکڑے نکلے اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

یاسر، سیرا اور پندرہ کے قریب لڑکیاں زندہ بچی تھیں۔ خوشی کی حالت بہت خراب تھی۔ اسے فوری طور پر ہسپتال کا پٹر میں شہر کے ایک بڑے اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت وہ ICU میں تھی ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اس کی زندگی کو سخت خطرات لاحق تھے، اس کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

خوشی نے ہزاروں بلکہ لاکھوں زندگیاں بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ اہم ترین شخصیات ملک کی عوام اس کی زندگی کی دعا کر رہے تھے۔ ملک بھر کے ٹی وی لائیو پروگرام اس کے بارے میں بار بار بتا رہے تھے۔ حکومت نے اسے متفرق شجاعت دینے کا اعلان کیا تھا۔ پھر لوگوں کی دعائیں سن لی گئیں۔ ڈاکٹروں نے خوشی کے خطرے سے باہر ہونے کا اعلان کر دیا۔

تقریباً تین ماہ بعد پھولوں سے سجتی کار کی طرف سمیرا اپنے شوہر یاسر کے ہمراہ آگے بڑھ رہی تھی اور خوشی اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

